ڈائری

1991-1992

مولانا وحید الدّین خاں

ڈائری

۱۹۹۱ـ۱۹۹۲

مولانا وحیدالدین خاں

Diary 1991-1992
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 2000

This book does not carry a copyright.

Distributed by
AL-RISALA
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi 110 013
Tel. 4625454, 4611128,
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: http://www.alrisala.org

Printed by : Choudhary Offset Process, Delhi-110051

بسم الله الرحمن الرحيم

١٩٩١

یکم جنوری ۱۹۹۱ء

آج نئے سال کا پہلا دن تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رلیسیور اٹھایا تھا تو ایک ہندو جرنلسٹ بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا" ہیپی نیو ایر"۔ میں سوچنے لگا کہ کیا واقعۃً نئے سال کا آنا آدمی کے لئے خوشی کا موقع ہے۔ دل نے کہا کہ یہ خوشی کا نہیں بلکہ تشویش کا موقع ہے۔ کیوں کہ نئے سال کا آنا ایک سال کے ختم ہونے کی خبر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا ایک سال اور کم ہوگیا۔ موت کی منزل آدمی کے لئے کچھ اور زیادہ قریب ہوگئی۔

۲ جنوری ۱۹۹۱

شیخ حسن البنا الاخوان المسلمون کے بانی تھے۔ وہ اچھے مقرر تھے مگر انھوں نے کوئی خاص کتاب نہیں لکھی۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ کتابیں کیوں نہیں تصنیف کرتے۔ حسن البنا نے جواب دیا: أصنّف الرجال وهم يصنّفون الكتب (میں افراد تیار کرتا ہوں اور وہ کتاب تیار کرتے ہیں)۔ اخوانی لوگ اس کو بطور فخر بیان کرتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ شیخ حسن البنا نہ صرف یہ کہ مصنف نہیں تھے بلکہ وہ شاید یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آج مصنف ہونے کا مطلب کیا ہے۔

۳ جنوری ۱۹۹۱

ایک دعا میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اے اللہ، میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں اور تیرے عذاب سے ڈرتا ہوں (نرجو رحمتك ونخشى عذابك) اس کو میں نے پڑھا تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ خدایا میرے پاس عمل کا اثاثہ نہیں۔ میرا واحد اثاثہ یہ ہے کہ میں تیری رحمت کا حریص ہوں اور تیرے عذاب سے خائف ہوں۔

اس دعا میں انسان کے لئے ایک سہارا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رجاء کے درجہ میں جنت کا طالب ہونا اور خشیت کے درجہ میں جہنم سے بیزار ہونا بھی انسان کے لئے ایک استحقاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی شخص اس ابتدائی معیار پر بھی پورا اترے تو امید ہے کہ خدا کی رحمت اس کو اپنے سایہ میں لے لے گی۔ مگر رجاء اور خشیت سے

مراد حقیقی رجاء اور خشیت ہے نہ کہ ان الفاظ کا لسانی اعادہ۔

۴ جنوری ۱۹۹۱

آج جمعہ کا دن تھا۔ میں نے کالی مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو حسب معمول دروازہ پر مانگنے والوں کی قطار تھی۔ ایک عورت اپنے تقریباً ۶ سالہ بچے کو لیکر دروازہ پر بیٹھی ہوئی سوال کر رہی تھی۔ غالباً اس کی امید کے مطابق اس کو نہیں ملا۔ جانے والے نمازیوں کی طرف رخ کرکے وہ زور زور سے کہنے لگی: "یہ کیسے مسلمان ہیں۔ ایک روپیہ دو روپیہ نہ دے سکیں۔ سب کافر ہیں کافر"۔

مذکورہ جاہل عورت نے جو بات بھونڈے انداز سے کہی، وہی موجودہ زمانہ کے علماء و اکابر کا حال بھی ہے۔ جو شخص ان علماء پر تنقید کر دے یا جو ان کی امیدوں کو پورا نہ کرے وہ ان کی نظر میں ایسا برا ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ مسلمان ہی نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۱

ندوہ کے دو درجن طلبہ تبلیغی مرکز (نظام الدین) میں آئے۔ ان کا مقصد مولانا سعید احمد صاحب مکی کی زیارت کرنا تھا۔ جو مکہ سے پاکستان آئے اور اب یہاں آئے ہیں۔ ان میں سے اکثر طلبہ مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ الرسالہ کے مطالعہ کے بہت شائق رہتے ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو بہت کم ملتا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ لوگ خود خرید لے۔ وہ خریداری کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

پھر میں نے پوچھا کہ آپ کے موجودہ سفر میں کتنا خرچ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی کس ۱۵۰ روپیہ۔ میں نے کہا کہ آپ نے مولانا کی زیارت کے لئے ۱۵۰ روپیہ خرچ کر دیا حالاں کہ یہ رقم واپس ملنے والی نہیں۔ اور الرسالہ کی خریداری کے لئے آپ ۶۰ روپیہ سالانہ خرچ نہیں کر سکتے، حالاں کہ اگر آپ پرچے واپس کر دیں تو آپ اپنی ساری رقم دوبارہ واپس لے سکتے ہیں۔ یہ بے ذوقی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

۶ جنوری ۱۹۹۱

مسٹر ایم شفیع پرگتی میدان (نئی دہلی) میں رہتے ہیں۔ وہ حکومت یوپی کے ڈائرکٹریٹ

آف انڈسٹریز میں ملازم ہیں (Phone 332-7989) وہ نہ صرف نماز روزہ کے پابند ہیں بلکہ باقاعدہ داڑھی بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بہت سے واقعات بتائے جس سے معلوم ہوا کہ ہندو افسران ان کا نہایت احترام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈیوٹی کے حد درجہ پابند ہیں۔

میں ذاتی طور پر تعصب کا قائل نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تعصب کے وجود کو نہیں مانتا۔ میرا کہنا ہے کہ تعصب ہر سماج میں لازماً موجود رہتا ہے۔ مگر آدمی اپنے عمل کے ذریعہ تعصب کو غیر موثر بنا سکتا ہے۔ شفیع صاحب کی زندگی اس کی ایک مثال ہے۔

۷ جنوری ۱۹۹۱

ڈاکٹر کرشن کانت کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ کل میں نے ہندستان ٹائمس میں آپ کا آرٹیکل اجودھیا کے مسئلہ کے بارے میں پڑھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ انھوں نے کہا کہ اب سید شہاب الدین صاحب بھی "ثالثی" کی بات کو مان رہے ہیں جس کی تجویز آپ نے ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ کو پیش کی تھی۔ اور دوبارہ اب اس کو دہرایا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی شہاب الدین تھے جنھوں نے ۱۹۸۷ میں اس تجویز کو چلنے نہیں دیا۔ اب جب ساری بات بگڑ گئی تو اب وہ اس تجویز کو ماننے کی بات کر رہے ہیں۔ مگر اب اس کو ماننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(فون نمبر ڈاکٹر کرشن کانت 6847711)

۸ جنوری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۱) میں نیشنل فورم فار پیس اینڈ انٹگریشن کی ایک میٹنگ کی رپورٹ ہے۔ اس میں موجودہ وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر بھی شریک تھے۔ چندر شیکھر نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہر مذہب بھائی چارہ سکھاتا ہے"۔ یہ سن کر مولانا سید موسوی نے کہا کہ ہاں۔ بھائی چارہ بہت اچھی چیز ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ایک بھائی سوچنے لگے کہ دوسرا بھائی اس کے لئے چارہ ہے۔ اسٹیج کے مسلمان مولانا موسوی کے اس تبصرہ سے خوش ہو گئے۔ مگر میرے نزدیک مولانا موصوف کا یہ تبصرہ محض ایک سطحی لطیفہ ہے نہ کہ واقعۃً کوئی کہنے کی بات۔

۹ جنوری ۱۹۹۱

رفیق احمد کانپوری صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندستانی مسلمان ہیں۔ ایک عرصے وہ سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا احساس بتایا کہ ہم لوگوں کو بہت دکھ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے۔

میں نے کہا کہ بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں نے مسلمانوں کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب پاکستان بننے کا فیصلہ ہوگیا تو مسلم لیگی لیڈروں کی رہنمائی میں عوام نے نعرہ لگایا: ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کر لیں گے ہندستان۔ یہی نعرہ ہندستانی مسلمانوں کا مزاج بن گیا۔ وہ ساری دنیا میں موافقت کرکے رہتے ہیں اور ہندستان میں لڑ کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس مزاج نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ بتائیے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سعودی عرب میں یہی ہندستانی مسلمان موافقت کرکے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ موافقت نہیں وہاں تو یہ لوگ ذلیل ہو کر رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کیا آپ ہندوؤں کو عرب مسلمانوں سے زیادہ متقی سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمان جس طرح باہر کے ملکوں میں موافقت کرکے رہتے ہیں، اگر وہ اسی طرح ہندستان میں رہنے لگیں تو یہاں کے سارے فرقہ وارانہ مسائل چند دن میں ختم ہو جائیں گے۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۱

مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت پر ایک کتاب ہے، جس کا نام "خطبات مدراس" ہے۔ اس کتاب کا ایک صفحہ مسلمانوں کو بہت پسند ہے اور وہ نہ صرف مذکورہ کتاب کی صورت میں بار بار پڑھا گیا ہے۔ بلکہ ہزاروں مختلف صورتوں میں نقل کیا گیا ہے۔ مثلاً مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویۃ" کے آخر میں اس کو "قطعة جميلة" کے طور پر شامل کیا ہے۔

میں ہندستانی مسلمانوں کا ایک ماہانہ رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مذکورہ ٹکڑے کو خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کے ہر قسم کے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک جزء یہ ہے ——— "اگر تم

نے شکست کھائی ہے تو تم معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو۔"

میں نے سوچا کہ مسلمان اس جملہ کو پچاس سال سے دہرا رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی موجودہ شکست کے مرحلہ کے بارے میں اس سے کوئی نصیحت حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ سید صاحب نے یہ جملہ بطور فخر لکھا تھا۔ اس لئے مسلمان بھی اس کو بطور فخر دہرا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اس سے نصیحت لینے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۱ جنوری ۱۹۹۱) میں ۲۵ سالہ بنگالی خاتون سویتا ناتا (Savita Natta) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ نابینا ہیں۔ وویکانند کالج کلکتہ سے انھوں نے ۱۹۸۸ میں بی اے کیا۔ ان کا مضمون تاریخ اور فلسفہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ خدا ہے۔ میں اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں جانتی۔ ایسی حالت میں میں کیسے خدا پر یقین کر سکتی ہوں:

Where is the proof that there is a God. I know of no such proof so how can I accept God as true.

آج ہی کی ڈاک سے مجھے لندن کے انگریزی اخبار انڈپنڈنٹ کا شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۱ ملا۔ اس میں ممتاز برٹش سائنس داں پروفیسر آرنلڈ ولفنڈیل (Arnold Wolfendale) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے خدا کے وجود کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی دریافت جو میں نے یا دوسروں نے کائنات میں کی ہے وہ سنجیدہ طور پر میرے عقیدۂ خدا سے ٹکراتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ خدا کا ہاتھ ہر چیز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کائنات میں ایک خدائی نظم ہے۔ اگرچہ ہم ابھی تک اس کو دریافت نہیں کر سکے ہیں اور نہ شاید کبھی دریافت کر سکیں گے:

I wouldn't say any discoveries I or others have made in cosmology impinge seriously on my beliefs. I think the hand of God can be seen everywhere. I think there is some divine order though we cannot yet, and perhaps never will, discern it.

پہلا قول ایک نادان انسان کا قول ہے، اور دوسرا قول ایک دانا انسان کا قول۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۱

عربی مجلہ الرابطہ (مکہ) کے شمارہ صفر ۱۴۱۱ھ، ستمبر ۱۹۹۰ میں کسی عالم کا قول نقل کیا ہے کہ: إنّ مِنَ السُّكوتِ ما هو أبلغُ من الجواب (بعض خاموشی جواب سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے)۔ میں اس قول کو نہایت صحیح اور حکیمانہ سمجھتا ہوں۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۱

اردو اخبار قومی آواز ہر روز اپنے ایڈیٹوریل کے اوپر ایک مختصر عبارت نقل کرتا ہے۔ اسی طرح انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا میں ہر روز ایڈیٹوریل کے اوپر ایک مختصر عبارت شائع کی جاتی ہے۔ میں قومی آواز کی عبارت کو کبھی نہیں پڑھتا، مگر ٹائمس آف انڈیا کی عبارت کو ضرور پڑھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی آواز میں ہر روز ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔ اور ٹائمس آف انڈیا میں ہر روز ایک حکیمانہ قول۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جنوری) میں ایڈیٹوریل کے اوپر یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے اعتماد کا نہ ہونا مشکلات کی بنا پر نہیں ہوتا، خود مشکلات اعتماد نہ ہونے کے سبب سے آتی ہیں:

Lack of confidence is not the result of difficulty, the difficulty comes from lack of confidence. (Seneca)

مشکلات زندگی کا جزء ہیں۔ کوئی مشکل اس وقت مشکل بنتی ہے جب آدمی کے اندر خود اعتمادی باقی نہ رہے اور وہ مشکل کا سامنا کرنے کا حوصلہ کھو دے۔ مشکل اور زندگی اسی طرح ایک دوسرے کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں جس طرح کانٹا اور پھول۔ ہم کانٹے کو پھول سے جدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ مشکل کو زندگی سے جدا کر دیا جائے۔ اگر آدمی زندگی کی اس حقیقت کو جانے تو وہ مشکل کو دیکھ کر فریاد نہیں کرے گا بلکہ اس کو عین فطری سمجھ کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے گا۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۱

ایمرسن (R.W. Emerson) ایک امریکی ادیب اور شاعر ہے۔ ۱۸۰۳ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۸۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ فطرت کا بہت شیدائی تھا۔ اس کا قول ہے کہ فطرت اس اصول پر عمل کرتی ہے کہ سب ہر ایک کے لئے اور ہر ایک سب کے لئے:

nature works on a method of all for each and each for all.

یہ ایک جملہ میں کائنات کے نظم کی نہایت عمدہ ترجمانی ہے۔ وسیع کائنات اس طرح عمل کرتی ہے کہ اس کا عمل اس کے کسی جزء کے مفاد سے نہ ٹکرائے۔ اور اسی طرح کائنات کا ہر جزء اپنا انفرادی عمل اس طرح کرتا ہے کہ وہ کائنات کے مجموعی مفاد کے عین مطابق ہو۔

کائنات کا یہ منظم کارخانہ ایک طرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا ایک مدبر اور ناظم ہے، اور اسی کے ساتھ وہ عملی طور پر بتا رہا ہے کہ انسانی زندگی کا اجتماعی نظام کس طرح تشکیل دیا جانا چاہئے۔

۱۵ جنوری ۱۹۹۱

احمد دیدات صاحب نے ساؤتھ افریقہ (ڈربن) میں اسلامک پروپیگیشن سنٹر انٹرنیشنل قائم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ادارہ کی طرف سے ایک اشتہار ٹائم میگزین (نیویارک) میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ یہ قرآن (ترجمہ) کا اشتہار تھا۔ اس اشتہار میں اس قسم کے الفاظ تھے:

Establish the kingdom of God on earth.
The future world constitution.

اس ایک صفحہ کے اشتہار کی قیمت ۷۰ ہزار ڈالر تھی۔ مگر ٹائم میگزین نے اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ احمد دیدات صاحب کے انگریزی پرچہ البرہان (دسمبر ۱۹۹۰) میں یہ قصہ چھاپا گیا ہے اور یہ تاثر دیا گیا ہے کہ مغرب کے لوگ اسلام کے بارہ میں سخت متعصب ہیں۔

میرے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں۔ مغرب سے مسلمانوں کو بے شمار فائدے پہنچ رہے ہیں۔ ان فائدوں کا ذکر نہ کرکے مذکورہ قسم کے واقعات کو سنسنی خیز الفاظ میں بیان کرنا سخت مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی مدعو قوموں کے بارہ میں

نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے موجودہ زمانہ میں یہی کام مسلسل کر رہے ہیں۔

میرا خود تجربہ ہے کہ جب الرسالہ نکلا تو ہم نے اس کا اشتہار اخبار الجمعیۃ، دعوت، تعمیر حیات اور الکفاح میں دینا چاہا۔ مگر سب نے انکار کر دیا۔ حالاں کہ ہم اس کی پوری قیمت ادا کر رہے تھے۔ تاہم نے اگر اسلام دشمنی میں اشتہار نہیں چھاپا تو مذکورہ اسلامی پرچوں نے الرسالہ کا اشتہار چھاپنے سے کیوں انکار کیا۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۱

لاہور کے ماہنامہ میثاق میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر کا خلاصہ شائع ہوا ہے۔ یہ تقریر انھوں نے لاہور کی ایک مسجد میں ۲۸ دسمبر ۱۹۹۰ کو کی تھی۔ اس تقریر کا ایک جزء یہ ہے :

"ستر برس قبل علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے ردّ عمل میں ہندوؤں نے راشٹریہ سوم سیوک سنگھ کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ آج وہ تحریک پورے عروج پر ہے۔ جب کہ خاکسار تحریک کی چپ، راست کی صدائیں زمانہ ہوا فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں قصر صدارت سے اسلام، اسلام کی جو رٹ لگائی گئی اس نے بھارت میں ہندومت کے احیاء اور نفاذ اسلام کے جواب میں رام راج کی تحریک کو بڑی تقویت دی۔ ہم نعرے لگا کر سو جاتے ہیں اور دشمنوں کو بیدار کر کے منظم ہونے کے لئے کھلا میدان مہیا کر دیتے ہیں۔ (میثاق جنوری ۱۹۹۱، صفحہ ۷۷- ۷۸)

اس فہرست میں اس تازہ واقعہ کا اضافہ کرنا چاہئے کہ ہندستان کے مسلم لیڈروں نے بابری مسجد تحریک چلا کر ہندوؤں کو متحد کر دیا اور خود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گئے۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۱

ہندستانی وقت سے آج صبح ساڑھے تین بجے امریکی فوجیوں نے عراق پر حملہ کر دیا۔ فجر کی نماز سے پہلے بی بی سی کے ذریعہ ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہوئی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں دو

بڑی جنگیں دیکھنا میرے لئے مقدر تھا۔ دوسری عالمی جنگ، اور پھر موجودہ جنگ جو گویا تیسری عالمی جنگ ہے۔

دوسری عالمی جنگ باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی۔ جب کہ ہٹلر کی قیادت میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ چند دن کے بعد انگریزی اخبار پانیر (Pioneer) نے اپنے صفحہ پر جو سرخی قائم کی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ اس کے الفاظ غالباً یہ تھے:

Poland in Germany's hand

یہ تباہ کن جنگ چند سال تک جاری رہی۔ آخر کار جو ہوا وہ یہ کہ ہٹلر نے برلن کے کھنڈر پر اپنی محبوب عورت کے ساتھ خودکشی کر لی:

Isolated and reduced to despair, Hitler married his mistress, Eva Braun, on April 30, 1945 and committed suicide with her in the ruins of the Chancellery. (19/1011)

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر کا انجام اس سے بھی زیادہ برا ہونے والا ہے جو جرمنی کے ڈکٹیٹر کا ہوا تھا۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

۱۷ جنوری کی صبح کو جب امریکہ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار بمبار ہوائی جہازوں نے عراق پر حملہ کیا تو وہ ۱۸ ہزار ٹن بم (explosives) بغداد اور دوسرے فوجی اہمیت کے مقامات پر بلا مزاحمت گرانے میں کامیاب ہوگئے۔ پہلے ہی دن انھوں نے عراقی ایر اسپیس پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس حیران کن کامیابی کا راز یہ بتایا جاتا ہے کہ امریکہ نے جدید ترین ٹکنالوجی استعمال کرتے ہوئے عراق کے راڈار جام کر دئے تھے:

because its radar warning system was jammed by the attackers.

امریکی بمباروں نے سب سے پہلے عراق کے کمیونی کیشن سسٹم کو نشانہ بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میدان جنگ میں تعینات فوجیوں کا رابطہ ان کے مرکز سے کٹ گیا۔ ایک فوجی

مبصر (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ جنوری) کے الفاظ میں، عراقی فوجی اچھی جنگ لڑ سکتے تھے اگر ان کی تربیت اس ڈھنگ پر ہوئی ہوتی کہ وہ اپنے ہدایتی مرکز سے کٹنے کے بعد بھی لڑ سکیں:

They could put up a good fight if they had been trained to fight even if no longer in touch with their command centres. (p. 9)

صدام حسین نے عراق میں سخت ترین ڈکٹیٹر شپ قائم کر رکھی تھی۔ وہاں کے لوگ ۲۰ سال سے عادی تھے کہ تمام احکام اوپر سے وصول کریں۔ اس قسم کا عجلت پسندانہ نظام ایک شخص کے ذاتی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے بہت مفید ہے۔ مگر ہنگامی حالات میں مستحکم کارروائی کے لئے وہ غیر مفید بن جاتا ہے۔ کیوں کہ معمول کے حالات میں آدمی اوپر کے حکم کا انتظار کر سکتا ہے مگر ہنگامی حالات میں خود اس آدمی کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے جو موقع پر موجود ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۱

آج ٹائمس آف انڈیا (۱۹ جنوری) میں صفحہ ۹ پر خلیج کی جنگ کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے —— آخر تم کس کے خدا ہو:

Whose God are you anyway?

اے پی کی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس جنگ میں ایک طرف سعودی عرب کے شاہ فہد ہیں جن کی طرف سے امریکی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف عراق کے صدام حسین ہیں جو خود اپنی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دونوں طرف سے اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ خلیج کی اس جنگ کے دونوں فریق مسلم ہیں اور دونوں فریق بظاہر یہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ ہے:

In the Gulf war, both sides seem sure He is their ally.

اس رپورٹ کو پڑھتے ہوئے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول یاد آیا جو حدیث کی کتابوں میں چودہ سو سال سے نقل کیا جا رہا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ دو بڑے جتھے آپس میں جنگ کریں۔ ان کے درمیان عظیم جنگ ہوگی۔ دونوں کا

دعویٰ ایک ہوگا (لاتقوم الساعۃ حتی تقتتل فئتان عظیمتان تکون بینہما مقتلۃ عظیمۃ، دعوا ہما عظیمۃ)

۲۰ جنوری ۱۹۹۱

اول دن سے یہ اندیشہ تھا کہ خلیج کی لڑائی شروع ہونے کے بعد عراق فوراً اسرائیل پر حملہ کرے گا۔ تاکہ اسرائیل جب اس کے خلاف جوابی حملہ کرے تو یہ مشہور کیا جاسکے کہ یہ عرب اسرائیل جنگ ہے، اور اس طرح تمام مسلم ملکوں کو عراق کا حامی بنالیا جائے۔ اس امکانی خطرہ سے بچنے کے لئے امریکہ نے یہ کیا کہ اس نے عراق کے ان فوجی اڈوں پر سخت حملہ کیا جہاں سے اسرائیل کے خلاف مار کرنے کے لئے دور مار میزائل نصب تھے۔ مگر تین دن کے مسلسل حملوں کے باوجود اسرائیل پر عراق کے حملہ کی صلاحیت ختم نہیں ہوئی۔ عراق نے اولاً ۱۸ جنوری کو اور پھر ۲۰ جنوری کو اسرائیل کے شہروں (تل ابیب اور حیفہ) پر میزائلوں سے حملے کئے اور جان ومال کا نقصان پہنچایا۔

امریکہ نے اسرائیل کے ذمہ داروں سے کہا تھا کہ تم اس جنگ میں خاموش رہو۔ ہم عراق کی اس صلاحیت ہی کو کچل دیں گے کہ وہ تمہارے اوپر حملہ کرسکے۔ یروشلم اور تل ابیب کی رپورٹ ہے کہ وہاں کے اسرائیلی اس بات پر غصہ ہورہے ہیں کہ وہ ہم کو جنگ میں شرکت سے روک رہے ہیں اور خود عراق کے میزائلوں کو برباد کرنے میں ناکام ثابت ہورہے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جنوری) کے صفحہ اول کی ایک خبر میں اس کی توجیہ کی گئی ہے۔ عراق کا ایک اپوزیشن گروپ جو اپنے کو کونسل آف اسلامک ریوولیوشن کہتا ہے اور ایران میں رہ کر کام کر رہا ہے، اس کے ترجمان (الصغیر) نے کہا کہ اکثر عراقی میزائل جن کے متعلق امریکہ کی زیر کمان فوجوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے ہوائی حملوں سے ان کو برباد کردیا ہے وہ اصلی نہیں تھے بلکہ ڈمی تھے جو پلاسٹک یا الومنیم سے بنائے گئے تھے۔

اگر یہ خبر صحیح ہو تو اس سے انسان کی محدودیت ثابت ہوتی ہے، امریکہ کے جاسوسی سیاروں نے عراق کی نہایت مکمل تصویریں فراہم کیں۔ ان کی روشنی میں امریکہ کے جدید ترین جہازوں نے انتہائی (pin-point) بمباری کی۔ مگر کامیاب بمباری ناکام ثابت ہوئی۔ کیوں کہ

امریکہ کی 'مشینی آنکھوں' نے ظاہر کو تو دیکھا مگر وہ باطن کو نہ دیکھ سکیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۱

جنوری ۱۹۹۱ کے دوسرے ہفتہ میں امریکہ کے فارن سکریٹری جیمز بیکر اور عراق کے وزیر خارجہ طارق حنا عزیز کی ملاقات جنیوا میں ہوئی۔ خلیجی نزاع کے معاملہ میں دونوں کسی اتفاق تک نہ پہنچ سکے۔ ملاقات کے بعد جنیوا کے ہوٹل میں پریس کانفرنس ہوئی۔ ایک اخبار نویس نے مسٹر طارق عزیز سے پوچھا کہ امریکہ اگر ۱۵ جنوری کے بعد عراق پر حملہ کر دے تو اس کے جواب میں عراق کیا اسرائیل پر حملہ کر دے گا۔ عراقی وزیر خارجہ نے بے رخی کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں اور یقیناً ہاں:

Yes, absolutely, Yes. (*Time*, January 21, 1991)

یہ عراق کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ امریکہ کی طرف سے حملہ ہونے کے بعد فوراً وہ اسرائیل پر حملہ کر دے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بعد اسرائیلی فوج عراق پر جوابی حملہ کرے گی۔ اس طرح صدام حسین کو موقع مل جائے گا کہ وہ خلیج کی جنگ کو عرب۔ اسرائیل جنگ کا عنوان دیدیں اور پھر تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔

اس منصوبہ کے مطابق عراق نے ۱۸ جنوری کو اسرائیل کے دو شہروں تل ابیب اور حیفہ کو اپنے میزائلوں کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد ۱۹ جنوری کو دوبارہ عراق کے بالسٹک میزائل اسرائیل کے اندر گرے۔ اس حملہ سے اسرائیل کو نقصان بھی پہنچا۔ بہت سی عمارتیں برباد ہوئیں۔ بہت سے لوگ زخمی اور ہلاک ہوئے۔ مگر اسرائیل حیرت انگیز طور پر اس کے جواب میں خاموش رہا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ اور اسرائیل صدام حسین کی اس چال سے باخبر ہو گئے۔ امریکہ نے نہایت تاکید کے ساتھ اسرائیل کے ذمہ داروں سے کہہ دیا کہ عراق اگر حملہ کرے تب بھی وہ انتہائی برداشت (Utmost restraint) کا طریقہ اختیار کریں (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ جنوری ۱۹۹۱) اسرائیل جانتے تھے کہ اس وقت اگر وہ مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کریں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ دوبارہ حملہ کے باوجود وہ جوابی حملہ سے مکمل طور پر رکے رہے۔ وہ اسرائیل جو فلسطینیوں کے پتھر کا جواب بم سے دیتا تھا، اس نے عراق کے میزائل

کے جواب میں ایک گولی بھی نہیں چلائی۔

فریق ثانی کی سازش کو ناکام بنانے کا سب سے عمدہ طریقہ یہی برداشت کا طریقہ ہے۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف سید احمد شہید بریلوی کے جہاد کو آپ صحیح نہیں سمجھتے۔ میں نے کہا کہ جو لوگ رنجیت سنگھ کی ہدایت کے لئے تڑپے نہ ہوں، انھیں رنجیت سنگھ سے لڑنے کا حق بھی نہیں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ سید صاحب اور ان کی جماعت نے رنجیت سنگھ کے اوپر تبلیغ کا حق ادا کیا ہو۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کی ہدایت کے لئے دعائیں کی ہوں۔ جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو ان کے لئے رنجیت سنگھ سے لڑنا بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاد کا اقدام دعوت کے بعد ہے نہ کہ دعوت کے بغیر۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۱

تہران سے ایک عربی پرچہ الشہید نکلتا ہے، وہ نصف شہریہ ہے۔ اور اس کی پیشانی پر "صوت الثورة الاسلامية" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ (صفحہ ۸) پر ایک مضمون کا عنوان ہے: امريكا، عدو صدام ام صديقه (امریکا صدام کا دشمن یا اس کا دوست)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کس طرح صدام حسین کے عراق کی مدد کر تا رہا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۵ سے لے کر ۱۹۸۹ تک امریکہ نے عراق کو ۲۶۰ ملین ڈالر کی مدد کی ہے۔ امریکیوں نے عراق کی یہ مددیں کیوں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکیوں نے یہ سمجھا کہ امریکی مفاد عراقی بازار میں پوشیدہ ہے جو پٹرول سے مالامال ہے (فقد اقتنع الامريكيون ان المصالح الامريكية كامنة في السوق العراقية المدعومة بالنفط)

اس معاملہ میں "اسلامی ایران" کا موقف بھی عین وہی ہے جو "کافر امریکہ" کا ہے۔ ایران کے نزدیک صدام حسین کی حیثیت شیطان کی تھی۔ مگر خلیج کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد صدام حسین نے یہ ہوشیاری کی کہ ایران کے جنگی قیدی واپس کر دئے۔ ایران کی زیر قبضہ زمین واپس کر دی۔ شط العرب سے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد ایران صدام حسین کا حامی

بن گیا۔ عراق کے خلاف امریکہ کی معاشی ناکہ بندی ناکام ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایران اور اردن نے اپنی سرحد عراق کے لئے کھول دی۔

"قومی انٹرسٹ" ایران کا بھی دین ہے اور امریکہ کا بھی۔ فرق یہ ہے کہ ایک نے اپنے اوپر اسلام کا لیبل لگا رکھا ہے اور دوسرے نے اس قسم کا کوئی لیبل نہیں لگایا۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۱

حقائق کے درمیان کبھی تضاد نہیں ہوتا۔ اسی لئے فقہ میں یہ اصول ہے کہ جس بات میں تعارض واقع ہو وہ ساقط ہو جائے گی (تعارضت فتساقطت) مثال کے طور پر ہندستان میں فسادات ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کے فسادات پاکستان میں بھی ہو رہے ہیں۔ اب اگر ہندستان کے واقعہ کو لے کر یہ کہا جائے کہ ہندو فساد کرتا ہے تو پاکستان کی مثال سے یہ بیان ٹکرا جائے گا۔ کیوں کہ وہاں سب مسلمان ہی مسلمان ہیں۔ اس طرح تعارض واقع ہونے کی بنا پر یہ توجیہ ساقط ہو جائے گی۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۱

ابو جحیفہ ایک صحابی ہیں۔ بعد کے زمانہ میں انھوں نے حضرت علی ابن ابی طالب سے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی کتاب (لکھی ہوئی چیز) ہے۔ حضرت علی نے کہا کہ نہیں۔ سوا اللہ کی کتاب کے یا وہ سمجھ بوجھ جو ایک مومن شخص کو ملتی ہے۔ (عن ابی جحیفة قال، قلت لعلی هل عندکم کتاب۔ قال لا الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم)

ایک شخص جو سچا مومن ہو اور قرآن کا برابر مطالعہ کرتا ہو تو اس کے اندر ایک شعوری صلاحیت ابھرتی ہے۔ اس کو دینی بصیرت کہا جاسکتا ہے۔ سچے صاحب ایمان اور سچے صاحب قرآن کے اندر یہ بصیرت لازماً پیدا ہوتی ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۱

آج مسلمانوں میں مدعیانہ اسلام ہے مگر حقیقی اسلام کا ان کے یہاں وجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مسلمان خدا کی نصرت سے محروم ہو رہے ہیں۔

مسلمان ایمان کا مدعی ہے، اسی کے ساتھ وہ بے اعترافی کرتا ہے۔ حالاں کہ بے اعترافی

کی روش ایمان کے مطابق نہیں۔ مسلمان اپنے کو نمازی سمجھتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ سرکشی کرتا ہے۔ حالاں کہ سرکشی کا رویہ نماز کے سراسر خلاف ہے۔ مسلمان اپنے کو روزہ دار کہتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ بدکلامی کرتا ہے۔ حالانکہ روزہ کے ساتھ بدکلامی کا جمع ہونا ممکن نہیں۔ مسلمان سمجھتا ہے کہ وہ زکاۃ و خیرات دے رہا ہے اور اسی کے ساتھ وہ دوسروں کی بدخواہی کرتا ہے۔ حالانکہ زکاۃ و صدقات سے خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے نہ کہ بدخواہی کا جذبہ۔ اسی طرح مسلمان اپنے کو حاجی سمجھتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ اختلاف برپا کرتا ہے۔ حالاں کہ حج کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے اندر سے اختلاف اور تفرق کا مزاج ختم ہو جائے۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۱

تمام مسلمان یہ جانتے ہیں کہ ان کے اوپر یہ دعوتی فریضہ ہے کہ وہ اسلام کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچائیں۔ مسلم علماء دعوت و تبلیغ کا نام بھی لیتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں دعوتی عمل مسلمانوں کے درمیان جاری نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داعی کو مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ مسلمانوں نے صبر نہیں کیا۔ اس لئے وہ داعی بھی نہ بن سکے۔

۱۸۵۷ کے بعد علماء کے پورے گروہ نے انگریزوں کے خلاف نفرت بھڑکائی۔ انگریز کو سب سے بڑے دشمن اسلام کے روپ میں پیش کیا۔ ایسی حالت میں ناممکن تھا کہ مسلمان انگریزوں کے اوپر دعوتی عمل کے لئے اٹھیں۔ مسلم لیگ نے ہندوؤں کے خلاف نفرت کا ہنگامہ جاری کیا۔ مسلمانوں کی نظر میں ہندو ایک نہایت بری قوم بن گئے۔ اس کے بعد ممکن نہیں تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو دین رحمت کا مخاطب بنائیں۔ آجکل مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے امریکیوں (اور عیسائیوں) کے خلاف نفرت کا طوفان برپا کئے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہی ممکن ہے کہ امریکی اور عیسائی مسلمانوں کی نظر میں آخری حد تک مبغوض ہو جائیں۔ اور بغض و عداوت کی نفسیات دعوتی عمل کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۱

۲۶ جنوری کو غازی آباد میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ دس سے زیادہ آدمی مارے گئے اور ۵۰ سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ گھروں اور دکانوں کو لوٹنے اور جلانے کے جو واقعات ہوئے وہ

اس کے علاوہ ہیں۔

۲۶ جنوری کو ہندستان میں ہر سال یوم جمہوریہ (ری پبلک ڈے) کے طور پر منایا جاتا ہے۔ عین اسی دن غازی آباد کے مسلمانوں نے امریکہ کے خلاف جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ انتظامیہ نے کہا کہ آپ "۲۶ جنوری" کو جلوس نہ نکالئے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ مسلمانوں کا جلوس جارج بش کا پتلا لئے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ کیلا بھٹہ چوک پر پہنچا۔ یہاں کچھ ہندو لڑکے ۲۶ جنوری کے سلسلہ میں ایک کلچرل پروگرام کر رہے تھے۔ انھوں نے سڑک کے اوپر ٹینٹ لگا رکھا تھا۔ مسلمان جب وہاں پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اپنا ٹنٹ ہٹاؤ۔ ہندو نوجوان ٹنٹ ہٹانے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس پر تکرار اور جھگڑا ہوا یہاں تک کہ باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی۔ اینٹ، بوتل، چھرا چلنے لگا۔ آخر کار لوٹنے اور جلانے کی نوبت آگئی (ٹائمس آف انڈیا ۲۸ جنوری ۱۹۹۱) بش کا پتلا نہیں جلا، البتہ مسلمان جل گئے۔

ہندستان کے بیشتر فرقہ وارانہ فسادات اسی قسم کے جھگڑوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر اپنے حصہ کا "فساد" ختم کرنا چاہئے۔ جب تک مسلمان ایسا نہیں کریں گے اس ملک سے خونی فسادات بھی ختم نہیں ہوں گے۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۱

سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ سورہ گویا بندہ اور خدا کا مواجہہ ہے۔ جب ایک شخص سچے دل سے سورہ فاتحہ کو پڑھتا ہے تو خدا اس کے بارہ میں اپنے فرشتوں سے کہتا ہے ـــــ میں وہی ہوں جس کا اس نے اعتراف کیا، اور اس کے لئے وہی ہے جو اس نے مانگا۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۱

مولانا محمد تقی امینی ۵ مئی ۱۹۲۶ کو سبیھہ (بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ کو علی گڑھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مولانا مرحوم کے ساتھ میری زندگی کے کئی عبرت انگیز واقعات وابستہ ہیں۔

جون ۱۹۶۶ میں جب میں نے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (لکھنؤ) کو چھوڑ دیا۔

اس وقت مولانا مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ناظم دینیات تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھے بغیر بطور خود ہندستان کے ان مسلم اداروں کے نام سفارشی خطوط لکھے جہاں لکھنے پڑھنے کا کام ہوتا تھا۔ مثلاً دار المصنفین، معارف اسلام، ندوۃ المصنفین وغیرہ۔ مدارس عربیہ سے جو جرائد نکلتے ہیں ان کو بھی خطوط لکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کسی ادارہ میں جگہ مل جائے تاکہ میں وہاں رہ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرسکوں۔ مگر تمام کے تمام اداروں نے مجھ کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی۔

اس سلسلہ میں انھوں نے تقریباً ایک درجن اداروں کے نام خطوط لکھے تھے۔ ان کے جوابات انھوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ان جوابات میں میری صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا تھا۔ مگر براہ راست یا بالواسطہ انداز میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ میرا مزاج تنقیدی ہے۔ اور اسی تنقیدی مزاج کی بنا پر ان کے ساتھ میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۳۱ جنوری ۱۹۹۱) میں بتایا گیا ہے کہ اردن کے مسلمان (خاص طور پر فلسطینی) آجکل سلام علیکم کی جگہ صدام علیکم کہہ رہے ہیں:

> How are the Jordanians greeting each other now: Saddam-u-Alaikum. (p. 9)

عراق کے صدر صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت پر فوجی قبضہ کر لیا۔ جب امریکہ نے مطالبہ کیا کہ کویت چھوڑ دو تو صدام حسین نے کہا کہ پہلے یہودیوں سے فلسطین چھڑواؤ، ہم کویت بھی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد صدام حسین نے کچھ روسی میزائل (scuds) تل ابیب وغیرہ پر پھینکے۔ اس کے بعد صدام حسین مسلم دنیا کے ہیرو بن گئے۔ مذکورہ واقعہ اسی سلسلہ کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔

دوسری طرف کویتیوں اور سعودیوں کے لئے یہ لطیفہ بنایا گیا ہے کہ اب وہ بسم اللہ کے بجائے بُشم اللہ کہتے ہیں۔ (صدر امریکہ بش کے نام کے ساتھ)

یکم فروری ۱۹۹۱

ایک انگریزی مجلہ میں خوبصورت قدرتی مناظر دیکھ کر خیال آیا کہ موجودہ دنیا نہایت حسین اور نہایت بامعنی ہے۔ یہاں ہر وہ چیز وافر مقدار میں موجود ہے جس کی انسان تمنا کر سکتا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ امکانات کی صورت میں ہے۔ انسان کو عقل اور صلاحیت دی گئی ہے تاکہ وہ ان اعلیٰ امکانات کو استعمال کرکے انھیں واقعہ بنائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنتی امکانات والی ایک دنیا تیار کرکے انسانوں کو دی اور کہا کہ تم یہاں ایک جنتی دنیا تعمیر کرو۔ مگر انسان ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ اب وہ دن آنے والا ہے جب خدا انسانوں کو معزول کرکے اپنی دنیا کا چارج خود لے لے۔ اور پھر یہاں ایک جنتی دنیا بنا کر اسے مومنین صالحین کے حوالے کر دے۔ شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا:

انا نحن نرث الارض ومن علیہا۔

۲ فروری ۱۹۹۱

پاکستان سے ایک اردو روزنامہ "وفاق" شائع ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت لاہور، کراچی اور راولپنڈی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھے جاتے ہیں: "تعمیری صحافت کا پاسدار"

اس پاکستانی اخبار کا شمارہ ۲۸ جنوری ۱۹۹۱ کے صفحہ اول کی ایک سرخی یہ ہے: "ہندوؤں نے مسلمانوں کے جلوس پر حملہ کر دیا، ۲ شہید ۵۰ زخمی" اس سرخی کے تحت غازی آباد کے فساد کی خبر شائع ہوئی ہے جو ۲۶ جنوری کو ہوا تھا۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ "بھارت (غازی آباد) میں مسلمانوں نے خلیج کی جنگ کے سلسلہ میں امریکہ کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ تقریباً ۲۰۰ ہندوؤں کے گروپ اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپ ہوئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف پتھر اور چاقو اور دیسی ساخت کے بم استعمال کئے اور شہر میں ایک سو سے زیادہ دکانوں کو آگ لگا دی"۔

اس خبر میں کہانی کا نصف حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ پورا قصہ یہ ہے کہ ۲۶ جنوری کو ہندستان کا یوم جمہوریہ تھا۔ عین اسی دن مسلمانوں نے جلوس نکالا۔ اس جلوس کو وہ ایک

ہندو محلہ سے لے گئے۔ مزید یہ کہ مقام فساد (کیلا بھٹہ) پر ہندو ٹنٹ لگاکر ہندو کلچرل تقریب کررہے تھے۔ مسلمانوں نے ٹنٹ ہٹانے پر اصرار کیا۔ کیوں کہ ان کو اس مقام پر جارج بش کا پتلا جلانا تھا۔ مسلمانوں کے اس غلط اصرار پر فساد شروع ہوا۔ پاکستان کے اخبارات ہندستان کو بدنام کرنے کے لئے مستقل طور پر اس قسم کی خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی خبریں چھاپنا بلاشبہ بدترین جرم ہے۔

۲ فروری ۱۹۹۱

ہندستان اور پاکستان کے اردو اخبارات آجکل صدام حسین کو اسلامی ہیرو کے انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صلاح الدین ایوبی دوبارہ تاریخ میں لوٹ آیا ہے۔ یہ اردو اخبارات صدام حسین کو اسلام کے سب سے بڑے خادم کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مکہ کے اخبار العالم الاسلامی (۱۴ جنوری ۱۹۹۱) کے پہلے صفحہ کی جلی سرخی یہ ہے: النظام العراقی یحاول استغلال الاسلام لتبریر عدوانه الاثم (عراقی حکومت کوشش کر رہی ہے کہ اپنے ظالمانہ گناہ کو جائز ثابت کرنے کے لئے اسلام کو استعمال کرے)

اردو اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں قائم کی جا رہی ہیں کہ صدام حسین نے عالم اسلام کو متحد کر دیا ہے۔ دوسری طرف مکہ سے نکلنے والے ایک جریدہ الرابطہ (دسمبر ۱۹۹۰) کی کور اسٹوری کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی ہے: الغزو العراقی الغاشم لدولة الكويت مزق وحدة الصف الاسلامی (کویت کے اوپر عراق کے غدارانہ حملہ نے اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔)

اردو اخبارات اپنے پرجوش مضامین کے ذریعہ یہ تصور دے رہے ہیں کہ صدام حسین نے فلسطین کی آزادی کا راستہ کھول دیا۔ اور ریاض سے نکلنے والے الدعوة (۲۴ جنوری ۱۹۹۱) میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے: جرائم الطاغية تمنح الفرصة لاسرائيل (صدام طاغوت کے جرائم کا فائدہ اسرائیل کو پہنچے گا ــــ کیسا عجیب فرق ہے ایک اسلام اور دوسرے اسلام میں۔

۴ فروری ۱۹۹۱

اسلام کے دور اول میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان کے بارہ میں قرآن میں تین قسم کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ لڑائیاں سب ایک قسم کی نہیں تھیں بلکہ وہ تین نوعیت کی لڑائیاں تھیں۔

پہلی قسم کی لڑائی وہ ہے جس کے لئے قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم کے الفاظ آئے ہیں۔ بدر کی لڑائی اصلاً اسی قسم میں شامل ہے۔ یہ دراصل اس سنت الٰہی کی تعمیل تھی جو انبیاء کے مخاطبین کے ساتھ ہر زمانہ میں پیش آتی رہی ہے۔ یعنی اتمام حجت کے باوجود جو لوگ انکار کریں انھیں ہلاک کر دینا۔ بدر کی جنگ حقیقۃً اہل مکہ کے اوپر اسی سنت الٰہی کا نفاذ تھا۔

دوسری جنگ وہ ہے جس کے لئے قرآن میں قاتلوا الذین یقاتلونکم کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ وہی جنگ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بقیہ لڑائیاں سب اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

تیسری جنگ وہ ہے جس کے لئے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد قدیم مذہبی جبر کے نظام کو ختم کرنا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں رومیوں اور ایرانیوں سے جو لڑائیاں ہوئیں وہ سب اسی نوعیت کی لڑائیاں تھیں۔

بعد کے زمانہ میں پہلی اور تیسری قسم کی جنگ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پہلی قسم کی جنگ کا تعلق صرف پیغمبر سے تھا اور تیسری قسم کی جنگ کا تعلق صحابہ کرام سے۔ اب ہمارے لئے صرف دوسری قسم کی جنگ باقی رہ گئی ہے۔ یعنی بوقت جارحیت مدافعانہ جنگ لڑنا۔

۵ فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب سے میں نے الرسالہ مشن کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دنیا میں ہمیشہ عسر اور یسر دونوں موجود رہتا ہے۔ عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں صرف عسر کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ وہ بس اسی کی فریاد کرتے رہتے ہیں۔ الرسالہ مشن اس کے برعکس یسر کے پہلو کو نمایاں کرنے کا مشن ہے۔ وہ عسر کو نظر انداز کرتے ہوئے یسر کا اعلان کر رہا ہے۔

اس دنیا میں رات بھی ہے اور دن بھی، خزاں بھی ہے اور بہار بھی۔ رات کا آنا آج کے لحاظ سے اندھیرے کا آنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کل کے لحاظ سے وہ روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔ خزاں کا موسم بظاہر پت جھڑ کا موسم نظر آتا ہے۔ مگر مستقبل کے اعتبار سے وہ بہار کے سرسبز موسم کی خبر دے رہا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، مادی دنیا کے لئے بھی اور اسی طرح انسانوں کی دنیا کے لئے بھی۔

۶ فروری ۱۹۹۱

آج رات کو دہلی میں خواب دیکھا کہ میں نے کوئی مضمون یا کہانی لکھی ہے۔ نیند کھلی تو اصل مضمون یاد نہیں تھا۔ البتہ یہ یاد تھا کہ مضمون کو میں نے اس جملہ پر ختم کیا ہے جو ریڈیو میں خبروں کے اناؤنسر آخر میں کہا کرتے ہیں :

...and that is the end of the news.

آج ہی کے اخبارات میں امریکی صدر جارج بش کا یہ بیان چھپا ہے کہ خلیج کی جنگ امریکہ کی آخری جنگ ہوگی۔ آئندہ نئے عالمی نظام کی بنا پر دوبارہ جنگ کی ضرورت نہ ہوگی:

The Gulf war would be America's last war. There would be no need to fight another one because of the new world order.

۷ فروری ۱۹۹۱

جان ڈرائیڈن (John Dryden) مشہور انگریزی ادیب اور شاعر ہے۔ وہ ۱۶۳۱ء میں پیدا ہوا، اور ۱۷۰۰ء میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے کہ مشکل پیش آنے کے وقت حاضر دماغی اور ہمت سے کامیابی حاصل کرنے کے لئے فوجوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں :

Presence of mind and courage in distress
Are more than armies to procure success.

۸ فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کے اخبارات و

رسائل پڑھئے۔ ان کے اجتماعات میں شرکت کیجئے۔ ان کی مجلسوں کی گفتگو سنئے۔ ہر جگہ فریاد واحتجاج کی آوازیں سنائی دیں گی۔ مسلمانوں کے اپنے اعتراف کے مطابق، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہندستان میں ہندو انھیں مار رہا ہے۔ فلسطین میں یہودی ان کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ خلیج میں عیسائی ان کو ہلاک کر رہا ہے۔ وغیرہ۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ صورت حال انسان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ حقیقۃً انسانی ظلم نہیں بلکہ خدائی تنبیہہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ کیا کہ خدا کی دی ہوئی سیاسی طاقت کو محض حکمرانی کا فیصلہ سمجھا اور خدا کے دیے ہوئے اقتصادی ذرائع کو صرف عیش وعشرت کا ذریعہ بنا لیا۔ حالانکہ سیاسی قوت اور اقتصادی وسائل دونوں اصلاً دعوت کا کام کرنے کے لئے دئے گئے تھے۔

۹ فروری ۱۹۹۱

قدیم زمانہ سیاسی جبر کا زمانہ تھا۔ مزید یہ کہ اس سیاسی جبر کی تبریر مشرکانہ مذہبی عقیدہ سے کی جاتی تھی۔ اس طرح یہ سیاسی جبر عملاً مذہبی جبر بن گیا۔ اس دور میں توحید کی دعوت فوراً کچل دی جاتی تھی، کیوں کہ توحید کا عقیدہ قدیم بادشاہوں کے حق حکمرانی کو بے بنیاد ثابت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخرالزماں اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ مذہبی جبر کے اس نظام کو ختم کر دیا۔ یہی وہ عمل ہے جس کو قرآن میں ختم فتنہ کے لئے قتال کہا گیا ہے۔ عرب میں شرک کے خاتمہ اور رومیوں اور ایرانیوں کی مشرکانہ سلطنتوں کے خاتمہ کے بعد یہ عمل اپنی آخری تکمیل کو پہنچ گیا۔

اس واقعہ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے بڑے حصہ پر اہل اسلام کا اقتدار قائم ہو گیا۔ یہ اقتدار بذات خود مطلوب نہ تھا وہ محض ایک ثانوی نتیجہ تھا۔ اصل مطلوب ومقصود یہ تھا کہ دعوت توحید کے مواقع ہمیشہ کے لئے کھول دئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف سیاسی جبر کو ختم کیا۔ دوسری طرف تیل کی دولت کا ۷۵ فیصد حصہ مسلم ملکوں (مغربی ایشیا) کی زمین کے نیچے رکھ دیا۔ اس طرح یہ انتظام کر دیا گیا کہ صنعتی دور میں بھی اہل اسلام کو ہر قسم کے ضروری وسائل حاصل رہیں۔ مگر مسلمانوں نے اصل مقصود (دعوتی عمل) کو بھلا دیا۔

انھوں نے ان دونوں نعمتوں کو بالترتیب صرف اقتدار اور عیش کا ذریعہ سمجھ لیا۔ اور دعوت کے اصل کام کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔

یہ بلاشبہ سب سے بڑا جرم ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مسلسل جرم کی بنا پر اللہ کا غضب ان کے خلاف بھڑک اٹھا ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۹۱

صدر صدام حسین نے ۱۹۷۹ میں عراق کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ عنقریب وہ کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعہ آدھے اسرائیل کو جلا ڈالیں گے (انہ سیحرق نصف اسرائیل بالکیمیاوی) اس سے پہلے مصر کے صدر جمال عبد الناصر نے اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے۔ سنرمیکم فی البحر)

مگر دونوں میں سے کوئی بھی اسرائیل کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ جو لوگ بڑے بڑے الفاظ بولیں ان کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ عام تجربہ ہے کہ زیادہ الفاظ بولنے والے ہمیشہ عمل میں تھوڑے ہوتے ہیں۔

۱۱ فروری ۱۹۹۱

مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) کا ایک مراسلہ روزنامہ قومی آواز (۱۱ فروری ۹۱) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"ہندستان میں اسلامی احیاء کی پوری تاریخ کو گمراہی قرار دینے والے واحد مسلم قائد مولانا وحید الدین خاں کو اگر ایک طرف سوشلسٹ ملکوں سے تعاون حاصل ہوا تو دوسری طرف اسلامی نظام کے حامی صدر ضیاء الحق صاحب کو اشارہ ملا کہ حضرت خاں صاحب کی مدد کی جائے اور انھیں ایک کتاب کے انعام کے نام پر دوبار مدد ملی۔ یہ سب مغربی سامراجیوں کی منافقانہ سیاست ہے۔"

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اس مراسلہ میں امریکی میگزین ٹائم (۲۴ ستمبر ۱۹۹۰) کے ایک مضمون کی بنیاد پر شکایت کی ہے کہ مغربی پریس مسلم حکمرانوں کی کردار کشی کر رہا ہے۔ مگر میرے بارہ میں یہی فعل وہ زیادہ بری صورت میں انجام دے رہے ہیں۔ ٹائم نے تو یہ کیا

ہے کہ کچھ حقیقی واقعات معلوم کرکے شائع کئے ہیں۔ جب کہ مراسلہ نگار نے میرے بارے میں جو بات کہی ہے وہ سراسر جھوٹی بات ہے۔ اس کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۲ فروری ۱۹۹۱

کچھ کشمیری ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے مسلمانوں میں تو صدام نوازی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مثلاً آج جامع مسجد کے علاقہ میں بڑے بڑے رنگین پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے: صدام حسین ـــــ آج کا صلاح الدین ایوبی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ آجکل کشمیر میں صدام نوازی کا تقریباً یہی حال ہے۔

میں نے کہا کہ خلیج کے واقعہ نے امریکہ سے زیادہ مسلمانوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان سب کے سب ڈبل تھنکنگ میں مبتلا ہیں۔ صدام حسین کی حمایت کرنا گویا might is right کے اصول کی حمایت کرنا ہے۔ جب آپ کویت پر صدام کے فوجی قبضہ کو جائز قرار دیں تو اس کے بعد کس منطق سے آپ کشمیر پر ہندستانی فوجوں کے قبضہ کو ناجائز قرار دیں گے۔ اور اسی طرح آپ کس منطق سے فلسطین پر یہودیوں کے فوجی قبضہ کو غلط ثابت کریں گے۔ مسلمان ایک طرف فلسطین پر یہودی قبضہ اور کشمیر پر ہندستانی قبضہ کو غلط بتاتے ہیں۔ دوسری طرف صدام حسین کے کویت پر قبضہ کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے کو برسرحق سمجھتے ہیں۔

۱۳ فروری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲ فروری ۱۹۹۱) میں سوامی ویویکانند سے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح وہ انیسویں صدی کے آخر میں دیوانہ وار امریکہ پہنچے اور وہاں ہندوازم کی تبلیغ کی۔ اسی طرح اور بہت سے ہندو سوامی ہیں جو اپنے مذہب کی عمومی تبلیغ کے جوش میں یورپ اور امریکہ میں داخل ہو گئے اور لاکھوں لوگوں کو ہندوازم سے متاثر کیا۔

مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اسلامی تبلیغ کے دھن میں یورپ اور امریکہ پہنچے اور وہاں کے لوگوں پر اسلام کی تبلیغ کرے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں نے مسلمانوں سے ان کا سیاسی اقتدار چھین لیا۔ چنانچہ تمام مسلمان دفاعی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ اس نفسیات کی بنا پر وہ یا تو مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ جیسے جمال الدین افغانی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، محمود حسن دیوبندی، وغیرہ۔ کچھ دوسرے لوگ تحفظ کی تدبیروں میں لگ گئے۔ انھوں نے دینی مدرسے قائم کئے، تبلیغی جماعت جیسی تحریک شروع کی۔

ہندو دفاعی نفسیات سے خالی تھا۔ اس لئے وہ اپنے مذہبی سرمایہ کا مبلغ بن کر اٹھا۔ مسلمان دفاعی نفسیات میں مبتلا ہونے کی بنا پر یا سیاسی لڑائی میں مشغول رہے یا ذاتی تحفظ کی تدبیروں میں۔ اسلام کے مثبت دینی سرمایہ کو لے کر اٹھنے کا مزاج ان میں پیدا ہی نہ ہو سکا۔

۱۴ فروری ۱۹۹۱

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ناقابل بیان حد تک عجیب صلاحیتیں دی ہیں۔ اس عطیہ کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ معطی کا اعتراف کیا جائے۔ اسی اعتراف خداوندی کا نام شکر ہے۔ سوچنے والے ذہن کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ کے بارے میں سوچے۔ تڑپنے والے دل کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ کی یاد میں تڑپے۔ زبان گویا کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ کے لئے گویا ہو۔ چشم بینا کو چاہئے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ کی نشانیوں کو دیکھے۔ اور اسی طرح تمام دوسرے عطیات۔

۱۵ فروری ۱۹۹۱

قرآن میں ہے کہ اے ایمان والو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت گناہ کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرو نہیں (یاایھا الذین آمنو لم تقولون مالا تفعلون. کبر مقتاً عند اللّٰہ ان تقولو امالا تفعلون)

اس کی تشریح اگر الفاظ بدل کر کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ زندگی میں آدمی کو ہمیشہ دو میں سے ایک کا چوائس ہوتا ہے۔ مگر اکثر اوقات وہ تیسرا چوائس لیتا ہے۔ جہاد کے سلسلہ میں ایک چوائس یہ ہے کہ آدمی جہاد کرے، دوسرا یہ کہ وہ جہاد نہ کرے۔ مگر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ تیسرا چوائس لیتا ہے یعنی وہ نہ تو جہاد کرتا ہے اور نہ جہاد کرنے والوں میں شامل ہوتا ہے۔ اس کے بجائے

وہ یہ کرتا ہے کہ زور وشور کے ساتھ جہاد پر تقریر کرتا ہے۔ وہ لڑائی نہیں کرتا، البتہ لڑائی کی باتیں کرتا ہے۔ یہ "تیسرا چوائس" اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔

اس روش کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا معاملہ۔ مثلاً تحفہ دینے کے معاملہ کو لیجئے۔ اس سلسلہ میں ایک چوائس یہ ہے کہ آدمی تحفہ دے۔ دوسرا چوائس یہ ہے کہ وہ تحفہ نہ دے۔ مگر بیشتر لوگ تیسرا چوائس لیتے ہیں۔ یعنی وہ کوئی سستی یا تماشے والی چیز خرید کر تحفہ دیتے ہیں۔ یا جو چیز اپنے لئے بیکار ہو، اس کو تحفہ میں دے دیتے ہیں۔ یہ تیسرا چوائس لینا ہے، اور تیسرا چوائس کوئی چوائس نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ وہی چیز ہے جس کو جھوٹا کریڈٹ لینا کہا جاتا ہے۔

۱۶ فروری ۱۹۹۱

جس آدمی کو عمل نہ کرنا ہو وہ بڑے بڑے الفاظ بولتا ہے، اور جس آدمی کو عمل کرنا ہو وہ چھوٹے الفاظ بولتا ہے۔ عمل پسند انسان چپ رہتا ہے، وہ جب بولتا ہے تو سوچ سمجھ کر بولتا ہے اور وہی بولتا ہے جو اسے کرنا ہے۔ اس کے برعکس لفظ پسند انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بولنے ہی کو کام سمجھ لیتا ہے۔ اس کو عمل سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ البتہ ہر معاملہ میں وہ بولنے کا بادشاہ بنا رہتا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۱

مسلم رہنما اور مقررین پر جوش طور پر کہتے ہیں کہ مسلمان صرف ایک خدا کے آگے جھکتا ہے، وہ کسی اور کے آگے نہیں جھکتا ——— یہ سر جھک چکا اب جھکانا نہیں ہے۔

یہ نہایت غلط ذہن ہے۔ اسی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمان ایک سرکش قوم بن گئے ہیں۔ جھوٹی اکڑ ان کی خاص صفت ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ جو لوگ خدا کے آگے جھک جائیں وہ اپنی پوری زندگی جھکے ہوئے طریقہ پر گزارتے ہیں وہ ایک تواضع پسند گروہ بن جاتے ہیں۔

سجدہ اور عبادت کے اعتبار سے بلاشبہ مومن صرف خدا کے آگے جھکتا ہے۔ مگر خدا کے آگے عبادتی جھکاؤ کرانسانوں کے درمیان اخلاقی جھکاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی

کے اندر سے اکڑ اور انانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اعتراف کرنے والا انسان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی پوری زندگی پر humility کی صفت چھا جاتی ہے۔ سجدہ کے اعتبار سے مومن صرف خدا کا شکر گزار ہوتا ہے۔ مگر اخلاق کے اعتبار سے وہ ہر انسان کے سامنے تواضع کی روش اختیار کرنے والا انسان بن جاتا ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۱

مولانا محمد علی جوہر ایک پرجوش سیاست داں تھے۔ وہ ادیب اور مقرر اور شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ شعر مسلمان بہت جوش وخروش کے ساتھ پڑھتے ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

میرے نزدیک یہ بالکل لغو شعر ہے۔ یہ توحید نہیں ہے، وہ صرف بے معنی شاعری ہے۔ "دو عالم" میں انسانی دنیا کے ساتھ فرشتوں کی دنیا بھی شامل ہے۔ تو یہ کیا کوئی توحید کی بات ہے کہ آدمی انسانوں کے ساتھ فرشتوں سے بھی خفا ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ توحید سارے عالم کے لئے محبت کا مزاج بتاتی ہے، نہ کہ سارے عالم سے خفا ہونے کا۔ تمام پیغمبروں نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے لئے ناصح اور امین ہوں میں تمہاری ہدایت اور نجات کا حریص ہوں۔ کسی پیغمبر نے یہ نہیں کہا کہ میں سارے عالم سے خفا ہوں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حشر میں کسی شخص کے بارہ میں یہ کہا جائے کہ اس نے اللہ کی خاطر اپنے دشمنوں سے محبت کی۔ وہ لوگوں کی ایذا رسانی کے باوجود لوگوں کا خیر خواہ بنا۔ لوگوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود وہ ان سے خفا نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی ہدایت کے لئے دعا کرتا رہا۔

۱۹ فروری ۱۹۹۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں آئے تو دیکھا کہ لوگ نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: انکم لن تزالوا فی صلاۃ ما انتظرتم الصلاۃ (تم لوگ جب نماز کے انتظار میں ہوتے ہو تو تم نماز ہی میں ہوتے ہو۔) اس کی تشریح کرتے ہوئے حسن بصری نے کہا: ان الناس لا یزالون فی خیر ما انتظروا الخیر (لوگ جب کسی بھلائی کا انتظار کرتے ہیں تو اس وقت بھی وہ بھلائی میں ہوتے ہیں)، جامع الاصول

فی احادیث الرسول ۲۴۶/۵

حدیث سے ثابت ہے کہ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں اصل اہمیت نفسیاتی حالت کی ہے۔ جب آدمی اس انتظار میں ہو کہ خیر کا موقع آئے تو وہ خیر کا عمل کرے، تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دل سے عمل خیر کا طالب ہے۔ اس کی نفسیات میں خیر کا شوق داخل ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب خیر کو بھی عامل خیر کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۱

اپنی پوری عمر میں میرا سابقہ جن مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا، ان میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے خلاف مزاج بات سننے کے وقت objective رہے۔ ہر آدمی اس وقت سنجیدہ تھا جب کہ بات اس کے مزاج کے موافق ہو۔ جیسے ہی بات اس کے مزاج کے غیر موافق ہوئی، وہ غیر سنجیدہ ہو گیا۔

اس مزاج کا سب سے زیادہ اظہار اس وقت ہوا جب کہ کوئی ایسی تنقید کی گئی ہو جس کی زد آدمی کی اپنی ذات پر پڑ رہی ہو۔ ایسی تنقید کے وقت ہر آدمی فوراً مشتعل ہو گیا۔ وہ عدل پر قائم نہ رہ سکا۔

یہ اس بات کی علامت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں وہ چیز باقی نہیں رہی ہے جس کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ مذہبی طبقہ میں لباس اور وضع قطع وغیرہ میں تقویٰ کے خود ساختہ مظاہر تو ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر مجھے شک ہے کہ لوگوں کے اندر حقیقی تقویٰ موجود ہے۔ میری فہم کے مطابق، ایک متقی انسان ذاتی تنقید پر بھڑ نے والا نہیں ہو سکتا۔

۲۱ فروری ۱۹۹۱

میرا تجربہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کی پٹری دوبارہ نہیں بدلتا۔ مثلاً ایک شخص جو ایک بار جماعت اسلامی سے یا کسی اور جماعت سے متاثر ہو گیا، وہ دوبارہ کسی اور تحریک سے اس طرح متاثر نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے کو چھوڑ کر پوری طرح دوسرے کو اختیار کر لے۔ ایسا کرنے کے لئے بہت زیادہ باشعور اور بہت زیادہ انقلابی انسان درکار ہوتے ہیں۔ اور ایسے انسان ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں۔

۲۲ فروری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۲ فروری) میں ایک دلچسپ خبر ہے۔ قاہرہ کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر کا عنوان ہے ـــــ ڈیموکریسی ایک عربی لفظ ہے:

Democracy an Arabic word

رائٹر کی اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ لیبیا کے فوجی صدر کرنل معمر قذافی نے قاہرہ میں ایک اجتماع کو خطاب کیا۔ اس میں تقریباً ایک سو مصری شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔ یہ لغو بات ہے۔ یہ ایک عربی لفظ ہے۔ اور اس کا مطلب ہے مسلسل کرسی پر بیٹھنا۔ انھوں نے کہا کہ ڈیموکریسی دو عربی لفظ کا مرکب ہے۔ دیمومۃ اور کراسی۔ دیمومہ کے معنی ہیں ہمیشگی اور کراسی کا لفظ کرسی کی جمع ہے۔ یہ کوئی دلیل نہیں بلکہ ایک لطیفہ ہے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب نئی دکان کھول رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ مانگا۔ میں نے کہا کہ تجارت نام ہے محنت کا۔ دکان آدمی کے لئے تجارتی بیٹھک کی جگہ نہیں۔ دکان آدمی کے لئے تجارتی محنت کی جگہ ہے۔ اگر آپ اس راز کو سمجھ لیں تو ان شاء اللہ آپ ضرور اپنی تجارت میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔

۲۴ فروری ۱۹۹۱

میرے بارہ میں ہر جگہ یہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ میں نے لیبیا کے صدر معمر قذافی کی کتاب الاخضر کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔ اس کے بعد میں نے انھیں ایک واقعہ سنایا۔

برطانی حکومت کے دور میں وائسرائے کے سامنے ایک خط پیش کیا گیا۔ اس پر "محمد علی" کا دستخط تھا۔ یہ خط امیر کابل کے نام تھا۔ خط میں افغانی امیر سے کہا گیا تھا کہ آپ اپنی فوجیں لے کر ہندستان پر حملہ کر دیجئے۔ ہم اندر سے بغاوت کر دیں گے۔ اس کے بعد انگریزوں کو بھاگنا پڑے گا۔ اور ملک آزاد ہو جائے گا۔

اس خط کے مضمون سے مولانا محمد علی جوہر کی بغاوت ثابت ہوتی تھی۔ اس کو وائسرائے کی کونسل میں غور کے لئے پیش کیا گیا۔ کونسل کی اس میٹنگ میں جنرل ڈائر بھی تھا جو اپنی

سفاکی کے لئے مشہور ہے۔ جنرل ڈائر نے اس خط کو پڑھا۔ اس کے بعد اس نے اس خط کو پھینک دیا۔ اس نے کہا کہ اس خط کی زبان نہایت معمولی ہے۔ وہ محمد علی کی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہمارے کسی جونیئر افسر کا لکھا ہوا خط ہے۔ جنرل ڈائر کی اس بات پر وہ خط رد کر دیا گیا۔

میں نے کہا کہ ہمارے مخالفین کے اندر جنرل ڈائر کے بقدر کردار بھی نہیں۔ ورنہ وہ قذافی کے ترجمہ کو دیکھ کر صرف زبان کی بنیاد پر اسے رد کر دیتے اور کہتے کہ یہ تو وحید الدین خاں کی زبان ہی نہیں۔ کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس کی زبان میں اور میری زبان میں بہت زیادہ فرق ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۹۱

کشمیر کے کچھ لوگ آئے اور پوچھا کہ کشمیر کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری رائے وہی ہے جس کو میں تقریباً ۲۵ سال سے کہتا رہا ہوں۔ میں نے انھیں الجمعیۃ ویکلی (۲۸ جون ۱۹۶۸، صفحہ ۴) دکھایا۔

میں نے کہا کہ کشمیر کے نوجوان خیالی تصور کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ انھیں عملی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔ عملی اعتبار سے آپ کے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ ہندستان کے الحاق کو بطور واقعہ مان لیں۔ اور دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ آج اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آئندہ اس کا موقع بھی نکل جائے گا۔ اور دفعہ ۳۷۰ کے تحت ملنے والے خصوصی حقوق سے بھی آپ محروم ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو ہتھیار رکھ دینا چاہئے اور نئی دہلی سے صرف یہ مانگ کرنا چاہئے کہ دفعہ ۳۷۰ کو لیٹر اور اسپرٹ کے ساتھ پوری طرح نافذ کیا جائے۔ آپ لوگوں کی مسلح جدوجہد صرف خودکشی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۶ فروری ۱۹۹۱

انسان امتحان کے لئے آزاد ہے مگر وہ نتیجہ کے لئے آزاد نہیں۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ بڑھاپے کو روک سکے۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ موت کو روک سکے۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے ابدی انجام کو روک سکے۔ یہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، مگر کوئی انسان نہیں جو اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہو ـــــــ آج صبح بارہ بجے میں

ٹہلتے ہوئے یہ الفاظ میری زبان پر آئے۔

۲۷ فروری ۱۹۹۱

خلیج کا بحران پیدا ہونے کے بعد پچھلے کئی مہینوں سے میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اس مطالعہ کا ایک نتیجہ وہ ہے جو 'خلیج ڈائری' کے نام سے الرسالہ نمبر (مئی ۱۹۹۱) کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

اس دوران میں ہر روز بہت سے اخبار اور رسالے پڑھتا رہا ہوں۔ عربی، اردو، انگریزی میں کثیر تعداد میں خبریں اور رپورٹیں اور مضامین کا مطالعہ کیا ہے۔ اس پوری مدت میں ہزاروں تحریریں دیکھی ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ان تمام تحریروں میں کوئی ایک بھی تحریر ایسی نہیں ملی جس میں خلیجی بحران سے کوئی مفید سبق نکالا گیا ہو۔ تمام تحریریں یا معلوماتی تھیں یا پھر کسی ایک کی حمایت اور دوسرے کی مذمت۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ لوگ واقعات سے سبق سیکھیں۔ واقعات ان کے لئے تربیت اور تزکیہ کا ذریعہ بن جائیں۔

۲۸ فروری ۱۹۹۱

ماہنامہ الرشاد (اعظم گڈھ) کے شمارہ فروری ۱۹۹۱ کا اداریہ (رشحات) خلیج کے مسئلہ پر ہے۔ اڈیٹر صاحب عربوں کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عالم اسلام میں کوئی بڑا سے بڑا حادثہ پیش آجائے مگر وہاں کے عوام و خواص میں کوئی پر شور تاثر دکھائی نہیں دیتا۔ بس حکومت یا حکومت کے کچھ ادارے اس پر اظہار افسوس کر دینا یا کچھ مالی مدد کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے عالم اسلام کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا ہے۔" (صفحہ ۷)

یہ موجودہ مسلمانوں کی حالت کی نہایت صحیح ترجمانی ہے۔ آجکل کے مسلمان "پر شور تاثر" ظاہر کرنے کو مسئلہ کا حل سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ پر شور تاثر صرف ایک سطحی ردعمل ہے، اس کا مسئلہ کے حل سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے مسائل پر پر شور تاثر کا اظہار نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ بار بار پر شور تاثر کے اظہار کے باوجود مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ بابری مسجد کی تحریک اجودھیا کے مسئلہ پر پورے معنوں میں ایک پر شور تاثر تھا مگر اس نے ایک فیصد اصل مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ خلیج کا موجودہ بحران بھی فلسطین

کے مسئلہ پر ایک پرشور تاثر کا مظاہرہ تھا، مگر اس نے مسئلہ کو حل کرنے میں کسی بھی قسم کی مدد نہیں کی۔ وغیرہ

یکم مارچ ۱۹۹۱

بنارس سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام صوت الامۃ ہے۔ اس کے شمارہ رجب ۱۴۱۱ھ (فروری ۱۹۹۱) میں الجہاد فی سبیل اللہ کے عنوان سے ۱۶ صفحات کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ جہاد کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔ آخر میں مضمون نگار لکھتے ہیں: الیٰ متی ھٰذا الھوان ایھا الرجل المومن۔ عش عزیزاً ومت عزیزاً وحتیٰ بنا نقاتل (اے مردمومن، یہ ذلت و رسوائی کب تک۔ عزت کے ساتھ جیو اور عزت کے ساتھ مرو۔ اور ہمارے ساتھ آؤ کہ ہم مل کر جنگ کریں۔) صفحہ ۴۰

جہاد اللہ کے لئے ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی قومی عزت کے لئے۔ سارے قرآن میں کوئی بھی آیت نہیں ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ جہاد کا مقصد قومی عزت حاصل کرنا ہے۔

۲ مارچ ۱۹۹۱

آج شب برات ہے۔ عشاء کے بعد میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ باہر بستی نظام الدین سے بار بار آوازیں آرہی ہیں۔ مسلمان شب برات کے پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلم علما ء کا کہنا ہے کہ اس ملک میں ہمارے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہماری اسلامی شناخت مٹائی جارہی ہے۔ جلسہ اور بیانات کی صورت میں وہ اس کے خلاف مسلسل بولتے رہتے ہیں۔

مگر یہی مسلم علماء شب برات کے پٹاخوں (اور اس قسم کی دوسری بدعات) پر خاموش ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے مسلمانوں کی شناخت متاثر نہیں ہوتی۔ پٹاخہ بازی واضح طور پر ہندوؤں کی نقل ہے۔ اس کے باوجود اس سے مسلمانوں کی شناخت کو کوئی خطرہ نہیں۔

۳ مارچ ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۳ مارچ) نے جانسن (G.H. Jansen) مقیم نکوسیا کا ایک جائزہ خلیج کی جنگ کے بارہ میں شائع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلیجی بحران کے زمانہ میں تقریباً پوری دنیا کے

مسلمان صدام حسین کے حامی بن گئے۔ اس کا سبب "بغض معاویہؓ" کی نفسیات تھی نہ کہ "حب علیؓ" کی نفسیات۔ مسلمانوں کا پرو صدام بن جانا دراصل امریکہ سے نفرت کی بنا پر تھا:

It is only a generalised hatred of America and therefore admiration for a leader who defied the Americans that can explain why Saddam has been so admired from Indonesia to South Africa to Morocco. (p. 12)

مسلمانوں کے درمیان امریکہ کے خلاف سخت نفرت اور اس بنا پر ایسے لیڈر کو پسند کرنا جو امریکہ کی مخالفت کرے، یہی اس بات کی توجیہہ ہے کہ کیوں صدام حسین انڈونیشیا سے لیکر ساؤتھ افریقہ اور مراکش تک ساری دنیا میں اس قدر محبوب بن گئے۔

جانسن کا یہ بیان بالکل درست ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں نفرت عالم کی بنیاد پر اٹھی ہیں۔ محبت عالم کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی تحریک نہیں اٹھی۔ اور ایسی منفی تحریکوں کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ ناکام ہو کر رہ جائیں۔

۴ مارچ ۱۹۹۱

سر ولیم جونس (Sir William Jones) ایک قابل مستشرق تھا۔ وہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء کو کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ برطانی حکومت نے اس کی مدد کی اور اس نے کافی ترقی کی۔ اس کی لائبریری میں ہندستانی کلچر سے متعلق نہایت قیمتی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس میں "شعبہ اسلامیات" کو اہم مقام حاصل ہوا۔ اس میں عربی، فارسی، اردو، ترکی وغیرہ کے ہزاروں قیمتی مخطوطات اسلامی علوم سے متعلق جمع کئے گئے۔

مغربی استیلا کے دور میں اس طرح کے مستشرقین کثرت سے پیدا ہوئے۔ جب بھی کوئی قوم دوسری قوموں پر اپنا اقتدار قائم کرتی ہے تو وہ دوسری قوموں کے مذہب اور کلچر کو جاننا چاہتی ہے۔ عباسی دور میں دوسری قوموں کی کتابیں بڑی تعداد میں ترجمہ کی گئیں۔ اسی طرح مغربی حکمرانوں نے اپنے دور میں کیا۔

اس معاملہ میں مسلمانوں نے صرف ردعمل کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ مستشرقین کے کام میں کچھ خلاف اسلام باتیں تلاش کر کے ان کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ حالاں کہ اصل کام یہ تھا کہ غالب قوم کے جذبہ کو استعمال کیا جائے کہ وہ مغلوب قوم کے مذہب اور کلچر کو جاننا چاہتی ہے۔ اگر مسلمان اس راز کو جانتے تو مغربی اقوام جو صرف نفرت کا موضوع بنیں، ان کے لیے مدعو بن جاتیں وہ ان کے سامنے اسلام کو پیش کر کے سارے معاملہ کو تبلیغ اسلام کا معاملہ بنا دیتے۔

۵ مارچ ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں امریکہ کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور عراق کے حصہ میں صرف رسواکن شکست آئی۔ ہندستان ٹائمس (۴ مارچ) میں ایک امریکی ماہر جنگ کا تاثر نقل کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ عراقی ہمارے لئے مددگار دشمن (cooperative enemy) ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے غیر منصوبہ بند اور بے سوچے سمجھے اقدامات کے ذریعہ فتح کو ہمارے لئے بے حد آسان بنا دیا۔

بے وقوف دشمن اپنے حریف کے لئے مددگار دشمن ہے۔ ایسا دشمن اپنی نادانیوں کے ذریعہ اپنے حریف کو ایسی فتح کا موقع دیدیتا ہے جس کی امید وہ عام حالات میں نہیں کر سکتا تھا۔ عراق کے صدر صدام حسین اور اسی طرح موجودہ زمانہ کے دوسرے تمام انقلابی مسلم رہنما، جن کو ان کے معتقدین بڑے بڑے القاب دئے ہوئے ہیں، وہ اسی قسم کے نادان مجاہد اسلام ثابت ہوئے ہیں۔

۶ مارچ ۱۹۹۱

سورہ شعراء، رکوع ۲ —— موسیٰ جب بچہ تھے تو فرعون نے آپ کو دریا سے نکالا اور عزت کے ساتھ آپ کو اپنے محل میں رکھا۔ مگر موسیٰ جب بڑے ہو گئے اور نبی کی حیثیت سے اللہ کا پیغام لے کر اس کے دربار میں گئے تو فرعون نے آپ کی تحقیر کی اور آپ کو نظر انداز کر دیا۔

ایک ہی شخص کے بارہ میں طرزِ عمل کے اس فرق کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ موسیٰ جب بچہ تھے تو وہ فرعون کے لئے ایک بے ضرر انسان تھے۔ مگر جب وہ پیغمبرانہ دعوت

لے کر فرعون کے دربار میں گئے تو اس وقت آپ کی حیثیت ایک ناقد کی ہو چکی تھی۔ آپ فرعون کے دین شرک کو غلط بتا رہے تھے اور اس کے بجائے اس کو دینِ توحید اختیار کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ یہ بات فرعون کے مزعومات کے خلاف تھی۔ اور اپنے خلاف کسی بات کو سننا بلاشبہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

قبطی کے قتل کی بات پر حضرت موسیٰ نے فرعون کو جو جواب دیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ کو میرے ماضی کی حیثیت سے نہ دیکھو بلکہ مجھ کو میرے حال کی حیثیت سے دیکھو۔ پچھلے واقعہ کو چھوڑ کر آج کی بنیاد پر فیصلہ کرو۔ آپ کے اس جواب سے یہ اہم اصول ملتا ہے کہ کسی سے معاملہ کرنے کے وقت ہم کو چاہئے کہ ہم آدمی کے بارہ میں اس کے آج کے اعتبار سے رائے قائم کریں نہ کہ گزرے ہوئے کل کے اعتبار سے۔

۷ مارچ ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۵ مارچ ۱۹۹۱) میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے صدام حسین کی حمایت نے فلسطین کی تحریک آزادی کی قسمت پر مہر لگا دی:

Supporting to Saddam seals PLO's fate

اس میں بتایا گیا ہے کہ کویت پر صدام حسین کا قبضہ اور خلیج کی جنگ کے معاملہ میں چوں کہ یاسر عرفات نے صدام حسین کی طرف داری کی۔ اس کی وجہ سے سعودی عرب، کویت اور عرب امارات وغیرہ کے حکمراں یاسر عرفات سے سخت غصہ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے یاسر عرفات کی مالی مدد بالکل بند کر دی ہے۔ اس سے پہلے فلسطین کی تحریک آزادی کو خلیجی ریاستوں سے ہر مہینہ تقریباً ۴۳ ملین ڈالر کا تعاون ملتا تھا:

Before Mr. Arafat gambled on Mr Hussein the PLO was getting some 43 million dollars a month from the Gulf states.

یاسر عرفات پرائیویٹ جیٹ پر سفر کرتے تھے اور یہ سب خلیج کی عرب ریاستوں کی مدد کی بنیاد پر تھا۔ مگر خلیج کے بحران میں انھوں نے صدام حسین کا ساتھ دیا۔ حالانکہ صدام حسین نے فرضی الفاظ کے سوا فلسطین کی تحریک کی کوئی اور مدد نہیں کی۔ مسلم قائدین کے ذہنی دیوالیہ پن

کی یہ کیسی عجیب مثال ہے۔

۸ مارچ ۱۹۹۱

فروری ۱۹۹۱ کے آخر میں امریکی اخبار (The Press and America) کے اڈیٹر مائیکل ایمری (Michael Emery) نے اردن کے شاہ حسین سے ملاقات کی۔ اور خلیج کے مسئلہ پر ان کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس ۵ مارچ ۱۹۹۱) میں نقل کیا گیا ہے۔

شاہ حسین نے اپنے تفصیلی انٹرویو میں کہا کہ صدام حسین نے کویت پر قبضہ بطور دباؤ (source of pressure) کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح امریکہ پر دباؤ ڈال کر فلسطین کے مسئلہ کو حل کریں اور اس کے بعد کویت کو خالی کر دیں۔ صدام حسین نے کویت پر قبضہ کرنے کے لئے کویت پر حملہ نہیں کیا بلکہ امریکہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس پر حملہ کیا۔

اگر یہ صحیح ہو تو میں کہوں گا کہ یہ ایک طفلانہ سیاست تھی۔ یہ گویا کلھیا میں گڑ لیکا نا تھا۔ صدام حسین اگر مدبر ہوتے تو وہ پیشگی طور پر جانتے کہ جس چیز کو وہ امریکہ پر دباؤ کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اسی کو امریکہ خود عراق پر حملہ کے لئے استعمال کرے گا۔

۹ مارچ ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ میں طالب علمی کے زمانہ میں والی بال کھیلا کرتا تھا۔ والی بال کے کھیل میں ایک اسمیشر (smasher) ہوتا ہے اور ایک بوسٹر (booster)۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ہر لڑکا اسمیشر بننا چاہتا ہے۔ میں نے غور کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اسمیشر فوراً نمایاں ہو جاتا ہے اور بوسٹر غیر نمایاں رہتا ہے۔ حالانکہ بوسٹر اگر بال نہ دے تو اسمیشر کیسے اس کو مارے۔

یہی معاملہ زندگی کے دوسرے اجتماعی معاملات کا ہے۔ ہر اجتماعی معاملہ میں دونوں قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر "بوسٹر" بننے کا شوق کسی میں نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں رہتا ہے۔ اس کے برعکس ہر آدمی اسمیشر بننا چاہتا ہے، کیوں کہ اس کا نام زیادہ ہوتا ہے، وہ لوگوں کو زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۱

کسی کا قول ہے کہ ——— اگر اور سب چیز کھوئی جاچکی ہو تو تم اپنے معیار کو نیچا کرلو:

If all else fails, lower your standards.

یعنی اگر تمہارے پاس کار نہ رہے۔ تمھاری سائیکل بھی ٹوٹ جائے تو تم پیدل چلنا شروع کردو۔ اسی طرح جب تم دیکھو کہ تمہارے وسائل ضائع ہوگئے ہیں، تو تم ضائع شدہ وسائل کا غم نہ کرو بلکہ اب بھی جو حاصل ہے، اس کا استعمال شروع کردو۔ ایک شخص اگر اپنا سرمایہ کھودے، تب بھی اس کے ہاتھ پاؤں باقی رہتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے عمل کرکے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی زندگی بنا سکتا ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۱

دین کا انکار کرنے سے کفر اور الحاد جیسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح برائی کی ایک اور قسم ہے۔ یہ وہ قسم ہے جو دین کا اقرار کرنے کے باوجود پیدا ہوتی ہے۔ یہ برائی ہے ——— غیر دین کو دین کی اصطلاحوں میں بیان کرنا۔ غیر دین کو دین کا نام دینا ہی تمام دینی خرابیوں کا سبب ہے۔ یہ برائی ہر مذہبی حلقہ میں پائی جاتی ہے۔

سیاست کو مذہبی عقیدہ بنانے سے شیعیت پیدا ہوئی۔ اکابر پرستی کو مذہب بنانے سے تصوف ظہور میں آیا۔ ردعمل کے تحت دین کی تشریح کرنے سے دور اول میں خوارج اور موجودہ زمانہ میں الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی جیسی منحرف تحریکیں پیدا ہوئیں، وغیرہ

۱۲ مارچ ۱۹۹۱

حیدرآباد کے ایک اردو اخبار میں، جس پر یکم مارچ ۱۹۹۱ کی تاریخ درج ہے۔ صفحہ اول کی رپورٹ کی سرخی یہ تھی: "عراق اور صدام حسین کا حسینی لشکر سر جھکا نہیں سکتا، البتہ سر کٹا سکتا ہے"۔ ہندستان کے اردو اخبارات اس قسم کی پرجوش خبروں کے ساتھ مسلمانوں میں اپنا اخبار فروخت کر رہے تھے۔ دوسری طرف خود صدام حسین کو جنگ نے اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ وہ امریکہ کی ہر شرط کو مان کر یک طرفہ طور پر جنگ بندی پر راضی ہوجائیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۱

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جو بڑے بڑے رہنما اٹھے، ان کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر ان کے اقدامات سراسر ناکامی پر ختم ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تشخیص بنیادی طور پر غلط تھی۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کھودی ہے۔ حالاں کہ ان کے زوال کا اصل سبب یہ تھا کہ انھوں نے ربانیت کھودی تھی۔ موجودہ زمانہ میں احیاء ملت کے لئے احیاء ربانیت کی ضرورت تھی نہ کہ احیاء سیاست کی۔ ان رہنماؤں کا نشانہ غلط تھا، اس لئے ان کی کوششیں بھی لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔

۱۴ مارچ ۱۹۹۱

صرف یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صحیح بات کہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صحیح بات میں غلط بات کو نہ ملائے۔ ورنہ صحیح ذہن پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح کو پڑھ رہا تھا۔ اس میں اس قسم کی بہت سی مثالیں سامنے آئیں؛ مثلاً ایک مقام پر ایک عیسائی کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی عمومیت ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں تک ایسی باتیں پہنچائیں جو دوسرے انبیاء نہیں پہنچا سکے تھے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ لوگ انھیں قتل کر دیں گے (والقی الی الناس مالم یمکن غیرہ من الانبیاء القاءہ خوفا ان یقتلوہ) ۱۴/۴

یہ بلاشبہ ایک بے بنیاد بات ہے اور قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ پیغمبر اسلام کی رسالت کی عمومیت بذات خود واقعہ ہے۔ مگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہے کہ دوسرے پیغمبروں نے قوموں کے ڈر سے ان کو خدا کی طرف سے ملا ہوا پیغام نہیں پہنچایا۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۱

حدیث میں روزہ کے سلسلہ میں نیت اور سحری کی بہت تاکید آئی ہے۔ اس حکم کا ایک دینی پہلو ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ آدمی جب صبح کو فجر سے پہلے اٹھتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں آنے والے دن کے روزہ کی نیت کرتا ہوں۔ وہ وقت شروع ہونے سے پہلے سحری کھاتا ہے۔ تو اس قسم کے اعمال سے گویا وہ اپنے دماغی کمپیوٹر کی programming کرتا ہے۔ اس کے دماغ کا کمپیوٹر پورے جسم کے نظام کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اگلی شام تک اپنے کو روزہ کی حالت میں سمجھیں۔

اس کی وجہ سے روزہ کی بھوک پیاس کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ عام حالت میں اگر آدمی بھوکا رہے تو سخت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ مگر روزہ میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہی دماغ کے کمپیوٹر کی پروگریمنگ ہے۔ جو سحری کے وقت کی جاتی ہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۹۱

سر سی وی رمن (۱۸۸۸ - ۱۹۷۰) انڈیا کے ایک مشہور سائنس داں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خارجی ساز و سامان سے زیادہ انسانی دماغ کی اہمیت ہے۔ ان کے بنگلور کے سائنسی ادارہ کے ایک طالب علم نے ان سے شکایت کی کہ اس کی لیبورٹری میں صرف ایک کیلوواٹ کا ایک لیمپ ہے، جب کہ باہر کے ملکوں میں میرے جیسے طالب علم کے یہاں دس کیلوواٹ کا لیمپ ہوتا ہے۔ رمن نے جواب دیا کہ تردد نہ کرو، مسئلہ کے لئے اپنے اندر دس کیلوواٹ کا دماغ رکھ لو:

Don't worry. Put a 10 KW brain to the problem.

۱۷ مارچ ۱۹۹۱

آج شعبان ۱۴۱۱ھ کی آخری تاریخ تھی۔ شام کو رمضان کا چاند صاف دکھائی دیا۔ تمام لوگوں نے اس کو آسمان پر ہلکا چمکتا ہوا دیکھا۔ میں نے چاند کو دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ چاند گویا اک خدائی نشان ہے جو آسمان میں ظاہر ہو کر بتا رہا ہے کہ آج سے تمہاری زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ اب تم کو مباحات اور ممنوعات کے نئے معیار کے تحت اپنے روز و شب کو گزارنا ہے۔

تاہم یہ صرف ہلال رمضان کی بات نہیں۔ دنیا کی ہر چیز خدا کی نشانی ہے، اور ہر چیز انسان کو ایک نئے سبق کی یاد دہانی کرا رہی ہے۔ آدمی کا احساسِ ایمان زندہ ہو تو وہ جس منظر

کو بھی دیکھے گا، وہ اس کو نیا ربانی پیغام سناتا ہوا نظر آئے گا۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۱

آج روزہ کے مہینہ کی پہلی تاریخ ہے۔ روزہ کے بارے میں سوچتے ہوئے بخاری اور مسلم کی یہ روایت یاد آئی کہ انسان جو عمل کرتا ہے اس کا اجر اس کو دس گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ کا معاملہ ایک مستثنیٰ معاملہ ہے۔ روزہ کا اجر روزہ دار کو بے حساب گنا تک دیا جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ کسی عمل کے اجر کا تعین اس کی کیفی قدر و قیمت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جس عمل میں جتنی کیفی قدر ہوتی ہے اتنا ہی اس کے عامل کو اس کا اجر ملتا ہے۔ روزہ اس اعتبار سے ایک ممتاز عبادت ہے۔ روزہ میں ارادہ اور شعور کے تحت بھوکا اور پیاسا رہنے سے روزہ دار کو اعلیٰ ایمانی تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ تقویٰ اور شکر کی اعلیٰ کیفیات سے دوچار ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ روزہ کے دوران اس کے قول اور عمل میں خصوصی ربانی احساسات شامل ہو جاتے ہیں۔ روزہ اس کے عمل کی روحانی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ روزہ اس کے ہر عمل میں کیفی (qualitative) اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح روزہ دار کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا عمل کرے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی نظر میں بے حساب گنا اجر کے قابل ہو جائے۔

۱۹ مارچ ۱۹۹۱

عبداللہ بن المقفع (وفات ۱۴۲ھ) عربی کا ایک ممتاز ادیب تھا۔ اس نے کلام بلیغ کی تعریف یہ کی ہے کہ جاہل آدمی جب اس کو سنے تو گمان کرے کہ میں بھی ایسا کلام کہہ سکتا ہوں (اذا سمعه الجاهل ربما ظن انه يحسن مثله)

اس تعریف سے مجھے اتفاق ہے۔ کلام بلیغ کلام دقیق کا نام نہیں۔ کلام بلیغ یہ ہے کہ دقیق بات کو ایسے سادہ اور واضح الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ آدمی اس کو سنتے ہی فوراً سمجھ لے۔ ایسے اسلوب میں بات کہنا مشکل ترین کام ہے۔ اسی لئے اس کو سہل ممتنع (السهل الممتنع) کہا

جاتا ہے۔

مگر سادگی کلام کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے معانی کو سمجھنا بھی اسی طرح آسان ہو جس طرح بظاہر اس کے الفاظ کو سمجھنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً الرسالہ کے ٹائٹل پر ایک بار لکھا گیا تھا: "دوسروں سے نہ لڑنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے" اس فقرہ کی انتہائی سادگی کے باوجود بہت سے لوگ اس کی معنوی گہرائی کو سمجھ نہ سکے۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۱

آج تیسرا روزہ ہے۔ روزہ گویا فاقہ کا تجربہ ہے۔ عام حالات میں صرف تھوڑے سے لوگ فاقہ کا تجربہ کر سکتے تھے۔ رمضان کے روزے فرض کر کے اس تجربہ کو عمومی بنا دیا گیا۔ مزید یہ کہ اس کو عبادت کی حیثیت دے کر اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دی گئی۔ عبادت کے پہلو نے اس فاقہ کو ایک روحانی تجربہ بنا دیا۔

رزق کی اہمیت رزق سے محرومی کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ یہی روزہ کی حکمت ہے۔ روزہ کے ذریعہ محرومی رزق کا تجربہ کرایا جاتا ہے تاکہ رزق کی غیر معمولی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ اور بندہ زیادہ بڑھے ہوئے جذبۂ شکر کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کر سکے۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۱

آج کا روزہ کچھ سخت گزرا۔ بھوک اور پیاس دونوں کا سخت احساس ہوتا رہا۔

روزہ کا دن گزار کر شام کو جب افطار کر رہا تھا تو اچانک خیال آیا کہ آج میں روزہ کا دن گزار کر افطار کی شام تک پہنچا ہوں۔ اسی طرح اللہ کے مقبول بندے "روزہ کا دور" گزار کر "افطار کے دور" میں پہنچیں گے۔ دنیا ان کے لئے روزہ کا دور ہے، اور آخرت ان کے لئے افطار کا دور۔

دنیا ہر حال میں ناخوشگواری اور مصیبت کی جگہ ہے۔ دنیا سے "حزن" کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مومن کی متقیانہ زندگی اس کو مزید سخت بنا دیتی ہے۔ اس طرح دنیا کی زندگی انسان کے لئے روزہ کے دور کی مانند ہے۔ اور آخرت افطار کے دور کی مانند۔ مگر افطار کے اس دور میں داخلہ انھیں افراد کو ملے گا جو اللہ کی خصوصی رحمت سے اس کے مستحق قرار دئے

جائیں گے۔

روزہ افطار کرتے ہوئے مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے میں دور روزہ سے گزر کر دور افطار میں پہنچ گیا ہوں اور اللہ کی رحمت سے جنتی افطار کی خوشی حاصل کر رہا ہوں۔

۲۲ مارچ ۱۹۹۱

میری مخالفت کا طوفان جاری ہے۔ عجیب بات یہ کہ جن لوگوں کو سب سے زیادہ میری حمایت کرنی چاہئے تھی وہی لوگ میری مخالفت میں سب سے زیادہ آگے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے مولانا مودودی کی تعبیری غلطی کی تصحیح کرائی۔ مگر انھوں نے میری تحقیر و تذلیل کی جس کے نتیجہ میں ان کی پوری جماعت میری مخالف ہوگئی۔ مولانا علی میاں کو یہ حسرت تھی کہ کوئی ہو جو جدید فکری انحراف کے جواب میں عصری اسلوب میں طاقت ور لٹریچر تیار کرے۔ اس سلسلہ میں ردۃ ولا ابابکر لہا کے نام سے ایک عربی پمفلٹ شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام مجھ سے کرایا۔ مگر جب یہ کام ہو چکا تو مولانا علی میاں اور ان کا پورا حلقہ میرا دشمن بن گیا۔ مولانا اسعد مدنی یہ چاہتے تھے کہ نئے ملکی حالات کے مطابق مسلمانان ہند کی رہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے میری زیر ادارت الجمعیۃ ویکلی کی صورت میں اس کا انتظام فرمایا۔ پھر جب الجمعیۃ کثیر الاشاعت پرچہ بن کر مسلمانوں کو تعمیری رہنمائی دینے لگا تو انھوں نے الجمعیۃ ویکلی کو بند کر دیا۔ اور ان کا حلقہ میری کامل بربادی کے درپے ہوگیا۔

اسی طرح مولانا مجیب اللہ ندوی کا مدرسہ بے کسی کی حالت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے اس کی ایک بڑی امداد کرائی جس سے ان کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر اس کے بعد وہ میری مخالفت کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوگئے۔ مولانا ہاشم قاسمی کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ مدرسہ کی مدرسی سے اٹھا کر ایک بڑے مرکز کا انچارج بنا دیا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے نہایت ذلیل انداز میں میری مخالفت کی مہم شروع کر دی۔ مولانا محسن عثمانی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے نازک موقع پر گراں قدر مالی امداد (بلا شرط غیر سودی قرض) میرے ذریعہ فراہم کی۔ مگر جب ان کا مسئلہ حل ہوگیا تو وہ جوش و خروش کے ساتھ میرے مخالفین کی صف میں شامل

ہو گئے۔ وغیرہ۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۱

حدیث میں ہے کہ مومن دانا اور سمجھ دار ہوتا ہے: المؤمن کیّس فطن (رواہ الدیلمی، عن ابان عن انس)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ سمجھ داری مومن کی کوئی نسلی یا گروہی صفت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک شخص جس کو مومنانہ شعور ملا ہو، اس کے اندر ایک زبردست قسم کا ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو (as it is) دیکھنے لگتا ہے۔ اور چیزوں کو as it is دیکھنے ہی کا دوسرا نام سمجھ داری ہے۔

ایک شخص کسی کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے تو اس کی خوبیاں اس کو دکھائی نہیں دیں گی۔ ایک شخص کسی کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگے تو اس کی برائیاں اس کی نظر سے اوجھل ہوجائیں گی۔ ایک شخص غصہ کے تحت کسی معاملہ میں رائے قائم کرے تو اس کی رائے اعتدال سے ہٹ جائے گی۔ اسی طرح جب بھی آدمی پر کسی کیفیت کا غلبہ ہوجائے تو وہ درست رائے قائم کرنے سے قاصر رہے گا۔ ایمان آدمی کو اس قسم کی ہر محرومی سے بچاتا ہے۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۱

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۵ رمضان ۱۴۱۱ھ) میں کسی عرب بزرگ کا قول نقل کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: نعم القوم الذین عرفوا اللہ فی رمضان (کیا ہی اچھے ہیں وہ لوگ جو رمضان کے مہینہ میں اللہ کو پہچان لیں) صفحہ ۵۰

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ روزہ کا مہینہ آدمی کے لئے احتیاج اور عجز و افتقار کے تجربہ کا مہینہ ہے۔ اور آدمی سب سے زیادہ اس وقت اپنے رب کی معرفت حاصل کرتا ہے جب کہ وہ احتیاج اور عجز و افتقار کے تجربہ سے گزر رہا ہو۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۱

میرے خلاف بہت سی کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ندوہ کے استاد مولانا عتیق احمد قاسمی کی ہے جو ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے یہ کتاب میرے پاس بھیجی تھی

اور اظہار خیال کے لئے لکھا تھا۔ مگر میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ علمی حیثیت سے وہ ایک بے وزن کتاب ہے۔ اس میں دھاندلی اور الزام تراشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مگر آج یہ دیکھ کر دھکا لگا کہ ادارہ الفرقان بھی اس مہم میں شریک ہو گیا ہے۔ چنانچہ الفرقان کے شمارہ فروری۔ مارچ ۱۹۹۱ (صفحہ ۳۳) میں "الفرقان بکڈپو" کی طرف سے اس کا اشتہار چھاپا گیا ہے۔ الفرقان کے سرپرست مولانا محمد منظور نعمانی ہیں۔ اور اس کے اڈیٹران کے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمان سجاد ندوی ہیں۔ وقتی تاثر کے تحت میں نے سوچا کہ اس کے خلاف ایک سخت مضمون لکھوں جس میں الفرقان اور مذکورہ کتاب دونوں کو اکسپوز کیا گیا ہو۔

یہ تاثر ایک گھنٹہ تک رہا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان سطحی لوگوں پر اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں مثبت کام میں اپنا وقت لگاؤں۔ اس کے بعد میں نے اپنی الماری سے ایک قدیم فائل نکالی اور اس پر کام شروع کر دیا۔

یہ "سیرت رسول" پر ایک سادہ واقعاتی کتاب ہے۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۷۶ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ چند مہینے جاری رہ کر یہ کام رک گیا۔ دوسری بار ۲۹ دسمبر ۱۹۸۶ کو میں نے یہ کام شروع کیا۔ مگر ہجرت تک لکھنے کے بعد دوبارہ اس کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اب آج میں نے تیسری بار اس پر کام شروع کر دیا ہے۔ دعوتی کام کے لئے ایسی ایک کتاب کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ۱۹۹۱ کے آخر تک یہ کتاب مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد انشاء اللہ اس کو اردو، انگریزی اور ہندی میں شائع کیا جائے گا۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۵ مارچ ۱۹۹۱) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ ناروے کے ایک ماہر شماریات نے کمپیوٹر پر حساب کر کے بتایا ہے کہ انسانی تاریخ کے معلوم ۵۵۶۰ سال میں ۱۴۵۳۱ جنگیں ہوئی ہیں۔ انسانیت کی پچھلی ۱۸۵ نسلوں میں سے صرف دس نسلوں نے امن کا زمانہ دیکھا ہے:

A Norweigian statistician, working with computers, says that of the 5,560 years of recorded human history, there had been 14,531 wars. And, of the 185 generations of man's recorded experiences, only ten have known peace. (p. 3)

۲۷ مارچ ۱۹۹۱

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے ایک عربی پرچہ الرائد کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۳۰ رجب ۱۴۱۱ھ میں سعید الرحمٰن الاعظمی کے دستخط سے جو اداریہ چھپا ہے، اس کا جذباتی عنوان یہ ہے کہ: کاش وہ کرتا، مگر اس نے نہیں کیا (لیتہ فعل، ولکنہ لم یفعل)

یہ اداریہ صدام حسین کے بارہ میں ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صدام حسین کے پاس جو فوجی طاقت تھی، کاش اس نے اس طاقت کو اسرائیل کے خلاف استعمال کیا ہوتا تو آج وہ ساری مسلم دنیا کا ہیرو بن جاتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے اپنی طاقت کو ایران اور کویت کے خلاف استعمال کیا۔

میں کہوں گا کہ یہ حالت صرف صدام حسین کی نہیں ہے۔ بلکہ آج ہر مسلم رہنما کی حالت یہی ہے۔ ہر ایک اس کام میں لگا ہوا ہے جو اس کے کرنے کا نہ تھا، اور اس کام کو چھوڑے ہوئے ہے جو حقیقۃً اسے کرنا چاہئے تھا۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲۸ مارچ ۱۹۹۱) میں ترکی کے کسی ادیب کا قول نقل کیا گیا ہے۔ نام درج نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ یہ ہے:

Peace is the work of strong men, war the courage of the cowardly.

یعنی امن طاقت ور انسانوں کا عمل ہے، اور جنگ بزدل لوگوں کا عمل۔ یہ قول بہت بامعنی ہے۔ مجھے اس سے صد فی صد اتفاق ہے۔

۲۹ مارچ ۱۹۹۱

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اقبال پر عربی میں ایک کتاب لکھی ہے جو "روائع اقبال" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ مزید اضافہ اور نظر ثانی کے بعد شائع ہوا ہے جس کا نام "نقوش اقبال" ہے۔ اردو ترجمہ کا چھٹا اڈیشن ادارہ کی طرف سے مجھے بذریعہ ڈاک موصول ہوا ہے۔

مجھے "اقبالیات" سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تاہم ڈاک سے یہ کتاب ملی تو میں نے الٹ پلٹ کر

اس کو دیکھا۔ "دیباچہ طبع چہارم" کے عنوان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا دیباچہ جو اس میں شامل کیا گیا ہے، اس کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

"مصنف کو نقوش اقبال کی اس پذیرائی پر جو برصغیر ہند و پاک میں اس کو حاصل ہوئی، مسرت بھی ہے اور ایک گونہ حیرت بھی۔ مسرت اس بات پر کہ مصنف کے نقوش قلم نے اقبال کے نقوش جاوداں کے ساتھ ہم آغوش ہو کر تابانی اور درخشانی پائی اور ان کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوا"

ان الفاظ کو پڑھ کر مجھے سخت دھکا لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہوں گے جو مخلوق کے "نقوش جاوداں" کو جانیں مگر وہ خالق کے "نقوش جاوداں" کو نہ جان سکیں۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں، کم از کم میں یہی کہوں گا کہ انھوں نے خدا کی عظمت کو نہیں پایا اور نہ انھوں نے توحید کا ذائقہ چکھا۔ ورنہ ایک شاعر کے لئے ان کے قلم سے ایسے الفاظ نہ نکلتے۔ اپنے محبوب اکابر کے لئے ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ لکھ رہا ہے۔ مگر خدا کے لئے بڑے بڑے الفاظ لکھنے والا کوئی نہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۹۱

پاکستان میں ۱۹۶۵ میں جو صدارتی الکشن ہوا، اس میں جنرل ایوب خاں کے مقابلہ میں اپوزیشن کی امیدوار مس فاطمہ جناح تھیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کی مکمل حمایت کی، اگرچہ فاطمہ جناح ہار گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ میں بے نظیر بھٹو الکشن میں کھڑی ہوئیں تو اسی جماعت اسلامی نے فتویٰ دے دیا کہ اسلام میں عورت کی سربراہی جائز نہیں۔ اب نوائے وقت (۱۷ مارچ ۱۹۹۱) میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے موجودہ الکشن (۱۹۹۱) میں وہاں کی جماعت اسلامی نے دوبارہ عورت کی سربراہی کو جائز کر لیا اور بیگم خالدہ ضیاء کی مکمل حمایت کی، جو الکشن میں کامیاب ہو کر اس وقت بنگلہ دیش کی وزیر اعظم ہیں۔

جماعت اسلامی اسلام کو قائم کرنے کی علمبردار ہے۔ ایسے لوگ اسلام تو کیا قائم کریں گے، وہ الحاد کو بھی قائم نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی نظام اصول پسند لوگ قائم کرتے ہیں نہ کہ

ایسے لوگ جن کا کوئی مستقل اصول ہی نہیں۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۱

صغیر اسلم صاحب (کیلی فورنیا) کے اصرار پر آجکل میں تذکیر القرآن کو ریکارڈ کرا رہا ہوں۔ کہیں کہیں برائے ضرورت کچھ اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ آج سورہ المؤمن کی آخری تشریح کے خاتمہ پر حسب ذیل پیراگراف کا اضافہ کیا:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس منصوبہ کے تحت زمین پر بسایا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان دیکھے بغیر حقیقت کا اعتراف کرے۔ وہ فطرت کے خاموش اشاروں کو پڑھے۔ وہ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں سے سبق لے۔ وہ داعی کی زبان سے جاری ہونے والے کلام کا ادراک کرے۔

جو لوگ اس حقیقت کو مان لیں اور اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دیں، وہ جنت میں آبادکاری کے لئے چن لئے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح حقیقت کو ماننے پر راضی نہ ہوں ان کے سامنے آخر کار حقیقت کو برہنہ صورت میں کھول دیا جاتا ہے۔ مگر یہ کھولنا ان کو اعتراف کا موقع دینے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صرف ان کے مجرمانہ انکار کو ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے بعد انجام کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے نہ کہ عمل اور اعتراف کا مرحلہ۔

یکم اپریل ۱۹۹۱

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس الصیام من الطعام والشراب انما الصیام من اللغو والرفث (روزہ کھانا اور پانی چھوڑنے کا نام نہیں۔ روزہ تو لغو اور بیہودہ بات کو چھوڑنے کا نام ہے۔

بظاہر اس پر حصر کا انداز ہے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ روزہ میں کھانا اور پانی نہ چھوڑے تو کوئی ہرج نہیں۔ البتہ لغو اور رفث کو چھوڑ دینا چاہئے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ مذکورہ حدیث دراصل دعوتی اسلوب میں ہے۔ اس میں روزہ کی اصل اسپرٹ پر زور دیا گیا ہے، اس میں کھانا اور پانی چھوڑنے کا مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

۲ اپریل ۱۹۹۱

تہران سے ایک عربی پرچہ (نصف شہریہ) نکلتا ہے۔ اس کا نام الشہید الدولی ہے۔ اس کی پیشانی پر "صوت الثورۃ الاسلامیۃ" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ شعبان ۱۴۱۱ھ (فروری ۱۹۹۱) کے آخری صفحہ پر لنعتبر جمیعاً کے زیر عنوان ایک مضمون خلیج کی جنگ کے بارہ میں شائع ہوا ہے، جو عراق کی بدترین شکست پر ختم ہوئی۔

اس میں درج ہے کہ بغداد کی حکومت نے پہلے جو کچھ کہا وہ سب سے جھوٹا پروپگنڈہ تھا۔ ورنہ اس کا وہ کیمیاوی ہتھیار کہاں گیا جس کی دھمکی وہ امریکہ اور اتحادی طاقتوں کو دے رہا تھا۔ اس کی وہ دھمکی کیا ہوئی جس میں اس کا کہنا تھا کہ اگر عراق کے خلاف جنگ چھیڑی گئی تو آدھے اسرائیل کو برباد کر دیا جائے گا۔ ان کا وہ دعویٰ کہاں ہے جس میں وہ ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کی بات کرتے تھے تاکہ کویت کو عراق کے صوبہ کی حیثیت سے باقی رکھ سکیں۔ وہ امّ المعارک کہاں ہے جو ام الھزائم بن گئی۔ (واین ام المعارك التی انقلبت الی ام الھزائم)

یہ تبصرہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تحریکوں پر صادق آتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ایران کے نام نہاد اسلامی انقلاب پر بھی۔ ہر ایک نے آغاز میں اپنے کام کو "امّ المعارک" قرار دیا مگر ہر ایک آخر میں "ام الھزائم" ثابت ہوا۔

۳ اپریل ۱۹۹۱

ریاض کے عربی مجلہ "الفیصل" کے شمارہ فروری ۱۹۹۱ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں خلیج کے مسئلہ پر "حزن والم" کا اظہار کرتے ہوئے یہ حکیمانہ مقولہ نقل کیا ہے: اذا اردت أن تغلق سجناً فافتح مدرسة (اگر تم جیل خانہ کو بند کرنا چاہتے ہو تو تم تعلیم گاہ کھول دو)

یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیج کے المیہ اور دوسرے تمام المناک واقعات کا اصل سبب مسلمانوں کی بے شعوری ہے۔ عراقی عوام کی بے شعوری نے صدام حسین جیسے ڈکٹیٹر کو پیدا کیا۔ پھر مسلمانوں کی بے شعوری نے صدام کو ساری مسلم دنیا کا ہیرو بنا دیا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس قسم کے المناک واقعات سے امت کو بچائیں تو ہم کو سب سے پہلے مسلمانوں کو باشعور

قوم بنانا ہوگا۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۱

مدینہ کی جامعہ اسلامیہ کے تعلیم یافتہ ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے اخوانی لیڈر ڈاکٹر سعید رمضان کا ایک قصہ بتایا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے میگزین المسلمون کا کیا حال ہے۔ انھوں نے کہا کہ المسلمون کا وہی حال ہے جو مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ چیونٹی کی چال چل رہا ہے جیسے کہ مسلمان چل رہے ہیں:

قال الدکتور سعید رمضان حین سأله سائل عن حال مجلته "المسلمون" فقال: ان حال "المسلمون" کحال المسلمین، تدب دبیب النمل کما یدب المسلمون

۱۵ اپریل ۱۹۹۱

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد زبان سے ایک آہ نکلی اور دل کا دردناک احساس اس طرح لفظوں کی صورت میں ڈھل گیا: یہ دنیا سطحی لوگوں کی دنیا ہے۔ مگر میرا حال یہ ہے کہ سطحی بننے کی صلاحیت نہیں۔ اور سطحی نہ بننے کی صورت میں جو تعب اٹھانا پڑتا ہے اس کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں۔ خدا اس بندے کی مدد فرمائے جو دو مصیبتوں کے درمیان ہے۔ اور دونوں میں سے کسی مصیبت کو وہ نہ حذف کر سکتا ہے اور نہ اس کا تحمل کر سکتا ہے۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۱

لارس جانسن (Lars Johnsson) سویڈن کے رہنے والے ہیں۔ وہ الکٹرانک انجینئر ہیں۔ ان کی عمر ۳۶ سال ہے۔ وہ ہندستان میں بطور سیاح آئے ہیں۔ حمید اللہ کشمیری صاحب کو وہ دہلی کی جامع مسجد میں مل گئے۔ وہ ان کو میرے پاس لے آئے۔ ان کو میں نے کچھ انگریزی کتابیں دیں۔

ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اسلام کے بارہ میں کیا جانتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں اسلام کے بارہ میں بہت کم جانتا ہوں۔ میں نے ان سے مختصر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ سویڈن میں اکثر لوگ اسلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ تشدد کا مذہب ہے:

It's unfortunate that many people in Sweden view Islam as a violent religion.

میں نے کہا کہ یہ اسلام کا الٹا تعارف ہے جو نام نہاد مسلم لیڈروں نے کرایا ہے۔ حقیقی اسلام تو امن کا مذہب ہے۔ میں نے یہ آیت (واللہ یدعوا الیٰ دار السلام) ان کو سنائی اور اس کی مختصر تشریح کی۔

۷ اپریل ۱۹۹۱

ڈاکٹر ایم سی شرما کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ وہ ماہنامہ منتھن (ہندی) کے اڈیٹر ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ کافی سلجھے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی موجودہ سیاست سے انھیں اتفاق نہیں۔ انھوں نے کہا: لگتا ہے کنویں میں بھانگ پڑ گئی ہے۔ کنویں میں بھانگ پڑ جائے تو سارے لوگ جو اس سے پانی پئیں گے وہ نشہ میں ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کہ ایک طرف سے سب کی عقل بگڑ گئی ہو۔

یہ بات انھوں نے ہندوؤں کی نسبت سے کہی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات مسلمانوں کے بارہ میں اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ موجودہ مسلمان بار بار جو نادانیاں کر رہے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سب کی عقلیں چھن گئی ہوں۔

۸ اپریل ۱۹۹۱

آل انڈیا ریڈیو پر اس سال سے "سحر گاہی" کا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ یہ فجر سے پہلے سحری کے وقت ہوتا ہے۔ اس میں تلاوت، حمد و نعت اور تقریر وغیرہ نشر کی جاتی ہے۔ آج روزہ کے تجربات پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی تقریر آرہی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار روزہ میں ایک ہندو دوست کے یہاں جانا ہوا۔ وہ کھانے کے لئے سموسہ لے آیا۔ میں نے کہا کہ میرا روزہ ہے۔ پھر وہ پھل لایا۔ میں نے کہا کہ روزہ میں پھل کھانا بھی منع ہے۔ پھر وہ ٹھنڈا پانی لایا۔ میں نے کہا کہ ہم لوگ روزہ میں پانی بھی نہیں پیتے۔ ہندو دوست نے کہا: ہم لوگوں کا فاسٹ ہوتا ہے اور آپ لوگوں کا سپر فاسٹ۔

۹ اپریل ۱۹۹۱

دو صاحبان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے ذریعہ سے آپ ایک مفید کام کر رہے ہیں۔ مگر آپ کی تنقیدیں اس کی افادیت کو گھٹا رہی ہیں۔ آپ اپنے مضامین میں اکابر ملت پر تنقیدیں کرتے ہیں۔ اس سے لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور الرسالہ سے متوحش ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ اکابر پر تنقید کرنا چھوڑ دیں تو الرسالہ کا حلقہ مطالعہ بہت بڑھ جائے گا۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انھیں شخصیتوں کے واسطہ سے دین سے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ وہی چیز ہے جس کو اکابر پرستی کہا جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی خدا کے واسطہ سے دین سے وابستہ ہو۔ چنانچہ لوگ دیندار ہو کر بھی اعلیٰ ربانی کیفیات سے محروم رہتے ہیں۔ اعلیٰ ربانی کیفیات خدا پرستی والے دین سے ملتی ہیں نہ کہ اکابر پرستی والے دین سے۔

۱۰ اپریل ۱۹۹۱

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ الرسالہ میں لوگوں کے "اکابر" پر کبھی کبھی جو تنقید آتی ہیں، اس سے لوگ برہم ہیں۔ مگر الرسالہ کی ان تنقیدوں سے کروروں گنا زیادہ بڑی تنقید وہ ہے جو موجودہ زمانہ میں خدا کے اوپر کی گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو علوم مدون کئے گئے ہیں وہ سراسر خدا کے اوپر تنقید ہیں۔ ان علوم میں سرے سے خدا کے وجود کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ان علوم کے مطابق، کسی بھی اعتبار سے خدا کی کوئی حیثیت نہیں۔

تعلیم گاہ، لائبریری اور دوسری تمام انسانی سرگرمیوں کی بنیاد انھیں مخالفانہ علوم پر ہیں۔ خدا کے خلاف دوسو سال سے اتنی بڑی تنقید ہو رہی ہے، مگر سارے عالم اسلام میں کوئی بھی نہیں جو اس کے لئے واقعی معنوں میں تڑپ اٹھا ہو۔ لوگ اکابر کے خلاف تنقید پر بپھر رہے ہیں، مگر خدا کے خلاف تنقید پر کوئی بپھرنے والا نہیں۔ اگر کوئی شخص اس پر بپھرتا تو وہ جدید علوم کا گہرا مطالعہ کر کے ان کے رد میں طاقتور لٹریچر تیار کرتا۔ مگر سارے عالم اسلام میں اس موضوع پر کوئی ایک بھی طاقتور کتاب لکھی نہ جا سکی۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۱

قرآن میں حضرت زکریا کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے رب کو چھپی

آواز سے پکارا (اذ نادیٰ ربہ ندآءً خفیا) مریم ۳۔

آج میں آہستہ آہستہ دل میں اللہ سے دعا کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ آیت یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کے ساتھ گزرا ہے۔ بے شمار لوگوں کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ایک برتر ہستی کو پکارتے ہیں اور ان کی پوری روح کو یہ تسکین مل رہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کو پکار رہے ہیں وہ ایسی مافوق ذات کو پکار رہے ہیں جو آہستہ آواز کو بھی سنتا ہے اور آدمی کی مدد کرتا ہے۔

بے شمار انسانوں کے ساتھ گزرنے والا یہ واقعہ گویا ایک تجرباتی ثبوت ہے۔ اس سے نفسیاتی سطح پر یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان کے اوپر ایک برتر خدا موجود ہے۔ اور انسان اور اس خدا کے درمیان بندہ اور رب کا تعلق پایا جاتا ہے۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۱

صحیح البخاری (کتاب التفسیر) میں سورۃ القصص کے تحت یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ کوشش کی کہ آپ کے چچا ابو طالب ایمان قبول کر لیں۔ مگر آخر وقت تک انھوں نے ایمان قبول نہیں کیا (ابی ان یقول لا الٰہ الا اللہ) اس پر یہ آیت اتری کہ انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء (القصص ۵۶) بخاری کی اس روایت کی بنا پر تمام مفسرین نے اجماع کر لیا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابو طالب سے ہے۔

مگر بخاری کی روایت کا یہ مطلب لینا صحیح نہیں۔ اس آیت میں دراصل ایک 'اصول' کو بتایا گیا ہے۔ ابو طالب کا واقعہ اس اصول کے تحت آتا ہے نہ کہ وہی اصل مراد ہے۔

اصل یہ ہے کہ دعوت کو خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے، ایک شبہہ کا پہلو پھر بھی موجود رہتا ہے۔ شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑنا مدعو کا کام ہے۔ وہ داعی کا کام نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حد تک سارے دلائل دے دئے تھے۔ مگر پھر بھی شبہہ کا ایک پہلو باقی تھا۔ اور اس کو ابو طالب کو پھاڑنا تھا۔ وہ اس شبہہ کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ اس لئے وہ ایمان بھی نہ لا سکے۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۱

جمعہ کی نماز کالی مسجد (نظام الدین میں) پڑھی۔ جمعۃ الوداع کی وجہ سے مسجد میں کافی نمازی تھے۔ امام صاحب نے خطبہ سے پہلے اردو میں پرجوش تقریر کی۔ ہندستان میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا: انشاء اللہ ہم یہاں دوبارہ سر بلند ہوں گے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی اور یہ بہت جلد ہوگا۔ نمازیوں نے کہا: انشاء اللہ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہی عام مزاج ہے۔ وہ فخر و ناز کی نفسیات میں جیتے ہیں۔ اس لئے "حکومت" سے کم کوئی چیز انھیں اپنے مقام سے فروتر دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان صرف بڑے بڑے نعرے مقبول ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی زیادہ بے معنی کیوں نہ ہوں۔ اور چھوٹی بات ان کے یہاں غیر مقبول ہو جاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی زیادہ اہم کیوں نہ ہو۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۱

"خلیج ڈائری" کتاب کی صورت میں چھپنے والی ہے۔ اس کے ٹائٹل کی پشت پر چھاپنے کے لئے حسب ذیل مضمون لکھ کر دیا:

پچھلے ساڑھے پانچ ہزار سال کی انسانی تاریخ میں ۱۴ ہزار سے زیادہ جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ خلیج کی حالیہ جنگ بھی انھیں میں سے ایک تھی جو ڈیڑھ مہینہ تک پوری ہولناکی کے ساتھ جاری رہی۔ واقعاتی اعتبار سے یہ جنگ اب ماضی کی ایک داستان ہے۔ مگر عبرت اور نصیحت کے اعتبار سے وہ ایک تاریخی ہدایت نامہ ہے، حال کے لئے بھی اور آنے والے مستقبل کے لئے بھی۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۱

کسی کا قول ہے کہ ہر چیز کے آغاز میں ایک عورت موجود ہوتی ہے:

There is a woman at the beginning of all great things.

دوسرا قول ہے کہ ہر کامیاب عورت کو ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے آگے ایک مرد موجود ہو:

Every successful woman needs a front man.

بظاہر دونوں قول ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک قول میں معاملہ کو عورت کے رخ سے دیکھا گیا ہے اور دوسرے قول میں معاملہ کو مرد کے رخ سے۔

دنیا کا کاروبار عورت اور مرد دونوں مل کر چلاتے ہیں۔ عورت کو مرد کی ضرورت ہے اور مرد کو عورت کی۔ عورت کو مرد کی صورت میں ایک فعال مددگار حاصل ہوتا ہے۔ اور مرد کو عورت کے ذریعہ سکون اور استقامت کا فائدہ ملتا ہے۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۱

چارلس چرچل (Charles Churchill) ایک انگریز شاعر ہے۔ وہ ۱۷۳۱ میں لندن میں پیدا ہوا، اور ۱۷۶۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ آج ٹائمس آف انڈیا نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عقل والے تھوڑے ہیں مگر آنکھ والے بہت ہیں:

Few have reason, most have eyes.

آدمی اپنی آنکھ کے ذریعہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ اور عقل کے ذریعہ معلومات کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ میں نے اپنے تجربہ میں پایا کہ لوگوں کے پاس معلومات ہوتی ہیں۔ مگر ان کی عقل اس صلاحیت سے محروم ہوتی ہے کہ کسی بات کو اس کے صحیح محل میں رکھیں اور حاصل شدہ معلومات سے وہی نتیجہ اخذ کریں جو فی الواقع اس سے نکل رہا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ شروع ہونے سے پہلے صدام حسین نے جرمن ٹیلی ویژن کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ جنگ میں بہت سے نقصانات ہوں گے۔ مگر اللہ عراق کے ساتھ ہے۔ اور ان شاء اللہ عراق جارح امریکہ کو شکست دے گا:

Mr Saddam Hussein told German TV that in a war there would be many losses. But Allah is on Iraq's side, and Iraq would beat the aggressor, Insha Allah.

مجھے یاد آتا ہے کہ میرے چھوٹے بھائی میری والدہ کو مطمئن کرنے کے لئے اکثر فرضی طور پر

"انشاء اللہ" کہہ دیا کرتے تھے۔ والدہ اس کو سمجھ جاتیں اور کہتیں " تیرا انشاء اللہ جھوٹا ہے"۔ یہی قصہ صدام حسین کے انشاء اللہ کا ہے۔ حقیقی انشاء اللہ اپنے آپ کو اللہ کے پیچھے چلانے کا نام ہے۔ لیکن اکثر لوگ خود اللہ کو اپنے پیچھے چلانے کے لئے انشاء اللہ کا کلمہ کہہ دیتے ہیں۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۱

ایک منظر دیکھ کر خیال آیا کہ ـــــ ایک دنیا کی جنت ہے اور ایک آخرت کی جنت۔ دنیا کی جنت کو حاصل کرنے کے لئے ہر آدمی ہوشیاری دکھاتا ہے۔ مگر آخرت کی جنت کی خاطر کوئی ہوشیاری دکھانے والا نہیں۔ آج کی عارضی جنت کے معاملہ میں ہر آدمی آخری حد تک ہوشیار ہے۔ اور کل کی ابدی جنت کے معاملہ میں ہر آدمی آخری حد تک بے وقوف۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۱

ایک مسلم نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ وہ مرادآباد کے کسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی نصیحت کیجئے۔ میں نے کہا کہ آپ یہ طے کر لیجئے کہ آپ کو ہر حال میں فرسٹ کلاس سے پاس ہونا ہے۔ اگر آپ کا سکنڈ کلاس آئے تو سمجھئے کہ میں فیل ہو گیا۔

انھوں نے کہا کہ سکنڈ کلاس پاس ہونا بھی تو پاس ہونا ہے۔ میں نے کہا کہ سکنڈ کلاس پاس ہونے والا اسکول کے رجسٹر میں پاس ہوتا ہے۔ مگر وہ زندگی میں فیل ہو جاتا ہے۔ آپ رجسٹر کو دیکھ رہے ہیں جو اسکول کی الماری میں بند ہو کر رہ جائے گا۔ میں آپ کے مستقبل کو دیکھ رہا ہوں جس سے ساری عمر آپ کا سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۱

قرآن میں یہود سے کہا گیا ہے کہ ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلا (البقرہ ۴۱) اس کی مختلف تفسیریں کی جاتی ہیں۔ میرے خیال سے اس کا مطلب یہ ہے کہ ـــــ دین کا استغلال نہ کرو۔ خدا کے دین کو ذاتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بناؤ۔

" نیا عہد نامہ " میں یہودی علماء کے بارہ میں ہے کہ یہ لوگ ناجائز نفع کی خاطر ناشائستہ باتیں سکھا کر گھر کے گھر تباہ کر دیتے ہیں (طیطس ۱ : ۱۱) قدیم زمانہ میں کوئی شخص اپنی عملیات کے ذریعہ ایک گھر تباہ کر سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ایک شخص اپنی ذاتی قیادت کے لئے پورا

ملک اور بعض اوقات پوری دنیا کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہندستان میں اس کی ایک مثال بابری مسجد کے نام پر اٹھنے والے مسلم لیڈر ہیں اور عالم اسلام کی سطح پر "قبلۂ اول" کے نام پر اٹھنے والے لیڈر۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۱

فجر کی نماز نظام الدین بستی کی قریش مسجد میں پڑھی۔ فراغت کے بعد مسجد کے باہر نکلا تو میرے ساتھ مولانا عبد اللہ طارق صاحب بھی نکلے۔ سامنے نظر آیا کہ بستی کے دو مسلمان ملک بوتھ سے دودھ کی تھیلیاں لئے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ مولانا عبد اللہ طارق نے ان سے کہا: بھائی ہمارے لئے بھی ایک تھیلی لے لیتے۔ وہ دونوں کوئی جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئے۔

میں نے مولانا عبد اللہ طارق سے پوچھا۔ کیا نظام الدین بستی میں کوئی ایسا مسلمان ملے گا جو اپنے دودھ کے ساتھ آپ کے لئے بھی روزانہ ایک تھیلی دودھ لا دیا کرے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اب دوسرا قصہ سنئے۔ ہمارے یہاں ایک لڑکا روزانہ صبح کو دودھ لاتا تھا۔ وہ چلا گیا۔ چنانچہ ہمارے یہاں دودھ آنا بند ہوگیا۔ ہمارے ایک ہندو پڑوسی مسٹر پرمود بترا کی اہلیہ مسز بترا روزانہ اپنا دودھ خود لاتی ہیں۔ انھوں نے ملک بوتھ کی لائن میں ہمارے یہاں کے لڑکے کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے ٹیلیفون کرکے میری اہلیہ سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میری اہلیہ نے بتایا کہ ہمارا لڑکا چلا گیا ہے۔ اس لئے آجکل ہمارے یہاں دودھ نہیں آرہا ہے۔ اس کے بعد سے مسز بترا اپنا دودھ لینے جاتی ہیں تو وہ مزید دو تھیلی دودھ لیتی ہیں اور پھر اپنے ملازم کے ذریعہ ہر روز صبح کو ہمارے یہاں بھیجتی ہیں۔

ہندو اور مسلمان کے اس فرق کے سبب پر گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو ایک بامقصد قوم ہیں اور موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔ ہندو کا مقصد ہے پیسہ کمانا۔ مسلمانوں کا کوئی بھی سوچا سمجھا ہوا مقصد نہیں۔ جب آدمی شعوری طور پر ایک مقصد کو اپنائے تو اس کی نسبت سے اس کے اندر کچھ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اوصاف اصلاً اپنے لئے ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ان کا ایک حصہ دوسروں کو بھی مل جاتا ہے۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۱

ایک سو آدمیوں کی نماز باجماعت اس وقت قائم ہوتی ہے جب ان کے ۹۹ افراد پچھلی سیٹ پر جانے کے لئے راضی ہوجائیں۔ اسی طرح ملت کا احیاء اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد اسی پر راضی ہوجائے کہ وہ پچھلی صف میں رہ کر اپنے حصہ کا عمل کرے گی۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس پر راضی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان احیاء ملت کا کوئی مؤثر کام بھی اب تک نہ ہوسکا۔

اس صورت حال کی ذمہ داری زیادہ تر موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین پر ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے ان کے اندر فخر کا ذہن پیدا کیا۔ دین کی افضلیت پر فخر، تاریخ کی عظمت پر فخر۔ اپنے خیر امت ہونے پر فخر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان شدت کے ساتھ فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوگئے۔ اور فخر و ناز کی نفسیات اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ تواضع کی نفسیات سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ فخر کی نفسیات سے۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۱

اقبال نے اپنی آخر عمر میں اپنے بارہ میں فارسی کا یہ شعر کہا تھا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ شاید میری عمر پوری ہوگئی اور موت کا وقت قریب آگیا۔ میرے احساسات کی ترجمانی اردو شاعر کے اس شعر میں ہوتی ہے:

صبح گزری شام ہونے آئی میر — تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا۔

کوئی آدمی "دانائے راز" تھا یا نہ تھا، اس کا انحصار ذاتی یقین پر نہیں ہے، بلکہ خدا کی تصدیق پر ہے۔ جب تک خدا ظاہر ہوکر اپنی رائے نہ دے دے اس وقت تک ہر آدمی کا معاملہ مشتبہ ہے۔ حقیقت وہ ہے جو خدا کے ذہن میں ہے نہ کہ وہ جو انسان اپنے ذہن میں پا رہا ہو۔

۲۴ اپریل ۱۹۹۱

پروفیسر کشن سنگھ تقسیم سے پہلے سکھ نیشنل کالج (لاہور) میں انگلش کے استاد تھے۔ ۱۹۴۷ میں وہ انڈیا آ گئے۔ یہاں وہ دیال سنگھ کالج (دہلی) کے انگلش ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہو گئے۔ اب وہ ریٹائر ہو کر پٹیل نگر میں رہتے ہیں۔

ان سے میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو لیڈر اور حکمراں ان کو صرف بے وقوف بناتے ہیں۔ کسی کو ان سے ہمدردی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہندستانی لیڈروں سے یہ امید کیوں کرتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ وہ آپ کا استحصال کریں گے:

Surely they will exploit you.

یہ بلاشبہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ اور یہ صرف ہندو لیڈروں کی بات نہیں، یہی اس دنیا کا قاعدہ ہے۔ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں یہی ہوگا کہ ہر ایک دوسرے کو اکسپلائٹ کرنا چاہے گا، خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی یا مسلمان۔ اس دنیا میں کوئی شخص یا گروہ صرف اہلیت کی بنیاد پر زندہ رہ سکتا ہے نہ کہ رعایت اور تحفظ کی بنیاد پر۔

۲۵ اپریل ۱۹۹۱

لاہور کے روزنامہ وفاق (۱۹ اپریل) کے صفحہ اول پر ایک خبر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد صاحب نے جماعت اسلامی کے مرکز منصورہ (لاہور) میں ۱۸ اپریل کو ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا: "یہ دور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا دور ہے۔ اور عالم اسلام کے اندر بیداری کی جو لہر بڑھ رہی ہے وہ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ مستقبل قریب میں امت مسلمہ ایک بار پھر دنیا کی قیادت و امامت کے منصب پر سرفراز ہو گی۔ اور جس طرح ماضی میں کفر کی سپر پاور زمٹ گئیں اسی طرح اس دور کی سپر پاور زبھی نیست و نابود ہو جائیں گی۔ اور صرف اللہ کا حکم روئے زمین پر نافذ ہوگا۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ عالم اسلام کے نوجوانوں میں جذبۂ جہاد اور شوق شہادت پیدا ہو چکا ہے اور وہ فلسطین، فلپائن اور افغانستان اور کشمیر میں غلبۂ اسلام کے لئے کفر

کی قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔"

یہی وہ جھوٹی خوش فہمیاں ہیں جن کو قرآن میں امانی کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے غلبہ کا امکان دعوت کے راستہ سے کھلتا ہے نہ کہ مذکورہ قسم کی قومی لڑائیوں سے جن کو غلط طور پر جہاد کہا جاتا ہے۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۱

پاکستان کے اخبار نوائے وقت کا شمارہ ۲۱ اپریل ۱۹۹۱ میرے سامنے ہے۔ یہ اقبال کی یاد کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ صفحہ اول پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

"۱۹۳۲ میں جب لاہور میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کا اجلاس ہوا تو میں عثمانیہ یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا۔ اس موقع پر مجھے ڈاکٹر اقبال کے پاس دو مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور ان سے تفصیلی گفتگو بھی رہی۔ وہ ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی طرف سے بے حد متفکر تھے اور کہتے تھے کہ جب تک ان کی علیحدہ مملکت نہ ہوگی، ان کا دین و تمدن خطرے میں رہے گا۔"

"۱۹۳۲" میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ دینی زوال کا شکار تھے۔ مگر اس وقت مسلمانوں کے تمام رہنما مسلمانوں کے سیاسی زوال کو ان کا اصل مسئلہ سمجھتے تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعد کو اگرچہ مسلمانوں نے سیاسی استقلال حاصل کر لیا مگر ان کے مسائل بدستور باقی رہے۔ کیونکہ جڑ میں جو خرابی تھی اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۱

ہر قوم پر بعد کے زمانہ میں زوال آتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھی زوال آچکا ہے۔ اب ان میں دوبارہ دینی بیداری لانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زوال کی جس سطح پر پہنچ چکے ہیں، اسی سطح پر انھیں دین کا ایک اڈیشن دے دینا۔ دوسرے یہ کہ ان کی سطح کو بلند کرنا اور پھر بلند سطح والا دین انھیں دینا۔ پہلا کام نہایت آسان ہے۔ اس میں فوراً مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا کام انتہائی مشکل ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے

میں بہت دیر لگتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین نے یہ کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کی شعوری سطح کو بلند کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ جس شعوری سطح پر تھے اسی سطح پر ان کو اسلام کا ایک اڈیشن دے دیا۔ اس طریقہ میں مقبولیت تو ملتی ہے مگر اس سے ملت کا حقیقی احیاء ممکن نہیں۔

۲۸ اپریل ۱۹۹۱

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈبل ایم اے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ جنوری ۱۹۹۱ کے صفحہ ۳۴ - ۳۵ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ مسلمانوں کو یک طرفہ صبر کی تلقین کر رہے ہیں۔ مگر حال میں میں نے ایک کتاب پڑھی۔ وہ آپ کے نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ جنگ (war) کے بارہ میں ایک کتاب تھی۔ مصنف نے لکھا ہے کہ جنگ میں ارادۂ جنگ (Will to fight) کی بے حد اہمیت ہے۔ اگر دشمن کی فوج سے ارادۂ جنگ کو ختم کر دیا جائے تو وہ لڑے بغیر ہار جائے گی۔ مثلاً ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں پاکستان کی ۹۰ ہزار فوج موجود تھی۔ مگر انڈیا نے اس کے مرکز (مغربی پاکستان) سے اس کا تعلق کاٹ دیا۔ اس کے بعد اس نے لڑنے کا حوصلہ کھو دیا۔ اور کافی تعداد اور ہتھیار کے باوجود سرینڈر کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان اگر آپ کے مشورہ کے مطابق کامل صبر کا طریقہ اختیار کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے اندر لڑنے کا حوصلہ ہی ختم ہو گیا۔ پھر تو یہ خودکشی کے ہم معنی ہوگا۔

میں نے کہا کہ آپ ایک اصول کو غلط منطبق کر رہے ہیں۔ یہاں ہم ہندوؤں سے برسر جنگ نہیں ہیں۔ ہم جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ نفرت کا مسئلہ ہے نہ کہ جنگ کا مسئلہ۔ مختلف اسباب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اس فضا کو ہمیں ختم کرنا ہے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو جائے۔ موجودہ حالات میں یہ معتدل فضا دو طرفہ بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں کہتا ہوں ہم یک طرفہ اقدام کر کے اس فضا کو ختم کر دیں۔ مزید یہ کہ نفرت کی اس فضا کا تعلق صرف ہندوؤں سے نہیں ہے۔ وہ خود مسلمانوں میں بار بار پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا حل ٹکراؤ نہیں ہوتا بلکہ اعراض اور خوش تدبیری اس کا حل ہوتا ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۹۱

پاکستان کا ہر آدمی یہ کہتا یا لکھتا ہوا ملے گا کہ "پاکستان اسلام کے لئے بنا" مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نعرہ پر بنا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلام کا اکسپلائٹیشن تو خوب ہوا مگر اسلام کا کوئی حقیقی کام اب تک نہ ہو سکا۔

اس کی ایک تازہ عبرت ناک مثال پاکستانی اخبار نوائے وقت (۲۴ اپریل ۱۹۹۱) میں نظر آئی۔ پاکستان میں اس وقت "اسلامی جمہوری اتحاد" کی حکومت ہے جس کے وزیر اعظم نواز شریف ہیں۔ اس حکومت نے شریعت بل ۱۹۹۱ پیش کیا ہے جو اس وقت قومی اسمبلی کے سامنے ہے۔ مذکورہ اخبار میں اس کی بابت وزیر اطلاعات ملک سلیم اقبال کا مضمون چھپا ہے جس میں اس بل کو "ایک تاریخ ساز قدم" بتایا گیا ہے۔

دوسری طرف اسی اخبار کے صفحہ اول پر یہ خبر ہے کہ "دینی و سیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر سرکاری شریعت بل مسترد کر دیا۔" خبر میں بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز (منصورہ) میں نو جماعتوں کا اجتماع ہوا۔ اس میں شریعت بل کو دھوکا بتا کر اتفاق رائے سے اس کو رد کر دیا گیا۔ اس فیصلہ میں جماعت اسلامی پاکستان بھی شریک ہے جو اسلامی اتحاد پارٹی میں شامل تھی اور جس نے الکشن کے وقت اس کو اسلام کی طرف تاریخی قدم بتایا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۱

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۱ شوال ۱۴۱۱ھ، ۲۵ اپریل ۱۹۹۱) میں صفحہ ۲۸-۲۹ پر فتاوی نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ جو لوگ بظاہر مسلمان ہیں مگر اپنے اندر نفاق لئے ہوئے ہیں، وہ اگر اسلام پر حملہ کریں تو اس کے جواب میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

الشیخ محمد بن صالح العثیمین نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک معلوم بات ہے کہ منافقین سے جہاد کافروں سے جہاد کی مانند نہیں ہے۔ کیوں کہ منافقین سے جہاد علم اور تکلم سے ہوتا ہے اور کافروں سے جہاد تلوار اور تیر کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

(ومن المعلوم أن جهاد المنافقين ليس كجهاد الكفار لأن جهاد المنافقين يكون بالعلم والبيان وجهاد الكفار يكون بالسيف والسهام)

یکم مئی ۱۹۹۱

دو آدمیوں کے درمیان ایک مہینہ سے جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو غلط بتا رہے تھے۔ ایک چاہتا تھا کہ دوسرا شخص معافی مانگے۔ دوسرا کہتا تھا کہ پہلے شخص کو معافی مانگنا چاہئے۔

میں نے ان میں سے ایک شخص کو بلا کر سمجھایا۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ غلطی کس کی ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسئلہ کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ اگر تمہارے دو لفظ بولنے سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہو تو تم کو بلا تاخیر ایسا کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ شخص دوسرے آدمی کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ "بھائی، مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دو" اس کے بعد فوراً جھگڑا ختم ہو گیا۔

۲ مئی ۱۹۹۱

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم اس کو پہچان لوگے (سیریکم آیاتہ فتعرفونہا (النمل ۹۳) قرطبی نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اللہ کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل جو تمہارے اندر اور آسمان و زمین کے اندر ہیں (ای دلائل قدرتہ ووحدانیتہ فی انفسکم وفی السماوات والارض) الجامع لاحکام القرآن ۱۳۰/۲۴۶

موجودہ زمانہ کی بہت سی سائنسی ایجادات اس آیت کی تصدیق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً ٹیلیویژن اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آدمی کے قول و عمل کا ریکارڈ کائنات میں موجود ہے۔ ریموٹ کنٹرول اس بات کا مظاہرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح غیر مرئی طور پر ہر چیز کو کنٹرول کر رہا ہے۔ وغیرہ۔

اسی طرح بعض لسانی چیزیں بھی غالباً اس کے مصداقات میں شامل ہیں۔ مثلاً قدیم زمانہ میں آخرت کا تصور صرف اجمالی طور پر ممکن تھا۔ اب زبان کی ترقی کی بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آدمی اس کو صحت لفظ کے ساتھ بیان کر سکے۔ مثلاً دنیا اور آخرت کے فرق کو بتانے کے لئے یہ کہنا کہ ـــــ دنیا امپرفکٹ ہے اور آخرت پرفکٹ۔

۳ مئی ۱۹۹۱

مئی کے تیسرے ہفتہ میں ہندستان کی مرکزی پارلی منٹ کے لئے الکشن ہونے والا ہے۔ آج ہمارے سامنے کے پارک میں بھارتیہ جنتا پارٹی ــــــ کا انتخابی جلسہ تھا۔ ایل کے اڈوانی تقریر کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۸۴ میں ہمارے صرف دو ممبر پارلی منٹ میں تھے۔ ۱۹۸۹ کے الکشن میں ہمارے ۸۶ آدمی منتخب ہو کر پارلی منٹ میں پہنچے۔ اس بار ہم نے ۲۰۰ آدمیوں کو اس کے لئے کھڑا کیا ہے۔

۲ سے ۸۶ تک پہنچنے کو انھوں نے اپنے دیوتا "شنکر بھگوان" کے خانہ میں ڈالا۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر مسلمانوں کی بابری مسجد تحریک کے خانہ میں جاتا ہے۔ مسٹر جناح نے ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم نیشنلزم کی تحریک چلا کر ہندو نیشنلزم کو جگایا۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ میں بابری مسجد کے نام پر شہاب الدین نے دوبارہ مسلم نیشنلزم کی تحریک چلا کر ہندو نیشنلزم کو آخری حد تک بیدار کر دیا۔

انھوں نے مزید کہا کہ اکتوبر ۱۹۹۰ میں ہم نے سومناتھ یاترا چلائی تو دو لاکھ ہندو نکل کر ہمارے ساتھ ہو گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس بھیڑ کو دیکھ کر غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ یہ لوگ ہمارے نام پر نہیں بلکہ رام کے نام پر جمع ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ مولانا مودودی نے پاکستان میں شوکت اسلام اور غلاف کعبہ کا جلوس نکالا۔ اس میں لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔ مگر وہ یہ نہ کہہ سکے کہ یہ بھیڑ اسلام اور کعبہ کے نام پر جمع ہوئی ہے نہ کہ ہماری جماعت کے نام پر۔ اس معاملہ میں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

۴ مئی ۱۹۹۱

تسلیم احمد خاں ایڈوکیٹ (سردھنہ) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ۱۹۸۶ سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ میرے اندر شروع سے فرقہ وارانہ ذہن نہیں تھا۔ میں ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہتا تھا۔ چنانچہ سردھنہ میں مجھے نگر پالیکا کے الکشن میں ہندو ووٹوں سے کامیابی ہوئی۔ میری اس پالیسی کو مسلمان برا کہتے تھے۔ اس بنا پر میں بھی اس احساس میں مبتلا رہتا تھا کہ میں بزدل ہوں اور بزدلی کی بنا پر ایسا کر رہا ہوں۔

مگر الرسالہ نے میرے اس احساس کو ختم کر دیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بزدلی کی بات نہیں یہ پرنسپل کی بات ہے۔ اس کے بعد میرے اندر نیا یقین اور نئی جرأت پیدا ہو گئی۔

۵ مئی ۱۹۹۱

صحابۂ رسول یا اصحاب رسول کا مطلب عام طور پر "صحبت یافتگان رسول" سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کا اصل مطلب ہے رفقاء رسول۔ یعنی رسول کا ساتھ دینے والے، رسول کی حمایت و معاونت کرنے والے۔ رسول کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنے والے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاحب مشن آدمی تھے۔ جب بھی کوئی شخص کسی ماحول میں ایک مشن کا آغاز کرتا ہے تو کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، اور کچھ لوگ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ جو لوگ ایسے آدمی کا ساتھ دیں اور اس کے مشن میں شریک ہو جائیں وہ اس کے اصحاب یا رفقاء ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر اہل ایمان اسی معنی میں آپ کے ساتھی تھے اس لئے وہ آپ کے اصحاب کہلائے۔

۶ مئی ۱۹۹۱

شفیق احمد کشمیری (رنگ بیل، سرینگر) ملاقات کے لئے آئے۔ کشمیر پر گفتگو کرتے ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ دو سال پہلے کشمیریوں کی متشددانہ تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک پاکستانی حکومت کے وعدہ پر شروع ہوئی تھی۔ انھوں نے کشمیری لیڈروں سے کہا کہ آپ لوگوں کو ہم ہتھیار دیتے ہیں۔ آپ کشمیر میں ہندستانی فوج کے خلاف متشددانہ کارروائی کرکے اندرونی طور پر گڑ بڑ پیدا کریں۔ اس کے بعد ہم اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں گے اور کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ مگر دو سال گزر گئے اور اس دوران ہزاروں کشمیری خاندان تباہ ہو گئے۔ کشمیر کی پوری اقتصادیات برباد ہو گئی۔ امن وامان بالکل ختم ہو گیا۔ مگر پاکستان نے حملہ نہیں کیا۔ اب کشمیری لیڈر اسلام آباد گئے تاکہ حکومت پاکستان کا وعدہ انھیں یاد دلائیں تو انھوں نے فوجی کارروائی سے صاف انکار کر دیا۔ شفیق احمد صاحب نے یہ بتاتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے ہم کو دھوکا دیا۔

میں نے کہا کہ اتنا کچھ بھگتنے کے باوجود اب بھی آپ لوگ اصل حقیقت کو نہ جان سکے۔

اصل بات یہ نہیں ہے کہ پاکستان نے آپ کو دھوکا دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ نے پاکستان سے دھوکا کھایا۔

۷ مئی ۱۹۹۱

ڈاکٹر انوار الحق اعظمی دہلی آئے تھے۔ وہ چند دن جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفتر میں ٹھہرے۔ انھوں نے بتایا کہ جماعت اسلامی کے کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ وحید الدین خاں نے یہ غلطی کی کہ وہ جماعت اسلامی سے نکل گئے۔ اگر وہ جماعت اسلامی میں رہتے تو آج وہی جماعت کے امیر ہوتے۔

جماعت اسلامی کے افراد کی زبان سے یہ بات میں بار بار سنتا رہا ہوں۔ مگر میرا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ جماعت اسلامی (یا اس قسم کی کسی بھی جماعت کا) امیر بننے کو میں اپنے لئے موت سمجھتا ہوں۔ اور جماعت کے باہر اپنی موجودہ حالت کو زندگی خیال کرتا ہوں۔ اگر میں جماعت اسلامی میں رہتا اور اس کا امیر بنا دیا جاتا تو یہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ میرے ذہن کے فکری امکانات خوابیدہ رہتے۔ اس کے بعد میرے ذہن میں ان تخلیقی افکار کی پیدائش ہی نہ ہوتی جو پچھلے ۲۰ سال کے دوران ہوئی اور الرسالہ اور کتابوں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچی۔

کسی جماعت کا امیر یا کسی حکومت کا سربراہ کبھی تخلیقی افکار پیش نہیں کرسکتا۔ اس قسم کے عہدے ہمیشہ تنظیمی عہدے ہوتے ہیں۔ ان عہدوں پر فائز ہونے کے بعد آدمی ایک طرح کا مشینی انسان بن جاتا ہے نہ کہ وہ زندہ انسان جو حقائق کے سمندر میں اترے اور تخلیقی نوعیت کے افکار مرتب کرسکے۔

۸ مئی ۱۹۹۱

بابو جگجیون رام ہریجنوں کے ایک بڑے لیڈر تھے۔ غالباً ۱۹۷۰ میں جمعیۃ علماء کے زیر انتظام دہلی کی عیدگاہ میں مسلمانوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں بابو جگجیون رام کو بھی بلایا گیا تھا انھوں نے ایک پرجوش تقریر کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: حقوق مانگے نہیں جاتے، حقوق لئے جاتے ہیں۔

جگجیون رام کا یہ جملہ مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ مگر یہ صحیح بات نہ تھی۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ـــــ حقوق مانگے نہیں جاتے، حقوق کی استعداد پیدا کی جاتی ہے۔

۹ مئی ۱۹۹۱

موجودہ ڈائری کے ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ کے صفحہ میں میں نے ذکر کیا تھا کہ لکھنؤ کا ماہنامہ الفرقان میرے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کی مہم میں شریک ہوگیا ہے۔ اس وقت یہ بات میں نے "فکر کی غلطی" کا اشتہار چھاپنے پر لکھی تھی۔ مگر اب اس کا شمارہ اپریل ۱۹۹۱ آیا تو اس میں میں نے دیکھا کہ "فکر کی غلطی" کا ایک پورا باب اس میں نقل کیا گیا ہے۔

یہ باب الفرقان میں "تبلیغی تحریک اور مولانا وحید الدین خان" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں تبلیغی جماعت کا مخالف ہوں مگر زمانہ شناسی (۴۸) کی بنا پر اس کی تائید کرتا ہوں۔

اصل یہ ہے کہ یہ حضرات تنقید کو مخالفت کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ ان کے مذہب میں یا کامل تعریف ہے یا کامل مخالفت۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں تبلیغی جماعت کو "کارِ نبوت کا احیاء" نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کو ایک مفید تحریک سمجھتا ہوں۔ اس بنا پر میں بعض پہلوؤں سے اس کی تائید کرتا ہوں۔ اور بعض پہلوؤں سے اس کی تنقید۔

۱۰ مئی ۱۹۹۱

دہلی سے ایک ہندی ماہنامہ منتھن نکلتا ہے۔ ڈاکٹر ایم سی شرما اس کے اڈیٹر ہیں۔ آج وہ ملنے کے لئے آئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے امکانات دسویں الکشن (مئی ۹۱) میں کیا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی رام کے نام پر الکشن لڑ رہی ہے۔ اور بھارت کی جنتا کے لئے رام میں اپیل کی ایک حد ہے۔ اس لئے زیادہ امکان یہی ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی تیسرے نمبر پر آئے۔

ڈاکٹر شرما خود بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک خاص آدمی ہیں۔ ان کی زبان سے یہ حقیقت پسندانہ بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ پاکستان میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی زیر قیادت جماعت اسلامی نے چار بار الکشن میں حصہ لیا۔ ہر بار انھیں تقریباً ۵ فیصد ووٹ ملے۔

اور وہ صرف چند سیٹیں حاصل کر سکے۔ مگر مولانا مودودی کی زبان سے کبھی یہ نہیں نکلا کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں "اسلام" کے نعرہ کی اپیل محدود ہے اور ہم کو ایک محدود طبقہ ہی کا ووٹ مل سکتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ کیا کہ ہر بار جب وہ الکشن میں ہارے تو انھوں نے یہ کہہ دیا کہ برسر اقتدار طبقہ کی دھاندلی کی وجہ سے ہم ہار گئے۔ اگر منصفانہ الکشن ہوتا تو ہماری جیت یقینی تھی۔

اس قسم کے تقابلی واقعات بار بار میرے علم میں آئے ہیں۔ ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو قوم زیادہ جاندار ہے۔

۱۱ مئی ۱۹۹۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں کسی شخص کو اتنی تکلیف نہیں دی گئی جتنی تکلیف مجھ کو دی گئی۔ (ما أُوذِيَ فِي اللّٰهِ أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوذِيتُ)

اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں جس اذیت کا ذکر ہے اس سے مراد جسمانی اذیت نہیں ہے بلکہ ذہنی اذیت (مینٹل ٹارچر) ہے۔ یہ ذہنی اذیت جو آپ کو پہنچی، وہ عین سنت الٰہی کے مطابق تھی۔ اور یہ نبی کے لئے بھی ہے اور غیر نبی کے لئے بھی۔

اس کا راز یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے جو ربانی احساسات چھپا رکھے ہیں ان کو بیدار کرنے کا واحد ذریعہ ہی "ذہنی اذیت" ہے۔ انسان کے ذہن میں جتنا زیادہ طوفان برپا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے ربانی احساسات جاگیں گے۔ نبی کے سلسلہ میں یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اس کے ربانی احساسات آخری حد تک بیدار کئے جائیں۔ اس لئے اس کو عام انسانوں سے زیادہ ذہنی اذیت کا تجربہ کرایا جاتا ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۹۱

کسی کے فضل کا اعتراف کرنا خدا کا اعتراف کرنا ہے۔ اور کسی کے فضل کا اعتراف نہ کرنا خدا کا اعتراف نہ کرنا ہے۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی چیز کسی کو ملتی ہے تو وہ اس کے لئے خدا کا عطیہ ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کا اعتراف نہ کریں انھوں نے گویا خدا کے فیصلہ کو نہیں مانا۔ اور اس سے زیادہ برا کون ہوگا کہ خدا ایک فیصلہ دے اور وہ خدا کے فیصلہ کو ماننے سے انکار

کر دے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۱

حجر بن عَدی بن جبلہ الکندی (م ۵۱ ھ) ایک صحابی تھے۔ انھوں نے امیر معاویہ کی خلافت پر بیعت نہیں کی۔ امیر معاویہ نے ان کو کوفہ سے دمشق بلایا۔ وہاں وہ امیر معاویہ کے حکم سے قتل کر دئے گئے۔ دوسری طرف عبد اللہ بن عمر بھی ایک صحابی تھے۔ انھوں نے بھی امیر معاویہ کی خلافت پر بیعت نہیں کی۔ مگر امیر معاویہ نے ان کو قتل نہیں کرایا بلکہ آزاد چھوڑ دیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد اللہ بن عمر نے اگرچہ امیر معاویہ کے اوپر بیعت نہیں کی۔ مگر وہ اس معاملہ میں خاموش رہتے تھے۔ وہ امیر معاویہ کے خلاف کوئی سیاسی بیان نہیں دیتے تھے۔ جب کہ حُجر بن عدی بالاعلان امیر معاویہ کے مخالف تھے۔ وہ امیر معاویہ کے خلاف خفیہ سرگرمیوں میں شریک تھے۔

۱۴ مئی ۱۹۹۱

لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں مولانا محمد تقی امینی (۱۹۹۱-۱۹۲۶) کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار مولانا اسعود عالم قاسمی لکھتے ہیں کہ ایک بار علی گڑھ میں مصر کے سابق حکمراں جمال عبد الناصر اور الاخوان المسلمون پر بات چل نکلی۔ مولانا کہہ گئے کہ اخوان نے جمال کی حکومت چھیننا چاہی تو جمال نے اخوان کو مٹانا چاہا۔ معاملہ برابر کا تھا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ مولانا، تو پھر حضرت موسیٰ نے فرعون کی حکومت چھیننا چاہی اور فرعون نے ان کے قتل کی سازش کی۔ یہ معاملہ بھی برابر کا رہا۔ اس پر مولانا بہت ناراض ہوئے صفحہ ۵۷

مضمون میں نہ مولانا تقی امینی کی طرف سے کوئی وضاحت تھی اور نہ "حکمت قرآن" کے اڈیٹر کی طرف سے کوئی نوٹ۔ حالانکہ مضمون نگار کی یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے۔ اخوان کے معاملہ میں تو یہ ثابت ہے کہ انھوں نے جمال عبد الناصر کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر حضرت موسیٰ کے بارہ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں۔ حضرت موسیٰ نے تو فرعون سے یہ اجازت طلب کی تھی کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے ساتھ ملک مصر سے باہر جانے دے۔ پھر فرعون کو اس کے اقتدار سے

ہٹانے کا کیا سوال۔

۱۵ مئی ۱۹۹۱

انڈیا ٹوڈے (۱۵ مئی ۱۹۹۱) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک بات چیت شائع ہوئی ہے۔ اس کے مطابق، مسٹر گری لال جین نے ہندستانی مسلمانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان خود اپنی بے وقوفی کا شکار ہیں۔ وہ غیر معمولی حد تک بیوقوف لوگ ہیں۔ وہ ایک ایسے ڈھانچہ کے لئے لڑ رہے ہیں جو اپنے مسجد ہونے کی حیثیت کو ختم کر چکا ہے:

> The Muslims are victims of their own stupidity. They are extraordinarily stupid people... To fight for a structure which has ceased to be a mosque! (p. 137)

انڈیا ٹوڈے کے اسی شمارہ میں بتایا گیا ہے کہ آجکل سارے ملک میں مسلم مخالف نعرے لگ رہے ہیں۔ کھلم کھلا کہا جا رہا ہے کہ 'بابر کی اولاد سے کہو کہ اگر بھارت میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا ہوگا' (صفحہ ۱۳۲)

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کے بعد سے مسلسل ملک میں اسی قسم کا ماحول ہے۔ مگر اس اشتعال انگیزی کے باوجود مسلمان مشتعل نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لئے فساد بھی بہت کم ہو رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا واحد چیک اعراض ہے۔ مسلمان بطور اصول تو اعراض کو اختیار نہ کر سکے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ عملی دباؤ کے تحت بطور مجبوری اس کو اختیار کر لیں گے۔

۱۶ مئی ۱۹۹۱

"گہری باتوں کو سمجھنے والے ابھی دنیا میں نہیں ہیں، پھر ان پر عمل کرنے والے کہاں ملیں گے"۔ ایک صاحب سے میں نے کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب آپ کا تاثر یہ ہے تو آپ لکھتے کیوں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اپنے دل کا بوجھ اتارنے کے لئے لکھتا ہوں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ کتابوں کو پڑھتے ہوئے یا دنیا کا مشاہدہ کرتے ہوئے کچھ خیالات میرے ذہن میں وارد ہوتے ہیں۔ انھیں خیالات کو میں قلم بند کر لیتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ خیالات میرے ذہن پر ایک بوجھ بنے رہیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کوئی خدا کا بندہ ان باتوں کو پڑھے

اور ان کے ذریعہ وہ سچائی کو پا سکے۔ اس طرح گویا میں مستقبل میں آنے والے کسی شخص کے لئے سیڑھی کے پیچھے زینے تیار کر رہا ہوں۔

۱۷ مئی ۱۹۹۱

رات کو ۱۲ بجے طرابلس سے محمد سلیمان القائد کا ٹیلیفون آیا۔ ان کے علاوہ برادر صالح اور برادر یوسف نے بات کی۔ یہ ایک حیران کن واقعہ ہے کہ محمد سلیمان القائد اردو ایک لفظ نہیں جانتے، مگر ہمارے مشن کو انھوں نے جتنا سمجھا ہے اتنا شائد کسی اردو داں نے بھی اب تک نہیں سمجھا۔

پچھلی ملاقات میں محمد سلیمان القائد نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کو میں ایک معجزۂ الٰہی سمجھتا ہوں کہ اس نے میرے دل میں آپ کی محبت ڈال دی۔ بات بلاشبہ صحیح ہے۔ وہ ایک عرب ہیں۔ نہایت باصلاحیت آدمی ہیں۔ ان کے سامنے مادی ترقی کے لئے بہت سے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مگر وہ دل و جان سے ہمارے مشن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ خدائی معاملہ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مشن کے لئے وہ "لینن" ثابت ہوں گے۔ پچھلی ملاقات میں ان سے کہا: انت کلیننا فی ھٰذہ الرسالۃ۔

۱۸ مئی ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مئی) کے سنڈے سکشن میں مسٹر خوشونت سنگھ (۷۶ سال) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ اب بھی صبح ۴ بجے سو کر اٹھ جاتے ہیں۔ آخر میں ان سے سوال کیا گیا کہ اب وہ ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں تاکہ وہ ایک (relaxed life) گزار سکیں۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے جواب دیا کہ اس سوال کا جو جواب میں نے مسٹر برلا کو دیا تھا، وہی آپ کو دیتا ہوں — "ریٹائر تو ہم شمشان گھاٹ پر ہی جا کر ہوں گے۔"

اس طرح کی بات جو لوگ کرتے ہیں وہ دراصل موت کے بارہ میں غیر سنجیدہ ہیں۔ موت کے مسئلہ سے غافل ہونے کی بنا پر وہ سمجھ رہے ہیں کہ موت کوئی آرام کرنے کا مرحلہ ہے۔ حالانکہ موت انسان کی زندگی کے سخت تر مرحلہ میں داخلہ کا نام ہے۔ جو شخص موت کی واقعی نوعیت کو جانے اس کی زبان سے کبھی ایسا جملہ نہیں نکلے گا۔

۱۹ مئی ۱۹۹۱

ابرار احمد خاں صاحب (۵۶ سال)، جمد اشاہی ضلع بستی کے رہنے والے ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ڈکشنری کی مدد سے انگریزی پڑھ رہا ہوں۔ تلفظ کے سلسلے میں عجیب عجیب لطیفے انھوں نے بتائے۔

انھوں نے انگریزی ڈکشنری میں delicious کا لفظ دیکھا۔ اس کے معنی "لذیذ" لکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس معنی کو یاد کرلیا۔ مگر اس کا تلفظ انھیں خود متعین کرنا تھا۔ انھوں نے اس کا تلفظ ڈیلی کیوز کیا اور اس کو رٹ کر یاد کرلیا۔ ایک بار ان کی ملاقات شہر بستی میں ایک دوست سے ہوئی۔ وہ انگریزی کا ٹیچر تھا۔ وہ ان کو ہوٹل میں لے گیا اور ان کے لئے چائے بسکٹ منگوائے۔ انھوں نے چائے اور بسکٹ نہیں لیا۔ دوست نے کہا کہ یہ بسکٹ لیجئے، یہ بہت ڈیلی شش ہیں۔ انھوں نے چونکہ delicious یاد کر رکھا تھا۔ انھیں دوست کے "ڈیلی شش" کہنے پر غصہ آگیا۔ انھوں نے کہا کہ تم انگریزی کے استاد ہو اور delicious کا تلفظ بھی نہیں جانتے۔ اس کا صحیح تلفظ ڈیلی شش نہیں، ڈیلی کیوز ہے۔

" علم کی یہ قسم آج کی دنیا میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ آدمی نہیں جانتا، اس کے باوجود وہ یقین کئے ہوئے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۹۱

آج رات کو درمیان میں نیند کھلی۔ ابھی میں لیٹا ہوا تھا اور اسی حال میں ایک مضمون کی بابت غور کر رہا تھا۔ دماغ میں یہ جملہ آیا ——— سیاست کو حالات کے تابع رکھنا، اور بقیہ معاملات میں اسلام پر بھرپور عمل کرنا، یہی اسلام کی پالیسی ہے۔" میں لیٹے لیٹے اس بات کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا کہ اسی درمیان جھپکی آگئی۔ اس وقت ایک لمحہ کے لئے محسوس ہوا کہ میرے داہنے کان میں کسی نے آہستہ آواز میں کہا کہ " ٹھیک ہے"۔

۲۱ مئی ۱۹۹۱

صبح کو میں اپنے دفتر میں تھا کہ بے اختیار یہ دعا زبان سے نکلی ——— یا اللہ میرے پاس جنت کا عمل نہیں، مگر میرے پاس جنت کی تمنا ہے۔ میں آپ سے جنت کی بھیک مانگتا

ہوں۔ بطور معاوضہ میں جنت کو نہیں پا سکتا، مجھ کو بطور بھیک جنت دے دیجئے۔ اگر میرے پاس جنت والے اعمال ہوتے تو مجھ کو جنت دینا آپ کی ضرورت ہوتا۔ مگر جب کہ میرے پاس صرف جنت کی التجا ہے تو جنت میری اپنی ضرورت ہے۔ ایک صورت میں آپ کی صفت عدل کا تقاضا تھا کہ آپ مجھے جنت دیں۔ دوسری صورت میں آپ کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے کہ آپ مجھ کو جنت سے محروم نہ کریں۔ اور آپ نے خود فرمایا ہے کہ سبقت رحمتی علیٰ غضبی۔

۲۲ مئی ۱۹۹۱

اصحاب رسول کون تھے۔ مارگولیتھ کے الفاظ میں، وہ ہیروؤں کی ایک جماعت تھی۔ انھوں نے اپنی بے مثال قربانیوں کے ذریعہ بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ اصحاب رسول سے پہلے توحید کا عقیدہ فکری تحریک کے مرحلہ میں تھا۔ انھوں نے توحید کے عقیدہ کو عملی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچایا۔ اصحاب رسول سے پہلے دین حق کی پشت پر کوئی تاریخ موجود نہ تھی، انھوں نے دین حق عظیم ترین واقعہ کی حیثیت سے انسانی تاریخ میں درج کیا۔

۲۳ مئی ۱۹۹۱

قرآن میں ہے کہ بچہ والی عورتیں اپنے بچوں کو دو برس کامل دودھ پلائیں (البقرہ ۲۳۳) دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ ماں کا اپنے بچہ کو دودھ چھڑانا دو برس میں ہوتا ہے۔ (لقمان ۱۴) اسی طرح حدیث میں ہے کہ لا رضاع الا ما کان فی الحولین (رضاعت صرف وہ ہے جو دو سال میں ہو) الجامع لاحکام القرآن ۱۶۲/۳

قرآن و حدیث میں دو سال کی واضح صراحت کی بنا پر جمہور کے نزدیک رضاعت کی مدت دو سال ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ اس کی مدت ڈھائی سال بتاتے ہیں، اور امام زفر نے اس کی مدت تین سال بتائی ہے۔ (قال ابوحنیفۃ : ثلاثون شهرا وقال زفر ثلاثۃ سنین) التفسیر المظہری ۳۲۳/۱

قدماء کے یہاں اس طرح کا اختلافِ رائے کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے اختلافات کی بنیاد پر وہ لوگ ایک دوسرے کو مطعون نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ تاویل سے کام لیتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی شخص اس طرح اپنی مختلف رائے ظاہر کرے تو فوراً اس کی تنقیص

وتفسیق کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدما زندہ لوگ تھے اور آجکل کے لکھنے اور بولنے والے مردہ لوگ۔

۲۴ مئی ۱۹۹۱

ابن جوزی کی دو کتابیں مجھ کو بہت پسند ہیں ـــــ تاریخ عمر بن الخطاب، اور سیرۃ ومناقب عمر بن عبد العزیز: الخلیفۃ الزاہد۔ میری خواہش ہے کہ میں ان دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ کروں۔ اور پھر پہلی کتاب کو عمر اول، اور دوسری کتاب کو عمر ثانی کے نام سے شائع کروں۔

صحابہ کی جماعت میں ایک ایک آدمی ہیرو تھا۔ تاہم عمر فاروقؓ کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ وہ یہ کہ ان کی زندگی ایک پر از واقعات زندگی (eventful life) ہے۔ ان کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات جمع ہو گئے ہیں۔ شاید کسی اور صحابی کی زندگی میں اتنے زیادہ متنوع واقعات جمع نہیں ہوئے۔

عمر بن عبد العزیز کی خصوصیت یہ ہے کہ صحابہ کے بعد وہ مجھے پوری امت میں ٹاپ پر نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں صفت میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ایک صاحب معرفت انسان تھے۔ خدا ان کے لئے ایک ڈسکوری تھا، نہ کہ کوئی تقلیدی ایمان۔ ابن جوزی نے اپنی کتاب (صفحہ ۸۱ - ۸۲) میں "نفس عمر تواقۃ الی العلیٰ" کے عنوان کے تحت جو روایتیں نقل کی ہیں وہ اس کا کافی ثبوت ہیں۔

عمر بن عبد العزیز کی دوسری خصوصی صفت یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق صحابہ کے بعد امت میں وہ آخری شخص ہیں جن کے اندر دعوت کا شعور کامل درجہ میں موجود تھا۔

۲۵ مئی ۱۹۹۱

اصحاب رسول سے متعلق کچھ مضامین تیار ہوئے ہیں۔ وہ انشاء اللہ الرسالہ ماہ ستمبر ۱۹۹۱ میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوں گے۔ اس نمبر کا نام ہوگا "عظمت صحابہ" اسی طرح انشاء اللہ میں کتابوں کا ایک سیٹ تیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی ترتیب یہ ہوگی:

۱ عظمت رب

۲ عظمت قرآن
۳ عظمت رسول
۴ عظمت صحابہ
۵ عظمت اسلام

ان میں سے ہر کتاب ۵۰ صفحہ کی ہوگی۔ ابتداءً ان کو الرسالہ کے مختلف شماروں میں شائع کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد ان سب کا مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں۔ انشاء اللہ العزیز۔

۲۶ مئی ۱۹۹۱

ظ۔ انصاری ابتداءً کیمونسٹ تھے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ آخر عمر میں وہ مذہب کے قریب آگئے تھے۔ ان کی تعلیم اردو، فارسی اور عربی کی ہوئی تھی۔ وہ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے تو ان کے ساتھی ان کا اس لئے مذاق اڑاتے تھے کہ ان کو انگریزی بہت کم آتی تھی۔ ظ انصاری کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے محنت کرکے نہ صرف انگریزی میں بلکہ روسی زبان میں بھی مہارت پیدا کرلی۔ حتی کہ ماسکو یونیورسٹی سے روسی زبان میں ڈاکٹریٹ کیا۔ وہ کئی مضمون میں اول آئے تھے۔

ظ انصاری (ظل حسنین) ۶ فروری ۱۹۲۵ کو سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۱ کو بمبئی میں ان کا کینسر میں انتقال ہوگیا۔ ہماری زبان (یکم جون ۱۹۹۱) میں ان کے ایک ساتھی رحمت امروہوی نے ایک "حکیمانہ نصیحت" نقل کی ہے۔ انھوں نے کہا: عقلمند آدمی وہ ہے جو اپنے پیچھے ایک مضبوط دیوار بنالے، پھر سامنے والے دشمن کو للکارے۔ اس طرح پیچھے سے کوئی اس پر وار نہ کرسکے گا۔

۲۷ مئی ۱۹۹۱

استاد اللہ رکھا ہندستان کے ایک مشہور سازندہ ہیں۔ وہ طبلہ وغیرہ بجانے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ٹی وی پران کا ایک پروگرام تھا۔ اپنے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میرا حال یہ ہے کہ میں راستہ یا بازار میں ہوتا ہوں تو وہاں بھی میرا ہاتھ چلتا رہتا۔ چنانچہ لوگ مجھ کو پاگل کہنے لگے۔ میرے یہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کے کان میں اذان دینے کے بجائے میں

نے طبلہ بجایا۔ طبلہ کی آواز پہلی آواز تھی جو میرے بچہ کے کان میں پہنچی۔

صحیح، غلط کے پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے، یہ کسی مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں وہی لوگ کمال حاصل کرتے ہیں جو اپنے مشن میں اس طرح اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیں۔ اس کی اہمیت حق کے راستہ میں بھی ہے اور باطل کے راستہ میں بھی۔

۲۸ مئی ۱۹۹۱

پیغمبر کا درجہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کے ساتھ انکشاف حقیقت کا وہ خصوصی معاملہ کیا جاتا ہے جو دوسروں کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ دوسرے لوگوں کو حقیقت کا بالواسطہ علم دیا جاتا ہے، اور پیغمبر کو براہ راست علم عطا ہوتا ہے۔ اس بنا پر عام لوگوں کی گرفت ہلکی ہے۔ لیکن اگر پیغمبر غلطی کرے تو اس کی گرفت بہت زیادہ سخت ہے۔

پیغمبر کے لئے گویا دار الامتحان ہی دار الآخرت بنا دیا جاتا ہے۔ پیغمبر اسی دار الامتحان میں خدا کا کلام سنتا ہے۔ وہ اسی دنیا میں عالم غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ عام لوگ ایمان بالغیب کی سطح پر ہوتے ہیں اور پیغمبر ایمان بالشہود کی سطح پر۔

۲۹ مئی ۱۹۹۱

علم النفس میں دو قسم کی شخصیتیں مانی گئی ہیں۔ ایک انٹروورٹ (introvert) اور دوسرے اکسٹروورٹ (extrovert) انٹروورٹ وہ انسان ہے جس کی سوچ اپنے اندر کی طرف چلے۔ اور اکسٹروورٹ وہ ہے جس کی سوچ باہر کی طرف چلتی ہو۔

مومن بنیادی طور پر introvert personality ہوتا ہے۔ وہ داخلی احتساب کرتا ہے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے۔ مگر جب دور زوال آتا ہے تو مسلمان extrovert بن جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ آجکل کے مسلمانوں میں تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان بھی اسی لئے ہے کیوں کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اکسٹروورٹ شخصیت دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ aggressive (۱۷/۱۳) ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ذمہ داری کو اپنے اوپر لینے کے بجائے دوسرے کے اوپر انڈیل دیتے ہیں۔ پہلے کا نتیجہ امن ہے اور دوسرے کا نتیجہ تشدد۔

۳۰ مئی ۱۹۹۱

زندگی ایک تلخ امتحان ہے۔ اس کو شیریں بنانے کی صورت یہ ہے کہ اس کو صرف امتحان سمجھا جائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی حیثیت نہ دی جائے۔

۳۱ مئی ۱۹۹۱

کانگرس کے موجودہ پریسیڈنٹ مسٹر پی وی نرسمہاراؤ کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ تقریباً دس زبانیں جانتے ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ہندستان میں زندگی گزارنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مل جل کر زندگی گزاری جائے:

The only way to exist in India is to co-exist.

یہ بلاشبہ نہایت صحیح بات ہے۔ ایک خاندان ہو، ایک قوم ہو یا ایک ملک ہو، ہر جگہ کامیاب زندگی بنانے کا یہی واحد اصول ہے۔ اس کے بغیر صرف ٹکراؤ ہوگا اور کوئی تعمیر ممکن نہ ہو سکے گی۔

یکم جون ۱۹۹۱

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، ہندوؤں میں عورتوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ ۱۹۸۱ میں ایک ہزار مردوں پر ۹۳۴ عورتیں تھیں۔ ۱۹۹۱ میں ایک ہزار مردوں پر ۹۲۹ عورتیں ہیں۔ عورتوں کی تعداد میں کمی کا بڑا سبب دراصل جنس کو جانچنے کا وہ طریقہ ہے جس کو ایمنیوسنٹی سس (amniocentesis) کہا جاتا ہے۔ اس کا رواج ہندوؤں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ ٹسٹ اگر لڑکی بتاتا ہے تو حمل (foetuses) کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، یکم جون ۱۹۹۱)

۲ جون ۱۹۹۱

۲ مارچ ۱۹۹۰ کو دو صاحبان تشریف لائے تھے ـــــ مولانا ولی رحمانی، مولانا احمد علی قاسمی۔ انھوں نے ہاشم القاسمی صاحب (حیدر آباد) کے معاملہ میں بات کی اور کہا کہ اس کو ختم کر دیں۔ میں نے شروع سے آخر تک پورا قصہ بتایا۔ اس کو سن کر وہ لوگ بالکل خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر وہ لوگ واپس چلے گئے۔

ہاشم القاسمی صاحب کو وہ لوگ اپنا آدمی سمجھتے ہیں۔ اپنے آدمی کی حمایت میں وہ لوگ یہاں

آئے۔ مگر جب میں نے انھیں حق بات بتائی اور حق ان کے سامنے آگیا تو حق کی حمایت کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوا۔ "اپنے آدمی" کی حمایت سے وہ لوگ آشنا تھے۔ مگر "حق" کی حمایت ان کے لئے ایک اجنبی چیز تھی۔ یہ بھی ایک پہلو ہے اس حقیقت کا جس کو حدیث میں بتایا گیا ہے: بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء۔

۳ جون ۱۹۹۱

موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے درمیان ایسی تحریک اٹھے جو حکومت الٰہیہ، احتساب عالم، امامت کبریٰ، خلافت اسلامیہ جیسے بڑے بڑے مقاصد بتائے تو بہت سے مسلمان اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسی تحریک اٹھائی جائے جو خوف خدا، احتساب خویش اور صبر وشکر جیسی چیزوں کی طرف دعوت دیتی ہو تو بہت کم مسلمان اس کی طرف توجہ دیں گے۔

یہ فرق اس بات کی علامت ہے کہ موجودہ مسلمان اپنے زوال کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں بڑے بڑے الفاظ بول کر ان کی بھیڑ جمع کرنا کوئی کام نہیں۔ بلکہ ان کے مرض میں اضافہ کرنا ہے۔ آج مسلمانوں کے درمیان صرف دوسرے ڈھنگ پر ہی کام کیا جانا چاہئے، خواہ لمبی مدت تک غیر مقبولیت کی صورت حال کو برداشت کرنا پڑے۔

۴ جون ۱۹۹۱

۱۴ مارچ ۱۹۹۰ کو مولانا احمد علی قاسمی (آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت) ہمارے دفتر میں آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کا تالا فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے کھولا گیا تھا۔ اتفاق سے ۲ فروری کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس تھا۔ مولانا علی میاں اور مولانا منت اللہ رحمانی وغیرہ دہلی میں موجود تھے۔ اس خبر کے بعد ۲ فروری کو "بچوں کا گھر" میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو سڑک پر نہ لایا جائے۔ اس کو عدالت کے دائرہ میں رہ کر طے کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک فنڈ بنایا گیا جس کا نام "بابری مسجد لیگل ایڈ فنڈ" رکھا گیا۔

میں نے کہا کہ اس فیصلہ کے بعد مولانا علی میاں نے کیوں سید شہاب الدین کے "اجودھیا

مارچ کی تائید کی اور اخبارات میں ان کا حمایتی بیان چھپا۔ مولانا احمد علی قاسمی نے بتایا کہ اس کی بابت مولانا علی میاں سے پوچھا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر میں نے مولانا احمد علی قاسمی سے کہا کہ اگر مولانا علی میاں کی طرف غلط بات منسوب کی گئی تھی تو انھوں نے اس کی تردید کیوں نہیں شائع کرائی۔ اس کا مولانا احمد علی صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

۵ جون ۱۹۹۱

قرآن میں ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے (ویعلم مافی الارحام، لقمان ۳۴) میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقام پر ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اللہ ہی تمہاری صورت بناتا ہے رحموں میں جس طرح وہ چاہتا ہے (ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء، آل عمران ۶) آل عمران میں جو بات قدرت کے الفاظ میں کہی گئی ہے وہی بات سورہ لقمان میں علم کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ کیوں کہ اللہ کا علم مجرد علم نہیں، اس میں قدرت بھی لازماً شامل ہے۔

۶ جون ۱۹۹۱

صحیح مسلم (کتاب البر) میں ایک روایت ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ جب آدمی یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہو گئے تو اس نے لوگوں کو ہلاک کر دیا (اذا قال الرجل ھلك الناس فھو اھلکھم)

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے اکثر قائدین اس حدیث رسول کا مصداق ہیں۔ کیوں کہ وہ قوم کو مسلسل بیرونی خطرات اور سازشوں کی خبر سنا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں پوری کی پوری قوم منفی نفسیات کا شکار ہو گئی ہے۔ یہی ہے قوم کو ہلاک کرنا۔

۷ جون ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۳ جون ۱۹۹۱) میں بتایا گیا ہے سوویت سویوز (Soviet Soyuz) مئی کے آخری ہفتہ میں دو دن کے لئے خلا میں اڑایا گیا۔ اس میں ایک ۴۳ سالہ روسی مرد (Colonel Anatoll Artsebarsky) سوار تھے اور ان کے ساتھ ایک ۲۷ سالہ برطانی خاتون (Helen Sharman) بھی تجربہ کے طور پر سوار کرائی گئی تھی۔ واپسی کے بعد روسی کرنل سے سفر کا تاثر پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ خلائی سفر ایک مشکل کام ہے، یہ عورت کے کرنے کا کام

نہیں :

It's hard work, not a woman's work. (p. 52)

بیسویں صدی کے نصف اول تک سارے مغرب میں جنون کے درجہ میں یہ نظریہ تھا کہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں۔ ہر کام جو مرد کرتا ہے وہ سب عورت بھی کر سکتی ہے۔ مگر اس صدی کے نصف آخر میں تجربات نے اس نظریہ کو بالکل باطل ثابت کر دیا۔

۸ جون ۱۹۹۱

شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۸۲۳-۱۷۶۲) بلند پایہ ہندستانی عالم تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو گیا ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

و انی اری الافرنج اصحاب ثروۃ لقد افسدوا ما بین دھلی و کابل

اور فرنگی جو دولت والے ہیں، ان کو میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔

شاہ عبد العزیز صاحب کے نزدیک انگریزوں کی حیثیت صاحب ثروت (دولت مند) کی تھی۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے، اپنی ثروت و دولت کے زور پر کر رہے تھے۔ حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں۔ انگریز کی اصل حیثیت یہ تھی کہ وہ اصحاب علم تھے۔ وہ سائنسی علم کی طاقت پر آگے بڑھے تھے۔ اس غلط تشخیص نے مغرب کے خلاف مسلمانوں کی پوری اسٹریجی کو غلط کر دیا ہے۔

۹ جون ۱۹۹۱

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : شر الناس العلماء اذا فسدوا (لوگوں میں سب سے زیادہ برے علما ہیں جب کہ ان میں بگاڑ آجائے)

علما کا بگاڑ یہ ہے کہ ان کے پاس دین کا علم تو ہو مگر اللہ کا ڈر ان کے دلوں سے نکل جائے۔ ایسے لوگ بلاشبہ زمین کی سب سے بڑی مخلوق ہیں۔ متقی عالم اہل زمین کے لئے ایک رحمت ہے، اور بے خوف عالم اہل زمین کے لئے ایک مصیبت۔

۱۰ جون ۱۹۹۱

خلیفہ چہارم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اہل عراق کے بارہ میں فرمایا تھا کہ وہ ہر اس

آدمی کے پیرو بن جاتے ہیں جو زور سے بولنے والا ہو (اتباع کل ناعق)

یہ بات موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر مزید اضافہ کے ساتھ صادق آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصل کمزوری ہی یہی ہے کہ وہ بڑے بڑے الفاظ بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ سنجیدہ اور ٹھوس پیغام دینے والا آدمی ان کے درمیان تنہا ہو کر رہ جاتا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہے جس کی بنا پر کوئی حقیقی قیادت ان کے درمیان ابھر نہ سکی۔ آج جھوٹے لیڈروں کی بھرمار ہے، مگر سچے لیڈر کا کہیں پتہ نہیں۔ کیوں کہ لیڈر عوام کا ساتھ دینے سے بنتا ہے، اور جب سچے لوگوں کو ساتھی نہ ملیں تو وہ لیڈر کیسے بن سکتے ہیں۔

۱۱ جون ۱۹۹۱

مولانا ممتاز احمد قاسمی (مسجد بالو گنج، شملہ) اور مولانا عبدالسبحان خاں (نالہ گڈھ، ہماچل پردیش) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم پابندی سے الرسالہ پڑھتے ہیں اور ہم کو آپ کے نظریہ سے پورا اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا کہ صبر اور اعراض کی پالیسی ہر قسم کے فسادات کے خلاف یقینی چیک ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے کئی تجربات بتائے کہ کس طرح انھوں نے ٹکراؤ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور فساد ختم ہو گیا۔

مثلاً مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک ہندو ٹرک ڈرائیور نے ایک مسلمان کو مارا۔ اس کا پیسہ چھین لیا اور اس کے بعد ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ خبر پھیلی تو مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا۔ اگر مسلمان جوابی کارروائی کرتے تو یقیناً ہندو مسلم فساد ہو جاتا۔ میں نے مسلمانوں کو روکا۔ اس کے بعد میں پولیس اسٹیشن گیا اور ایس ایچ او سے ملا۔ میں نے ہندو اور مسلم کی بات نہیں کی، صرف واقعہ بتایا۔ ایس ایچ او نے کہا کہ ٹرک کا نمبر آپ کے پاس ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔

چیک پوسٹ پر ہر گزرنے والے ٹرک کا نمبر نوٹ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایس ایچ او نے فوراً چیک پوسٹ سے ٹرک کا نمبر معلوم کیا۔ اس کے بعد اگلے پولیس اسٹیشن پر ٹیلیفون کر کے چار گھنٹہ کے اندر ٹرک کو پکڑ لیا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور کو سزا دی اور اس سے پوری رقم وصول کر کے مسلمان کے حوالے کی۔ اس کے بعد وہ اس پر کیس بھی کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔

اب ہمیں اور کسی کارروائی کی ضرورت نہیں۔

۱۲ جون ۱۹۹۱

مشہور سعودی پرچہ" المجلة " کا شمارہ ۱۵-۲۱ ذوالقعدہ ۱۴۱۱ھ (۲۹ مئی-۴ جون ۱۹۹۱ء) میرے سامنے ہے، اس کے صفحہ ۹۰ پر ایک مضمون ہے جس میں عبد الرحمٰن الکواکبی (۱۹۰۲-۱۸۴۹ء) کا قول نقل کیا گیا ہے کہ امت مسلمہ کی مصیبت دراصل اس کے اوپر غیر قوموں کا سیاسی قبضہ ہے (ان بلاء هذه الامة هو التسلط السياسى)

مگر یہ قبضہ اصلاً بلا نہیں، وہ اصل بلا کا نتیجہ ہے۔ اصل بلا خود مسلمانوں کا تنزل ہے۔ موجودہ مسلمان ایک زوال یافتہ قوم ہیں۔ اور زوال یافتہ قوم کا انجام وہی ہوتا ہے جو موجودہ مسلمانوں کا ہورہا ہے۔

۱۳ جون ۱۹۹۱

المجلہ کے مذکورہ شمارہ میں ایک مضمون صدام حسین کے مسئلہ پر ہے۔ سعودی مضمون نگار هالة حمد المعجل کے نزدیک جس شخص نے عراقی حکمراں صدام حسین کے کویت پر قبضہ کی حمایت کی۔ وہ خود بھی حقیقت کی نظر میں ظالم اور غاصب بن گیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مجھ کو تو صرف ایک حقیقت معلوم ہے۔ وہ یہ کہ جب میں کسی مجرم کی کارروائیوں کی تائید کروں تو خواہ میرے پاس کتنا ہی عذر رہو، میں خود بھی مجرم ہوں (انى افهم حقيقة واحدة فقط. انى عندما أؤيد مجرما فى تصرفاته مهما كانت تبريراتى فانا مجرمة ايضاً)

اس عبارت میں مجھ کو صرف " ایضاً " سے اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے معاملات میں آدمی خود ہی مجرم ہوتا ہے نہ کہ خود بھی مجرم۔

۱۴ جون ۱۹۹۱

سعودی عرب کے ایک پرچہ میں جو اڈیٹوریل (كلمة الى القارى) چھپا ہے، اس کا عنوان خلاف توقع طور پر یہ ہے: کلنا خطاؤون (ہم سب غلط کار ہیں) مضمون میں عربوں کی عدم اتحادی پر ملامت کی گئی ہے۔ اور یورپ کے کئی ملکوں کا نام لے کر بتایا گیا ہے کہ وہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، آج سب کے سب اپنے کل کے دشمن

کے حلیف ہیں (وجمیعھا الیوم حلیف لعدو الامس)

یہ ایک نیا ظاہرہ ہے جو خلیج کے بطن سے نکلا ہے۔ خلیج کے المیہ سے پہلے عرب پرچے صرف خارجی سازشوں کا انکشاف کرتے تھے۔ اب وہ داخلی احتساب کو بھی کام سمجھتے ہیں۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔

۱۵ جون ۱۹۹۱

بعد کے دور میں جو فقہی مذاہب بنے، ان میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کے علماء کا کہنا ہے کہ انھیں کا فقہی مسلک صحیح ہے اور دوسرے مسالک غلط ہیں۔ تاہم چوں کہ حدیث کی کتابوں میں ہر قسم کی روایتیں ہیں۔ کسی روایت سے ایک مسلک کی تائید ہوتی ہے اور کسی روایت سے دوسرے مسلک کی۔ اس لئے ان میں سے کوئی مسلک کامل یقین کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اس نزاکت کی بنا پر ایک فقیہہ نے فقہاء کی پوزیشن کو ان بامعنی الفاظ میں ادا کیا ہے:

مذھبنا صواب یحتمل الخطاء ومذھب غیرنا خطاء یحتمل الصواب (ہمارا فقہی مذہب درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور دوسرے کا فقہی مذہب نادرست ہے احتمال صحت کے ساتھ)۔

یہ تطبیق دین یسر کو دین عسر بنانا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسالک کا اختلاف تنوع کی بنا پر ہے نہ کہ اس بنا پر کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط۔

۱۶ جون ۱۹۹۱

ظفر علی خاں بی اے ۸ جنوری ۱۸۷۲ کو پیدا ہوئے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو کرم آباد (پنجاب) میں ان کی وفات ہوئی۔ انھیں انگریزوں سے سخت نفرت اور دشمنی تھی۔ وہ زندگی بھر نظم و نثر میں اس کا اظہار کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ میں "خلافت" کے مسئلہ پر ایک مضمون میں انھوں نے لکھا:

"یہ وقت خاموشی کا نہیں بلکہ گنبد فلک میں غلغلہ ڈالنے کا ہے، خواہ غلغلہ برپا کرنے کے لئے اسرافیل سے صور ہی کیوں نہ مستعار لینا پڑے۔"

ظفر علی خاں نے مجموعی طور پر تقریباً چودہ سال جیل میں گزارے۔ ۱۹۳۳ میں وہ ایک ماہ

کی سزا کے لئے سنٹرل جیل لے جائے گئے، تو تن کر دروازہ ہی پر کھڑے ہو گئے۔ اور تحکمانہ لہجہ میں کہا کہ بڑا دروازہ کھولو۔ میں سر جھکا کر چھوٹے دروازہ سے اندر نہیں جاؤں گا۔ یہ سر صرف اللہ کے سامنے ہی جھکتا ہے (قومی آواز، ۱۶ جون ۱۹۹۱)

اس قسم کی باتوں کا تعلق اسلام سے تو کیا ہوگا، ان کا تعلق عقل سے بھی نہیں ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے اکثر لیڈر اسی قسم کی بے معنی باتوں میں مشغول رہے۔

۱۷ جون ۱۹۹۱

ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسلمان مسلسل غیر قوموں کے ظلم کا شکار ہیں۔ ۱۸۵۷ میں مغل سلطنت انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد روسی ترکستان کا عظیم علاقہ (تاجکستان، ازبکستان، سمرقند، بخارا) کیمونسٹ ملحدوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں یہودی حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۹۴۷ میں اور پھر ۱۹۷۱ میں برصغیر ہند کے مسلمان تین ٹکڑوں میں بٹ کر بے قیمت ہو گئے۔ ۱۹۹۱ کی جنگ خلیج میں عرب ممالک براہ راست یا بالواسطہ طور پر برباد ہو گئے، وغیرہ۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ مسلمان عتاب الٰہی کی زد میں ہیں۔ یہ عتاب اس کے باوجود ہے کہ اس ڈیڑھ سو سالہ مدت میں مسلمانوں کے اندر بہت بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ بہت بڑی بڑی جماعتیں بنیں۔ بہت بڑے بڑے ادارے قائم ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلم شخصیتوں اور تمام مسلم تحریکوں کو رد کر دیا۔

۱۸ جون ۱۹۹۱

الرسالہ ستمبر ۱۹۹۱ کا شمارہ ان شاء اللہ "عظمت صحابہ" نمبر ہوگا۔ اس پرچہ کے سرورق کے لئے آج میں نے حسب ذیل مضمون لکھ کر دیا: لوگ تاریخ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اصحاب رسول کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے عمل سے انسانیت کی نئی تاریخ بنائی۔

۱۹ جون ۱۹۹۱

آنکھ کا ایک ڈاکٹر جب عینک کا نمبر دینے کے لئے کسی کی آنکھ ٹسٹ کرتا ہے تو وہ ایک کے بعد ایک شیشہ آنکھ پر رکھ کر پوچھتا ہے کہ وہ ٹھیک تھا یا یہ ٹھیک ہے۔ مجھے ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے اچھے اور برے احوال آتے ہیں۔ آدمی کسی سے مطمئن ہوتا ہے اور کسی سے غیر مطمئن۔ مگر ہر بات کا آخری فیصلہ آخرت میں ہونے والا ہے۔ اور اخروی انجام کے اعتبار سے ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا ٹھیک ہے اور کون سا بے ٹھیک۔

یہاں کامیابی کے احساس سے دوچار ہونا اچھا ہے یا ناکامی کے احساس سے دوچار ہونا۔ لوگوں کے درمیان مقبول ہونا اچھا ہے یا لوگوں کے درمیان نامقبول اور غیر معروف بن جانا۔ احساس محرومی میں تڑپنا اچھا ہے یا احساس یافت میں مگن ہونا۔ تعریف کرنے والوں کی تعریف سننا اچھا ہے یا تنقید کرنے والوں کی تنقید کا نشانہ بننا۔ معاملات کا درست ہونا اچھا ہے یا معاملات کا بگڑ جانا۔ غم کی نفسیات میں جینا اچھا ہے یا مسرت کی نفسیات میں جینا۔

آخرت سے پہلے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون جنت والا ہے اور کون جہنم والا۔ اسی طرح شاید آخرت سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون سی چیز ٹھیک تھی اور کون سی چیز بے ٹھیک۔

۲۰ جون ۱۹۹۱

ایک عربی پرچہ میں ایک فلسطینی کا مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: الجهاد هو الحل الوحيد (جہاد ہی واحد حل ہے) اس میں دکھایا گیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو جو مسائل در پیش ہیں، اس کا واحد حل جہاد ہے۔

اس طرح کی بات اکثر مسلمان کہتے ہیں۔ مگر یہ بے شعوری کی بات ہے۔ یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ جہاد نہیں ہو رہا ہے۔ حالاں کہ سو سال سے بھی زیادہ مدت سے جہاد ہی تو ہو رہا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس نام نہاد جہاد کا کوئی نتیجہ اب تک برآمد نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ فقدانِ نتیجہ، جہاد کو لوگ نقدان جہاد کے ہم معنی سمجھ رہے ہیں۔

۲۱ جون ۱۹۹۱

ایک نوجوان نے کہا کہ میں لکھنا (مضمون نگاری) سیکھنا چاہتا ہوں۔ بتائیے کہ اس کا طریقہ

کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ـــــ لکھنے سے لکھنا آتا ہے۔

میں نے کہا کہ لکھنا ایک مشکل ترین آرٹ ہے۔ اگر کوئی شخص لکھنے والا بننا چاہتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ بہت زیادہ پڑھے اور بہت زیادہ مشق کرے۔ اس کے بعد اس کو اپنے آپ لکھنا آجائے گا۔

۲۲ جون ۱۹۹۱

آج میں آل انڈیا ریڈیو (اردو سروس) میں "عید اضحیٰ" پر ایک تقریر ریکارڈ کرانے کے لئے گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات مسٹر سجاد رضوی سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں دہلی سے بجنور (چاندپور) کی بس پر سفر کر رہا تھا۔ یہ کئی گھنٹے کا سفر تھا۔ میرے پیچھے کی سیٹ پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں الرسالہ کا کوئی شمارہ تھا۔ پورے راستہ میں الرسالہ کے موضوع پر بات کرتے رہے۔

اس طرح کے واقعات اکثر لوگ بتاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ اب عمومی بحث مباحثہ کا موضوع بن گیا ہے۔ جہاں چند پڑھے لکھے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ وہاں الرسالہ زیر بحث آجاتا ہے، خواہ مخالفت میں یا موافقت میں۔ یہ بلاشبہ الرسالہ مشن کی کامیابی کی ایک علامت ہے۔

۲۳ جون ۱۹۹۱

اصحاب رسول مکہ چھوڑ کر مدینہ گئے۔ اس ہجرت سے ان کے اندر اخلاقی بگاڑ نہیں آیا۔ اور نہ مدینہ کی سوسائٹی میں کوئی کرپشن پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان کے بہت سے مسلمان پاکستان گئے۔ یہ مسلمان ہندستان میں اچھی اخلاقی حالت پر تھے۔ مگر پاکستان پہنچ کر ان کے اندر زبردست اخلاقی بگاڑ آگیا۔ حتی کہ پاکستان کی سوسائٹی بالکل کرپٹ ہو کر رہ گئی۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اصحاب رسول میں جو اخلاق تھا، وہ عقیدہ کے زور پر تھا، اس لئے وہ جس طرح مکہ میں تھا، اسی طرح وہ مدینہ میں بھی باقی رہا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اخلاق روایات کے زور پر تھا، ہندستان کو چھوڑ کر پاکستان جانے کے نتیجہ میں یہ روایات ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد ان کے اندر اخلاقی بنیاد بھی ختم ہو گئی۔

۲۴ جون ۱۹۹۱

جب کوئی شخص الرسالہ سے اپنے تاثر کا اظہار کرتا ہے تو اکثر میں اس سے پوچھتا ہوں کہ الرسالہ سے آپ کو ذاتی سبق کیا ملا۔ فاروق فیصل صاحب (بمبئی) سے میں نے یہی سوال کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ واقعے بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ الرسالہ فروری ۱۹۹۱ میں میں نے وہ مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے: "شیر دیکھ رہا ہے"۔ اس کو پڑھ کر میری عجیب حالت ہوگئی۔ اس کو پڑھ کر میں مسجد میں نماز کے لئے گیا۔ امام صاحب نے سورہ الحشر کا آخری رکوع پڑھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے خدا کی نگاہیں مجھ کو دیکھ رہی ہیں۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں گر پڑوں گا۔

۲۵ جون ۱۹۹۱

بمبئی کے ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب "پیغمبر انقلاب" پڑھی۔ مجھ کو یہ کتاب بہت پسند آئی۔ میں نے پوچھا کہ اس کتاب میں آپ کو کیا ملا۔ انھوں نے کہا: اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک نئے محمد سے روشناس ہو رہا ہوں۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ "پیغمبر انقلاب" مجھ کو اتنی پسند آئی کہ اس کو میں نے اپنے یہاں کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ ہر ہفتہ جمعہ کے دن اس کا ایک حصہ سناتا۔ اس کام میں مجھ کو ایک سال لگ گیا۔ آخر کار میں نے پوری کتاب سنا دی۔

۲۶ جون ۱۹۹۱

محمد افسر الدین فاروقی (رتلام) ریلوے میں چیف ٹرین کنٹرولر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ کلمہ گو کے لئے نجات ہے۔ مگر غیر مسلمین خواہ کتنے اچھے اخلاق کے ہوں، انھوں نے چوں کہ کلمہ نہیں پڑھا، اس لئے وہ جہنم میں جائیں گے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

میں نے کہا کہ غیر مسلمین کے لئے اصول یہ ہے کہ ـــــ جیسا علم ویسا مواخذہ۔ یعنی جو شخص دین خداوندی سے جتنا مطلع ہوا ہوگا، اسی کے بقدر اس کا حساب لیا جائے گا۔

اور یہ اللہ کو معلوم ہے کہ کس کو کتنی اطلاع پہنچی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، یہ بات غلط ہے کہ کلمہ گوئی پر نجات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نجات اخلاص پر ہے نہ کہ تلفظ کلمہ پر۔ ایک شخص کلمہ پڑھ کر مسلم برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں تک اخروی نجات کا تعلق ہے، اس کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے اندر اخلاص تھا یا نہیں تھا۔

۲۷ جون ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ اقبال کو تمام مسلمان اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ آپ اقبال پر تنقید کرکے خوامخواہ تمام لوگوں کو ناراض کر رہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اس قسم کی دل آزار تنقیدوں سے گریز کریں۔ میں نے کہا کہ اقبال پر تنقید اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں نے ان کو اتھارٹی کا درجہ دے دیا ہے۔ جب تک مسلمان اقبال کے بجائے قرآن وسنت کو اتھارٹی نہ بنائیں، ان کا عمل صحیح رخ پر جاری ہونے والا نہیں۔

میں نے کہا کہ اقبال نے مسلمانوں کو جو پیغام دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے اس لئے تم اس سے لڑ کر اس کو اپنا موافق بناؤ:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اسی رہنمائی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان بے فائدہ طور پر اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑنے بھڑنے میں مصروف ہیں۔ مگر یہ سراسر غلط رہنمائی ہے۔ قرآن میں اس کے برعکس یہ بتایا گیا ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی کوتاہیوں کو بھگتتا ہے (الشوریٰ ۳۰) ایسی حالت میں مسلمانوں سے کہنے کی بات یہ تھی کہ زمانہ اگر تم کو تسلیم نہیں کر رہا ہے تو اس کی وجہ خود تمہاری کمی ہوگی۔ اپنی کمیوں کو جان کر اس کی تلافی کی جدوجہد میں لگ جاؤ۔ جب تم اپنی کمیوں کی تلافی کر لوگے تو قانون قدرت کے تحت دنیا مجبور ہو جائے گی کہ وہ تمہارا اعتراف کرلے۔

۲۸ جون ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ یہ دور کتاب کا نہیں، خطاب کا ہے۔ آپ کو الرسالہ کے بجائے آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ اپنا مشن پھیلانا چاہئے۔ دیکھئے آیت اللہ خمینی نے

کیسٹوں کے ذریعہ ایران میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ کارل مارکس نے خمینی سے بڑا انقلاب برپا کیا اور اس نے اور اس کے حامیوں نے اپنا سارا کام کتابوں کے ذریعہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ یہ قرآن میں ہے کہ اللہ نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی (علّم بالقلم)، ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کے تمام بیانات ابدی ہیں۔ اس لئے قلم کے ذریعہ کی فوقیت بھی ابدی ہونا چاہئے۔

یہ صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ نے خطاب کو کتاب کے اوپر فائق کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا مقام اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ البتہ دونوں کے حق میں نئے نئے ذرائع وجود میں آ گئے ہیں۔ مثلاً کتاب کے حق میں پرنٹنگ پریس، اور خطاب کے حق میں کیسٹ وغیرہ۔ یہ اضافۂ ذرائع کا معاملہ ہے نہ کہ تبدیلی زمانہ کا معاملہ۔

۲۹ جون ۱۹۹۱

پاکستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو وجود میں آیا۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو اسلامی قرارداد مقاصد منظور ہوئی۔ ۱۹۵۶ میں دستوری طور پر اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۹ میں جنرل ضیاء الحق نے شریعت بنچ مقرر کی۔ ۱۹۸۰ میں وفاقی عدالت قائم ہوئی۔ اب طویل ہنگامہ کے بعد ۱۶ مئی ۱۹۹۱ کو پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے شریعت بل منظور کر لیا۔ یہ اسلامی قانون کے نفاذ کی طرف پاکستان کے ۴۵ سالہ سفر کا خلاصہ ہے۔

مگر میرے نزدیک یہ تمام "فتوحات" محض نادانی کے قصے ہیں۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اتنا ہی بے معنی ہے جتنا پانچ سال کے لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر کے انھیں ازدواجی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا۔ پاکستان کا معاشرہ دنیا کا سب سے زیادہ بگڑا ہوا معاشرہ ہے۔ وہاں پہلا ضروری کام افراد اور معاشرہ کی اصلاح تھا جو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک کسی بھی درجہ میں نہیں کیا گیا۔ بلکہ "اسلامی قانون نافذ کرو" کی مہم کے دوران جس طرح روایات توڑی گئیں، اس نے معاشرہ کو بد سے بدتر حالت تک پہنچا دیا۔ ایسی حالت میں جو لوگ اسلامی قانون کے نفاذ کی مہم چلا رہے ہیں وہ یا تو علم سے خالی ہیں یا سنجیدگی سے خالی۔

۳۰ جون ۱۹۹۱

اسلام میں زنا کا جرم عین ارتکاب کے وقت چار گواہوں کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے کہا: پھر یہ مجرم کے جرم کی سزا تو نہ ہوئی بلکہ اس کی حماقت کی سزا ہوئی کہ چار آدمیوں نے اس کو اس جرم کی حالت میں دیکھ لیا۔

یہ تبصرہ بجائے خود حماقت ہے۔ جرائم کے ثبوت کے لئے گواہی کا اصول ایک عام اصول ہے جو تمام قانونی نظاموں میں پایا جاتا ہے۔ اسلامی قانون میں زنا کے لئے چار گواہ کی شرط سزا کی سختی کی بنا پر ہے۔ چار گواہ کا اصول اسی لئے ہے تاکہ جج کسی شخص کو یہ سخت سزا صرف اس وقت دے جب کہ قطعی دلائل سے اس کا وقوع ثابت ہو جائے۔ اور سخت سزا کا اصول اس لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ معاشرہ میں اس کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایک مجرم کی بھیانک سزا کو دیکھ کر دوسرے لوگ اس کا ارتکاب کرنے سے باز رہیں۔

یکم جولائی ۱۹۹۱

آج نصف شب میں طرابلس سے ٹیلیفون آیا۔ محمد سلیمان القائد اور دوسرے عرب نوجوانوں نے بات کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد سلیمان القائد انشاء اللہ ہمارے اس مشن کے لئے لینن ثابت ہوں گے۔ ان کے اندر زبردست تنظیمی صلاحیت ہے۔ انھوں نے سیکڑوں عرب نوجوانوں کو نہایت گہرے طور پر اس مشن کا حامی بنا یا ہے۔ قاہرہ میں اشاعتی ادارہ کھول دیا ہے۔ اور دوسرے بہت سے کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

۲ جولائی ۱۹۹۱

قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا تو فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض و نفرت ہے۔ ان کے بارہ میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں۔ اس لئے مفتی کفایت اللہ صاحب سے فتویٰ لے لیا جائے۔ (قومی آواز، یکم جولائی ۱۹۹۱)

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مولانا محمد علی کی تعریف میں لکھا ہے کہ انھوں نے تحریک خلافت اور آزادیٔ وطن کے ساتھ تحریک موالات کو ضم کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف

نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکا دی (قومی آواز ۲ جولائی ۱۹۹۱)

موجودہ زمانہ کے اکابر کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ انھیں انگریزوں سے شدید نفرت تھی اور پوری قوم کو انھوں نے انگریزوں کے خلاف متنفر کر دیا۔ مگر یہ بات قابل تعریف نہیں بلکہ قابل مذمت ہے۔ یہ بات اتنی غلط ہے کہ یہ تمام اکابر مجھے اصاغر نظر آنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کے لئے مدعو کا درجہ رکھتا تھا، انگریزوں کے بارہ میں ان کے دل میں محبت اور شفقت ہونی چاہئے تھی تاکہ وہ اس کے سامنے دین رحمت کا پیغام پیش کر سکیں۔ آخر وہ ان سے نفرت کیوں کرنے لگے۔

۳ جولائی ۱۹۹۱

آیت اللہ خمینی کے انتقال کے بعد ایران میں دو دھارے ہو گئے ہیں۔ ایک کو "روحانی" کہا جاتا ہے۔ اس میں علماء اور مذہبی افراد شامل ہیں جو اپنے آپ کو امام خمینی کا فکری وارث بتاتے ہیں۔ اس کے لیڈر احمد خمینی ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کو ایران کی اصطلاح میں "بازاری" کہا جاتا ہے کہ اس کے رہنما علی اکبر رفسنجانی ہیں۔

نوائے وقت (۱۹ جون ۱۹۹۱) میں ایک سفرنامہ کے تحت میں نے اس کو پڑھا تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ کیوں کہ "بازاری" کا لفظ اردو زبان میں بہت برے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر سفرنامہ میں آگے بتایا گیا تھا کہ ایران میں بازاری سے مراد ٹریڈر کلاس ہوتا ہے۔ یہ لوگ کاروبار کرتے ہیں اور ایران کو صنعت و تجارت میں ترقی دینے پر زور دیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کو بازاری طبقہ یعنی تاجر طبقہ کہا جاتا ہے۔

۴ جولائی ۱۹۹۱

رحمٰن نیر صاحب نے بتایا کہ آجکل کے حالات اتنے خراب ہیں کہ کسی بھی شخص پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ کسی سے ہاتھ ملاؤ تو اس کے بعد یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ہیں یا نہیں۔ سننے والے صاحب نے کہا کہ آپ انگلیاں گننے کی بات کرتے ہیں، ہم تو ہاتھ ہی نہیں ملاتے۔

موجودہ سماج میں خود غرضی اور بدعنوانی اتنا زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اب کسی کو دوسرے

کے اوپر اعتماد نہیں۔ کوئی شخص اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں۔ میں اکثر اپنے دل میں کہا کرتا ہوں کہ ——— اپنے بس میں صرف صبر ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب دوسرے کے اختیار میں ہے۔

۵ جولائی ۱۹۹۱

انگریزی زبان کی ایک مشہور مثل ہے کہ ——— ایک صاحب تحمل آدمی کے غضب سے خبردار رہو:

Beware of the wrath of a man of patience.

اس کا ایک سادہ مطلب یہ ہے کہ صبر و تحمل والے آدمی کا جب صبر ٹوٹتا ہے اور وہ غیظ و غضب میں آتا ہے تو وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔ مگر دوسرا زیادہ گہرا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر تحمل کا مزاج ہو وہ اپنے حریف کو منصوبہ بند انداز میں مارتا ہے۔ اور جو آدمی منصوبہ بند انداز میں عمل کرے، اس کے عمل کا توڑ ممکن نہیں ہوتا۔

۶ جولائی ۱۹۹۱

اخبار قومی آواز (۶ جولائی ۱۹۹۱) میں نئی دہلی کی ایک خبر چھپی ہے۔ اس کے مطابق،

"اپنے شوہر سے علٰحدگی اختیار کرنے والی ایک مسلم خاتون کو عدالت کے حکم پر ۲۷ ہزار روپیہ بطور نان نفقہ (متاع) ادا کیا گیا۔ یہ رقم عدالتی فرمان سے وصول کی گئی۔ ۲۴ سالہ فرزانہ کا نکاح ۱۹۸۶ میں ہوا تھا اور اس نے اپنے سسرال والوں کی طرف سے ستائے جانے کی بنا پر ۳۱ مئی ۱۹۹۱ کو قانونی طور پر طلاق لے لی تھی۔ نان نفقہ وصول کرنے میں ایک رضاکار تنظیم نے اس خاتون کو قانونی امداد فراہم کی۔"

یہ ایک غریب خاندان کا واقعہ ہے۔ اگر سابقہ قانون کے مطابق، عورت کو اپنے سابقہ شوہر سے ماہانہ نفقہ دلایا جاتا تو بمشکل اس کی مقدار ۸۰ روپیہ ماہوار ہوتی۔ مگر نئے ایکٹ کے مطابق، اس نے اپنے سابقہ شوہر سے بیک وقت ۲۷ ہزار روپیہ کی رقم حاصل کر لی۔ گویا نئے مسلم ایکٹ سے جو فرق پڑا ہے وہ صرف یہ کہ عورت جو رقم ماہانہ قسطوں کی صورت میں ۲۷ سال میں وصول کرتی اس کو اس نے پہلے ہی دن اکٹھے وصول کر لیا۔ یہ ہے

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کارنامہ کی حقیقت۔

۷ جولائی ۱۹۹۱

رحمٰن نیر صاحب (پیدائش ۱۹۳۹) نے بتایا کہ وہ نومبر ۱۹۸۳ میں حج کے لئے گئے۔ واپسی میں مکہ سے جدہ آتے ہوئے ان کی ایک اٹیچی کیس چھوٹ گئی۔ تلاش کے باوجود نہیں ملی تو وہ یہ کہہ کر جہاز میں سوار ہو گئے کہ "حاجی کا سامان گم نہیں ہوتا"۔

اٹیچی پر اسٹکر لگا ہوا تھا جس پر ان کا دہلی کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر درج تھا۔ دہلی واپسی کے دو ہفتہ بعد انھیں سعودی ایئر لائنز کا ٹیلیفون ملا کہ آپ کی اٹیچی لاکر ہم نے دہلی ایئر پورٹ پر چھوڑ دی ہے۔ وہاں جاکر لے لیں۔ رحمٰن نیر صاحب دہلی ایئر پورٹ گئے۔ اپنی اٹیچی حاصل کر کے کسٹم پر آئے۔ کسٹم کے آدمی نے اٹیچی کھلوائی۔ اس میں سب سے اوپر سفید ٹیری کاٹ کا ایک تھان رکھا ہوا تھا۔ اس نے تھان فوراً اٹھایا اور کہا کہ یہ کیا ہے۔ رحمٰن نیر صاحب نے کہا کہ یہ "کفن" ہے۔ کفن کا لفظ سنتے ہی اس نے کہا کہ بند کرو، بند کرو۔ اور انھیں چھوڑ دیا۔ یہ کپڑا انھوں نے مکہ میں خرید کر اس کو زمزم سے تر کر کے سکھایا تھا کہ وہ بطور کفن استعمال ہوگا۔

کسٹم افسر نے دیکھا کہ کلرک نے رحمٰن نیر صاحب کو فوراً چھوڑ دیا تو اس نے سمجھا کہ شاید اس نے کچھ لین دین کر لیا۔ چنانچہ وہ خود اٹھ کر آگیا۔ اور دوبارہ اٹیچی کھلوائی۔ اس نے تھان کو اٹھا کر پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ رحمٰن نیر صاحب نے دوبارہ کہا کہ کفن۔ کسٹم افسر نے بھی "کفن" کا نام سن کر کہا کہ جاؤ، جاؤ۔

۸ جولائی ۱۹۹۱

بہادر شاہ ثانی ظفر (۱۷۷۵ - ۱۸۶۲)، ہندستان کی مغل سلطنت کے آخری تاجدار تھے۔ ان کے زمانہ میں مغل سلطنت سمٹ کر صرف دہلی بلکہ لال قلعہ کی دیواروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ خود بہادر شاہ ظفر کو اس کا احساس ہو چکا تھا کہ اب ہندستان میں مغل دور ختم ہو چکا، اب یہاں برٹش دور کا آغاز ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا:

اے ظفر اب ہے تجھی تک اہتمام سلطنت　　بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

مگر مغل رانیاں اور مغل شہزادے جو محلوں کے اندر رہتے تھے، اب بھی اس حقیقت سے بے خبر

تھے۔ چنانچہ محل کے اندر یہ جنگ شدت سے جاری تھی کہ بہادر شاہ کا ولی عہد کون ہو۔ آخر کار اپنی تیسری بیوی زینت محل کے اصرار پر بہادر شاہ ظفر نے اس کے لڑکے جواں بخت کو اپنا ولی عہد بنانے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان ۱۸۵۳ میں کیا گیا، جب کہ چند سال بعد ۱۸۵۷ میں جواں بخت سمیت پورا شاہی خاندان رنگون بھیجا جانے والا تھا تاکہ جلاوطنی کی زندگی گزار کر مر جائیں۔

۹ جولائی ۱۹۹۱

۱۸۴۶ میں دہلی سے اردو اخبار نکالا گیا تو اس کا نام "احسن الاخبار" رکھا گیا۔ جب کہ اسی زمانہ میں دہلی سے نکلنے والے انگریزی اخبار کا نام دہلی گزٹ تھا۔ اس سے دونوں زبانوں کے ذوق کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

'اردو قوم' صحافت کے میدان میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے اخبار کے لئے 'احسن الاخبار' کا نام پسند کیا۔ دوسری طرف 'انگریزی قوم' نے سادہ طور پر اپنے اخبار کا نام صرف "دہلی گزٹ" رکھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی صحافتی تاریخ میں اردو والے ایک بھی ایسا اخبار نہ نکال سکے جو حقیقی معنوں میں احسن الاخبار ہو۔ جب کہ انگریزی والوں نے متعدد اعلیٰ اخبار نکالے مگر کبھی انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے اخبار کا نام احسن الاخبار رکھ دیں۔

۱۰ جولائی ۱۹۹۱

عبدالمنان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ابتداءً کتابت کا کام سیکھا۔ ایک عرصہ تک وہ کتابت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے پرنٹنگ پریس لگا لیا۔ مگر وہ پرنٹنگ پریس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب دوبارہ وہ کتابت کا کام کر رہے ہیں۔ وہ بڑے بڑے اداروں اور حکومتی شعبوں سے کتابت کے کام کا ٹھیکہ لیتے ہیں اور پندرہ کاتبوں سے لکھواتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس طرح وہ ماہانہ دس ہزار سے بارہ ہزار روپیہ تک کما لیتے ہیں۔

اسی دوران انھوں نے اپنا ایک اخبار نکالا جو چھ ماہ جاری رہ کر حال میں بند ہو گیا۔

انھوں نے بتایا کہ ہماری جنگ حکومت سے تھی۔ ہم اپنے اخبار میں مسلسل یہ لکھ رہے تھے کہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی کو دور کرے۔

میں نے کہا کہ آپ نے اخبار کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ بات کیوں نہیں بتائی کہ اس ملک میں ایک شخص اردو کتابت جیسے کام سے بارہ ہزار روپیہ مہینہ کما سکتا ہے۔ اس لئے یہاں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص محنت کے ذریعہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس کا انھوں نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔

۱۱ جولائی ۱۹۹۱

"الربانیہ" کی کتابت مکمل ہو چکی ہے۔ جلد ہی ان شاءاللہ وہ چھپ جائے گی۔ اس کے ٹائٹل کی پشت کے لئے میں نے حسب ذیل مضمون لکھ کر دیا:

حقیقی انسان وہ ہے جو اپنے رب میں جینے والا انسان بن جائے۔ جس کے صبح و شام اللہ کی یادوں میں بسر ہونے لگیں۔ ایسے ہی انسان کو ربانی انسان کہا جاتا ہے۔ ربانی انسان ایک پودے کی مانند دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ پوری کائنات سے معرفت کا رزق لے کر بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل درخت بن جاتا ہے۔ تاکہ وہ دنیا میں لوگوں کو پھل اور سایہ دے، اور پھر اس کو آخرت کے باغوں میں نصب کر دیا جائے جہاں وہ ابدی طور پر جنت کی فضاؤں میں لہلہاتا رہے۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۱

عربی المجلۃ (۳ جولائی ۱۹۹۱، ۲۱ ذوالحجۃ ۱۴۱۱ھ) میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے: توزیع الثروۃ العربیۃ بین الواقع والخیال۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۷ تک سترہ سالوں کے درمیان خلیج کے ملکوں نے ۸۳ بلین ڈالر کی رقم مسلم ملکوں کو بطور امداد دی ہے۔ اس رقم کو پانے والے ممالک ہیں: اردن، یمن، شام، سوڈان، تیونس، وغیرہ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ انھیں سترہ سالوں میں امریکہ نے ساؤتھ کوریا کو دو بلین ڈالر بطور امداد دئے۔ ساؤتھ کوریا اس رقم کو استعمال کرکے پچھلے ۲۰ برس کے اندر ایک ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ مگر مسلم ممالک جہاں ۲۰ برس پہلے تھے وہیں آج بھی

پڑے ہوئے ہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق۔

۱۳ جولائی ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی داخلی پسماندگی ہے۔ مسلمان اب ریفرنس گروپ (reference group) کی حیثیت سے باقی نہیں رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اچھی باتوں میں مسلمانوں کا حوالہ دیا جاتا تھا۔ اب حالت اس کے برعکس ہے۔ جب تک یہ صورت حال ختم نہ کی جائے، مسلمانوں کا مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔ یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔

۱۴ جولائی ۱۹۹۱

قومی آواز (۱۴ جولائی ۱۹۹۱) میں مالک رام کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: "کسی بزرگ نے مالک رام سے کہا تھا کہ اگر کسی کے بیٹا نہ ہوتا ہو اور وہ اپنی بیٹی کا نام بشریٰ رکھ دے تو اس کے بعد اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کی تاویل انھوں نے سورہ یوسف کی اس آیت یا بشریٰ ھٰذا غلام سے کی۔ مالک رام کے یہاں جب تیسری بار بھی بچی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس کا نام بشریٰ رکھا۔ اس کے بعد خدا نے ان کو بیٹے دئے جن کا نام انھوں نے آفتاب اور سلمان رکھا۔"

قرآن سے اس قسم کے بہت سے اعمال نکالے گئے ہیں۔ مگر یہ قرآن کا کمتر استعمال ہے۔ قرآن کا اصل اور اعلیٰ استعمال یہ ہے کہ اس کو کتاب ہدایت کے طور پر لیا جائے، اس کو اپنی عملی زندگی کے لئے رہنما بنایا جائے۔

۱۵ جولائی ۱۹۹۱

بعد کی مسلم نسلوں پر جب زوال آیا تو انھوں نے فکر و تدبر کی صلاحیت کھو دی۔ قرآن و سنت کی اتباع کے بجائے اپنے ائمہ کا اتباع ان کا مذہب بن گیا۔ ائمہ کے اقوال عملی طور پر آیات و احادیث سے بھی زیادہ اہم بن گئے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے یہ کہہ دیا: کل نصّ خالفَ ما قاله الاصحاب فهو اما منسوخ او موؤل (ہر نص جو ہمارے اصحاب کے قول کے خلاف ہو وہ یا تو منسوخ ہے یا قابل تاویل۔)

اتنے کھلے الفاظ ہر ایک نہیں بولتا۔ مگر عملاً تمام لوگوں کا مذہب یہی ہے۔ ہر ایک نے کچھ شخصیتوں کو "اکابر" کا درجہ دے دیا ہے۔ اور جہاں ان کے اکابر کا معاملہ ہو وہ قرآن و حدیث کی کھلی دلیل کو بھی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ صرف اس دین کو جانتے ہیں جس کی تصدیق ان کے اکابر کے اقوال سے ہوتی ہو۔ جس دین کو ان کے اکابر کی تصدیق حاصل نہ ہو وہ ان کے نزدیک دین بھی نہیں۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۱

۱۹۹۱ میں ہندستان کا یہ حال ہوگیا کہ اس کے پاس بیرونی قرضوں کی قسط ادا کرنے کے لئے زرمبادلہ باقی نہیں رہا۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے مجموعی طور پر چون (54.8) ٹن سونا یورپی بینکوں کے ہاتھ فروخت کرکے ڈالر حاصل کئے۔ ۲۰ ٹن ایک بار، اور ۳۴ ٹن ایک بار۔ اس کے علاوہ اسی دوران ہندستانی روپیہ کو تین بار devalue کیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان اقتصادی اعتبار سے کس دیوالیہ پن کے کنارے پہنچ گیا ہے۔

یہ سب حکومت کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔

۱۷ جولائی ۱۹۹۱

۱۹۹۱ کے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا نعرہ تھا: اب کی بار بھاجپا سرکار۔ اسی طرح ۱۹۷۱ میں پاکستان کے الکشن میں وہاں کی جماعت اسلامی نے پاکستانی شہروں میں اس مضمون کے پوسٹر لگائے تھے: انشاء اللہ جیتے گی، جماعت اسلامی جیتے گی۔ مگر دونوں ملکوں میں دونوں جماعتیں ناکام ہوگئیں۔

میرا اندازہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کہ مذہب کو سیاسی ووٹ ملے۔ اس لئے دونوں میں سے کسی ملک میں مذہبی جماعتیں ابھی حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ انھیں وقتی طور پر کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقی اور مستقل نوعیت کی مذہبی حکومت بننے کا امکان ابھی نہیں۔

۱۸ جولائی ۱۹۹۱

میری زندگی کی سب سے بڑی دریافت خود دریافت ہے۔ دریافت بلاشبہ سب

سے بڑی چیز ہے جو کوئی شخص اپنی زندگی میں پاتا ہے۔ تاہم موجودہ دنیا میں کوئی شخص مکمل دریافت تک نہیں پہنچ سکتا۔ مکمل دریافت تک پہنچنا صرف آخرت میں ممکن ہوگا۔ آخرت میں خدا کا مشاہدہ کسی انسان کے لئے سب سے بڑی دریافت ہوگی اور اسی کے ساتھ سب سے بڑی لذت بھی۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۱

سمیہ اور یاسر مکہ کے دو مسلمان تھے۔ ابوجہل نے ان کو کلمۂ شرک کہنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے نہیں کہا۔ آخر کار ابوجہل نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کو لے کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی جہاد و قتال میں حصہ لینا چاہئے اور اپنی جان کی قربانی دینا چاہئے۔

یہ ایک غلط استدلال ہے۔ حضرت سمیہ اور حضرت یاسر کی شہادت عقیدہ کی عزیمت پر ہوئی نہ کہ میدان جنگ کے قتال پر۔ عقیدہ کے معاملہ میں عزیمت اور رخصت دونوں کی اجازت ہے۔ چنانچہ مذکورہ صحابی اور صحابیہ نے عزیمت پر قائم رہتے ہوئے جان دے دی۔ مگر ان کے صاحبزادے عمار بن یاسر نے رخصت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور وقتی طور پر کلمۂ شرک بول کر اپنی جان بچالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تائید فرمائی۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کے مضامین کو پڑھ کر اکابر ملت پر اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ الرسالہ کو پڑھنے سے خدا ورسول پر اعتماد بحال ہوتا ہے یا ان پر بھی اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ اور آپ کی کتابیں پڑھنے سے تو خود میرا اعتماد اللہ اور رسول پر بحال ہوا ہے۔ مجھے از سر نو ایمان کی دولت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر الرسالہ کو پڑھنے سے خدا اور رسول پر اعتماد بحال ہو رہا ہے تو اس کے بعد کسی اور بات کی کوئی اہمیت نہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۵ جولائی ۱۹۹۱) میں مسٹر کلدیپ نائر کا مضمون چھپا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۴۷ کو انھوں نے لندن میں لارڈ ماونٹ بیٹن سے ان کے مکان پر تفصیلی ملاقات کی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ سردار پٹیل اس پر راضی تھے کہ اگر ریاست کے لوگ پاکستان سے الحاق چاہیں تو اس کو پاکستان سے ملا دیا جائے:

Sardar Patel, then Deputy Prime Minister, agreed to let Kashmir go to Pakistan if the State so wished.

مگر انھوں نے لکھا ہے کہ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ تک یہ موقع تھا کہ وہ ہندستان یا پاکستان جس سے چاہیں الحاق کرلیں۔ مگر مہاراجہ کے ذہن میں آزاد کشمیر کا تخیل تھا۔ اس لئے انھوں نے بروقت دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی الحاق نہیں کیا۔ اس سے معاملہ الجھ گیا۔

شیخ عبداللہ کی غلطی بھی یہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کا الحاق نہ انڈیا سے ہو اور نہ پاکستان سے۔ بلکہ وہ آزاد اسٹیٹ ہو تاکہ وہ اس کے پرائم منسٹر بن سکیں۔ اس راجہ اور لیڈر دونوں نے معاملہ کو بگاڑا۔ اس دنیا میں حقیقت پسندی کا طریقہ آدمی کو کامیاب کرتا ہے، اور حقیقت سے انحراف آدمی کو ناکام بنا دیتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کے لئے دو میں سے ایک چیز کا چوائس لینے کا موقع ہوتا ہے، مگر وہ تیسرا چوائس لینا چاہتا ہے۔ یہی انسان کی اکثر ناکامیوں کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۲۲ جولائی ۱۹۹۱) نے صفحہ ۲۳ پر کشمیر کے بارہ میں ایک رپورٹ چھاپی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ پاکستان کی حکومت کشمیریوں کو ہتھیار دے کر ان کے ذریعہ کشمیر میں گوریلا جنگ جاری کئے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں اس نے لکھا ہے کہ پاکستان کے اسلام پسند لوگوں کے پر زور تعاون سے یہ مسلح تحریک چل رہی ہے۔ وہ مطمئن ہیں

کہ مسلمانوں کے لئے اٹھان کی واحد جائز صورت جہاد ہے، ایک مقدس جنگ جو اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے:

(Islamic groups are) convinced that the only legitimate uprising for Muslims is jihad, a holy war based on Islamic teaching. (p. 23)

موجودہ زمانہ میں جو لوگ "اسلامی انقلاب" کے لئے اٹھے ہیں، انھوں نے دنیا کے سامنے اسلام کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ اسلامی تحریک کا واحد طریق کار مسلح جہاد ہے۔ یہ مخالفین اسلام کے اس نظریہ کی تصدیق ہے کہ "اسلام کی اصل طاقت تلوار ہے" ایسے لوگ بلاشبہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ خواہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا دوست بتاتے ہوں۔

۲۳ جولائی ۱۹۹۱

میں نے اپنی زندگی میں کئی ایسے آدمی دیکھے جو نہایت اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اونچی تعلیم بھی حاصل کی۔ مگر وہ عملی زندگی میں ناکام ہوگئے۔ وہ معمولی زندگی گزار کر مر گئے یا اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر حسرت اور افسوس میں پڑے ہوئے ہیں۔

ذاتی طور پر میرے نزدیک ان میں سے ہر شخص کا کیس اپنے بارہ میں زیادہ اندازہ (overestimation) کا کیس تھا۔ اپنی لیاقت کے مبالغہ آمیز اندازہ نے انھیں کچھ کرنے نہیں دیا۔ ہر کام جو انھیں ملا اس سے وہ موافقت نہ کر سکے۔ کیوں کہ وہ اس کو اپنی واقعی حیثیت سے کم سمجھتے تھے۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۱

کشمیر کی ایک جنگجو تنظیم کے "چیف" ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ کا مطالعہ کیا۔ اور "راہ عمل" وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس سے میں اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ جنگجوئی کا کام چھوڑ دیا اور چیف کے عہدہ سے استعفا دیدیا۔ انھوں نے کہا کہ میری جماعت کے لوگ پہلے مجھ کو اپنا سردار بنائے ہوئے تھے۔ اب میں ان سے کہتا ہوں کہ تشدد کا طریقہ چھوڑ کر پرامن تعمیری کام کرو تو وہ لوگ میرے اتنے مخالف

ہوئے کہ میرے قتل کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ میں کشمیر چھوڑ کر دہلی آگیا ہوں۔

موجودہ زمانہ میں جتنے بڑے بڑے لیڈر ہیں، ان سب کا معاملہ یہی ہے۔ انھوں نے عوامی خواہشات کا ساتھ دیا۔ اسی لئے وہ ان کے لیڈر بن گئے۔ اگر وہ عوامی خواہشات سے الگ راستہ اختیار کریں تو خود اپنی قوم کے اندر بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۱

ایک صاحب میرے شدید مخالف ہیں۔ ان کے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ ان کی ایک جوان لڑکی سیڑھی سے گر گئی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دوسری ۸ اسال کی لڑکی پر فالج کا اثر ہوا۔ وہ بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا ہے۔ خود اپنی ضرورت کو بھی بتانے سے قاصر ہے۔

میرے ایک ملاقاتی نے کہا کہ آپ کی مخالفت کی وجہ سے ان پر یہ مصیبت آئی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا خیال صحیح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید مخالف عبداللہ بن اُبی پر کوئی بلا نازل نہیں ہوئی۔ وہ اپنی طبعی موت مرا۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نیک بخت صاحبزادی حالت حمل میں اونٹ سے گر گئیں اور اس کے بعد ہمیشہ ان کی صحت خراب رہی۔ میں نے کہا کہ صحت اور بیماری الگ چیزیں ہیں۔ ان کا کسی کی موافقت اور مخالفت سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۱

نظام الدین کالونی کے لوگوں کا ایک اجتماع تھا۔ اس میں میں نے کہا کہ انسان کے اوپر اللہ تعالٰی کے بے شمار احسانات ہیں۔ ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے انسان کو عدم سے وجود بخشا اور پھر اس کے لئے یہ امکان رکھ دیا کہ وہ دنیا کی مختصر زندگی میں عمل صالح کر کے آخرت کی ابدی نعمتوں کا مستحق بن جائے۔ آخرت کی جنت ابدی عیش کا ناقابل قیاس خزانہ ہوگی۔ آدمی موجودہ مختصر سی زندگی میں اللہ کی وفاداری کا ثبوت دے کر اس عظیم خزانہ کا ہمیشہ ہمیش کے لئے مالک بن جاتا ہے۔ اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۱

۲۷ جولائی کو دوپہر کو میں ایک اجتماع میں شرکت کے لئے پٹنہ پہنچا۔ پٹنہ اس شہر کا قدیم نام ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب (وفات ۱۷۰۷) نے اس شہر کا نام اپنے پوتے عظیم کے نام پر عظیم آباد رکھا۔ حالاں کہ پٹنہ ۱۷۶۵ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں جانے والا تھا، اور خود "شہزادہ" عظیم کے لئے مقدر تھا کہ وہ تاریخ میں گم ہو جائے۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے حال کو دیکھ پاتا ہے، اور اپنے حال سے اپنے مستقبل کے بارہ میں رائے قائم کرتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل ہمیشہ قانون قدرت کے تابع ہوتا ہے نہ کہ انسان کی اپنی خواہشوں کے تابع۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۱

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ۲۵ سال باہر رہ کر واپس آئے ہیں۔ انھوں نے دہلی میں شاندار مکان بنایا ہے۔ ان کی لڑکی اچھے نمبروں سے ایم اے پاس کر چکی ہے۔ ان کا لڑکا امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے آخری مرحلہ میں ہے۔ ملاقات کے وقت وہ اس طرح بول رہے تھے جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ "میرے تو سب معاملات درست ہیں"۔ میں نے پوچھا: کیا آپ اپنے کو کامیاب انسان سمجھتے ہیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: یقیناً۔ میں جو چاہتا تھا وہ میں نے کر لیا۔ اس لئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میں ایک کامیاب انسان ہوں۔

اپنے ذوق کے مطابق، مجھے اس قسم کا احساس کامیابی پسند نہیں۔ مجھے تو وہ انسان پسند ہے جس کا احساس یہ ہو کہ میری سب بات بگڑی ہوئی ہے۔ میرا کوئی معاملہ بھی درست نہیں۔ اس احساس کے تحت وہ اپنے دل خونگار دل سے یہ کہہ اٹھے ــــ "خدایا، ایک ایسے انسان کی سب بات بنا دیجئے جو اپنی سب بات بگاڑ چکا"۔

۲۹ جولائی ۱۹۹۱

پٹنہ میں مسٹر ایم ٹی خان ایم اے نے کہا کہ مجھے آپ کے مشن سے مکمل اتفاق ہے۔ لیکن اگر آپ صرف الرسالہ نکالتے رہے اور کتابیں چھاپتے رہے اور آپ نے کوئی تنظیم یا کوئی عملی ڈھانچہ

اپنے مشن کے حق میں نہیں بنایا تو آئندہ آپ صرف ببلیو گریفی میں باقی رہیں گے۔ اس کے باہر حقیقی زندگی میں کہیں آپ کا کوئی وجود نہ ہوگا۔

مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں کہ میں ببلیو گریفی میں باقی رہتا ہوں یا اس میں بھی باقی نہیں رہتا۔ تاہم مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ الرسالہ کا مشن میرے بعد ختم ہو جائے گا۔ الرسالہ مشن در اصل قرآن کو زندہ کرنے کا مشن ہے۔ وہ مسلمانوں کو از سر نو دور رسالت والے اسلام سے جوڑنا چاہتا ہے۔ اگر الرسالہ اس میں کامیاب ہو جائے کہ کچھ باصلاحیت افراد کو حقیقی اسلام سے جوڑ دے تو میرے بعد وہ خود حرکت میں آجائیں گے۔ کیونکہ اب الرسالہ مشن ان کا اپنا مشن بن چکا ہوگا۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۱

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان ایک عاقل ہستی ہے (Man is a rational being)

مسٹر ایم ٹی خان نے کہا کہ اس کے بجائے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انسان یہ استعداد رکھتا ہے کہ وہ ایک عاقل ہستی ہو سکے :

Man is capable of being rational

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ہر آدمی جانتا ہے کہ انسان جب ضد پر اتر آئے تو وہ غیر معقول رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ مگر باعتبار استعداد یہ صرف انسان ہے جو عاقلانہ فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حتی کہ یہ بھی صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے غیر معقول رویہ کو معقول ثابت کر سکے۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۱

جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے لیڈر امان اللہ خاں نے کراچی کے اخبار جنگ کو تفصیلی انٹرویو دیا۔ اس کا ایک حصہ دہلی کے قومی آواز (۲۹ جولائی ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ اس کے مطابق، امان اللہ خاں نے کہا کہ ۱۸ ماہ کی تیاری کے بعد جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ نے پہلی بار ۳۱ جولائی ۱۹۸۸ کو سری نگر میں بم دھماکوں کے ذریعہ دہشت گردی کا آغاز کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی تنظیم کو جنرل ضیاء الحق کی پشت پناہی حاصل تھی۔ مگر ضیاء الحق

کی موت کے بعد پاکستان کی حکومت ان تنظیموں کی حمایت کرنے لگی جو پاکستان سے الحاق کی حامی تھیں۔

یکم اگست ۱۹۹۱

ایک صاحب نے دین میں استدلال کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ جس آدمی کے پاس عقیدہ ہے اس کو دلیل کی ضرورت نہیں۔ اور جو بے عقیدہ ہے وہ دلیل سے بھی ماننے والا نہیں۔ یہ بات صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلیل ہی سے عقیدہ میں جان آتی ہے۔ جو عقیدہ دلیل سے خالی ہو وہ کبھی زندہ نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف مردہ روایت ہوگی نہ کہ حقیقی معنوں میں عقیدہ۔

پہلے مرحلہ میں دلیل کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ عقیدہ کی probability کو ثابت کرتی ہے۔ اس طرح جب آدمی کو عقیدہ مل جائے تو اس کے بعد دلیل اس کو یقین کے مرحلہ تک پہنچاتی ہے۔ اور جب آدمی کو یقین حاصل ہو چکا ہو تو اس کے بعد دلیل اس کے یقین میں اضافہ کرتی ہے جس کو ازدیاد ایمان کہا جاتا ہے۔

۲ اگست ۱۹۹۱

زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جانے کہ یہاں جو کچھ ہے سب ابتلاء (آزمائش) کے لئے ہے۔ مگر موجودہ مسلم ذہنوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور ہی سرے سے حذف ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں متعدد آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے اقتدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو دیا جاتا ہے، اور وہ سراسر ابتلاء کا معاملہ ہے۔ اسی بنا پر اقتدار کبھی ایک گروہ کو دیا جاتا ہے اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ مگر مسلم ذہنوں نے حد درجہ جسارت کے ساتھ یہ نظریہ بنالیا ہے کہ ہم زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم نائبِ خدا کی حیثیت سے زمین پر خدا کا حکم نافذ کریں۔

یہی غلط فکر ہے جس کی بنا پر مسلمان اپنے لئے بے اقتداری حالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ دوسروں سے لڑ کر اقتدار کو چھینیں تاکہ زمین پر خدا کی نیابت کا منصب سنبھال سکیں۔ اس غلط نظریہ نے مسلمانوں کو ساری دنیا میں لبس

ایک قسم کا "احتجاجی گروپ" بنا دیا ہے۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھو دی ہے کہ وہ تخلیقی گروپ بن سکیں۔

۳ اگست ۱۹۹۱

۲۸ جولائی ۱۹۹۱ کو مغرب بعد ڈاکٹر عبد الحیٰ کمرشیل کامپلکس میں میری ایک تقریر تھی۔ اس میں میں نے کہا کہ جدید سائنسی انقلاب درا صل اسلام کے حق میں ایک مددگار انقلاب تھا۔ مگر اس کو غلطی سے اسلام کا مخالف سمجھ لیا گیا۔ اس سلسلہ میں مثالوں کے ذریعہ اس کی وضاحت کی۔

اجتماع میں گورنر بہار جناب شفیع قریشی صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ جس آدمی کے پاس عقیدہ ہو اس کو سائنسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اور جو آدمی نہ ماننا چاہے اس کو کوئی بھی دلیل قائل نہیں کر سکتی۔

لوگ عام طور پر عقیدہ اس کو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے زبان سے لا الٰہ الّا اللہ کہہ لیا۔ یا روایتی اور تقلیدی طور پر کچھ باتوں کو ماننے لگے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ عقیدہ ایک زندہ یقین کا نام ہے نہ کہ رسمی اقرار کا۔ یعنی فطرت میں سوئے شعور رب کو اس طرح جگانا کہ وہ کامل یقین کی صورت میں زندہ ہو جائے۔ آدمی کا شعور اور اس کی فطرت دونوں ایک دوسرے کی تصدیق بن جائیں۔

۴ اگست ۱۹۹۱

شکیل احمد صاحب (نئی دہلی) نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ابھی تک وہ زیادہ اچھا جاب حاصل نہیں کر سکے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ہندستان میں تعصب ہے، امتیاز ہے، مسلمانوں کے لئے ترقی میں رکاوٹیں ہیں۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ لوگ رکاوٹ کہتے ہیں وہ درحقیقت چیلنج ہیں۔ زندگی چیلنجوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ چیلنج ہمیشہ باقی رہیں گے۔ کیوں کہ وہ خود خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں شکایت کے بجائے مقابلہ کے ذہن کے تحت ان کا سامنا کرنا چاہئے۔

اس کی وضاحت میں میں نے کچھ واقعات بتائے۔ آخر میں وہ بات کو سمجھ گئے اور

کہاکہ آپ صحیح کہتے ہیں۔ جہاں چیلنج ہوں وہیں مواقع بھی ہوتے ہیں:

Where there are challenges there are opportunities

اس طرح کے تجربات سے میں نے سمجھا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں حقیقت موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ اس کو زندگی سے ہم آہنگ کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اگر ان کے سامنے وضاحت کر دی جائے تو ان کا علم ان کے زندہ شعور کا حصہ بن جاتا ہے اور پھر وہ صحیح راستہ کو پالیں گے۔

۵ اگست ۱۹۹۱

دنیا اور آخرت کے معاملہ کو سوچتے ہوئے بے اختیار میرے دل سے یہ دعا نکلی ــــ خدایا، پہلی پیدائش کے بعد آپ نے مجھے اپرفکٹ جنت میں داخل کیا۔ کیا دوسری پیدائش کے بعد آپ مجھے پرفکٹ جنت میں داخلہ سے محروم کر دیں گے۔

۶ اگست ۱۹۹۱

قرآن کی سورہ نمبر ۸۸ (الغاشیہ) میں ہے کہ کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح بنائے گئے (افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت) ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس کے ذریعہ انھیں تنبیہ اس لئے کی گئی کہ عربوں کے لئے غالب جانور اونٹ ہی تھے (ونبہ بذالک لان العرب غالب دوابہم کانت الابل)

یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن عربوں کے لئے اتارا گیا۔ صحیح یہ ہے کہ اونٹ کا لفظ یہاں علامتی طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ــ جانوروں کو دیکھو جس کی ایک مثال اونٹ ہے۔

۷ اگست ۱۹۹۱

بایزید البسطامی یا ابو یزید البسطامی (م ۸۷۵ء) ایران کے قصبہ بسطام کے رہنے والے تھے۔ یہاں اب بھی ان کا مقبرہ پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بایزید بسطامی کو اتباع سنت کا اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ انھوں نے اپنی ساری عمر میں کبھی خربوزہ نہیں کھایا۔ کیوں کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر خربوزہ کھایا ہے تو

کس طرح کھایا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی مشہور ہے کہ بایزید بسطامی کہا کرتے تھے : سبحانی ما اعظم شأنی (سبحان اللہ، میرا معاملہ کتنا عظیم ہے) حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس قسم کا جملہ اپنی زبان سے ادا نہیں فرمایا۔ اس کے برعکس آپ اپنے کو صرف 'عبدٌ' کہتے تھے اور روزانہ ستر بار استغفار فرماتے تھے۔ گویا ایک معاملہ میں اتباع سنت اور دوسرے معاملہ میں انحراف سنت۔

'بزرگوں' کے بارہ میں کثرت سے اس قسم کی متضاد باتیں مشہور ہیں۔ یہ باتیں اگر صحیح ہیں تو وہ بزرگوں کی حیثیت کو مشتبہ کرتی ہیں۔ اور اگر غلط ہیں تو روایت کرنے والوں کی حیثیت کو۔

۸ اگست ۱۹۹۱

لا الٰہ الّا اللّٰہ کا مطلب اہل ظاہر کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے برعکس صوفیاء کے یہاں اس کلمہ کا مطلب یہ ہے : لا موجود الا اللّٰہ۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اول الذکر کے مطابق، ذات الٰہی میں تعدد نہیں ہے۔ ثانی الذکر کے مطابق، اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم موجودات میں تعدد نہیں۔ ایک ہی کلمہ ہے۔ اس سے ایک گروہ نے توحید کا عقیدہ نکالا۔ دوسرے گروہ نے اسی کلمہ سے وحدت الوجود کا نظریہ برآمد کر لیا۔

انسانی الفاظ میں ہمیشہ اس قسم کی گنجائش رہتی ہے۔ جو بات انسانی لفظوں میں کہی گئی ہو اس کو صحیح مفہوم میں لینے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی انتہائی سنجیدہ ہو۔ ورنہ وہ صحیح مفہوم تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔

۹ اگست ۱۹۹۱

صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینہ میں ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے حق میں دعا فرماتے ہوئے کہا کہ اے اللہ، مکہ کی برکت کے مقابلہ میں مدینہ میں دگنا برکت دے (اللّٰھم اجعل بالمدینۃ ضِعفَیْ ما جعلتَ بمکۃ

من البرکۃ۔)

کچھ لوگ اس حدیث کو لے کر کہتے ہیں کہ مدینہ کی فضیلت مکہ کی فضیلت سے زیادہ ہے۔ مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ کیوں کہ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد مدینہ کی مسجد کا ثواب ہے۔ ایسی حالت میں فضیلت کے اعتبار سے مکہ نمبر ا پر ہوگا اور مدینہ نمبر ۲ پر۔

اصل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا تعلق "برکت" سے ہے نہ کہ "فضیلت" سے۔ اصحاب رسول جب مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آئے تو وہ بہت پریشان تھے۔ اس وقت ان کی تسکین کے لئے آپ نے مدینہ کے حق میں بہت سی دعائیں فرمائیں۔ مثلاً یہ کہ مد اور صاع میں برکت دے۔ مذکورہ حدیث بھی اسی نوعیت کی ہے۔ یہاں برکت سے مراد ہجرت مدینہ میں برکت ہے نہ کہ خود مدینہ میں برکت۔

۱۰ اگست ۱۹۹۱

ایک مشہور اسلامی شاعر کا شعر ہے:

جس طرح احمد مختار ہے نبیوں میں امام   اس کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

یہ صرف ایک شعر نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام مزاج ہے۔ وہ اپنے آپ کو "امام اقوام" سمجھتے ہیں۔ یہ بلاشبہ موجودہ مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ کیوں کہ موجودہ مسلمان ایک تنزل یافتہ قوم ہیں۔ ایسی قوم کو ہمیشہ پچھلی سیٹ سے اپنے عمل کا آغاز کرنا پڑتا ہے۔ مگر موجودہ مسلمان اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر پچھلی سیٹ پر جانا اپنے لئے کم تر درجہ کا کام سمجھتے ہیں۔ ٹاپ سے اپنا عمل شروع کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ٹاپ سے کوئی عمل کبھی شروع نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی تعمیر ملی کا عمل بھی شروع نہ ہو سکا۔

"احمد مختار" خدائی اپائنٹمنٹ کی بنا پر نبیوں کے امام ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اس قسم کا کوئی خدائی اپائنٹمنٹ نہیں ہے۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ جیسا عمل ویسا بدلہ۔

۱۱ اگست ۱۹۹۱

دین دارانہ زندگی کی پانچ لازمی خصوصیات ہیں ——— ایمان، عبادت،

اخلاق، امر بالمعروف و النہی عن المنکر، دعوت الی اللہ۔ موجودہ مسلمانوں میں ابتدائی تین چیزیں ہیں مگر وہ ناقص صورت میں ہیں۔ ان میں ایمان ہے مگر وہ اقراری ایمان ہے نہ کہ عارفانہ ایمان۔ ان میں عبادت ہے مگر وہ شکلی عبادت ہے نہ کہ حقیقی عبادت۔ ان میں اخلاق ہے مگر وہ رسمی اخلاق ہے نہ کہ گہرا اخلاق۔

آخری دو صفتیں ان میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ امر بالمعروف والنہی عن المنکر سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کوئی زیادتی کرے تو آس پاس کے مسلمان فکرمند ہو جائیں۔ سب مل کر اس زیادتی کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر وہ عملاً ختم نہ کر سکیں تو زبان سے اس کی مذمت کریں۔ دعوت الی اللہ کا مطلب دوسری قوموں تک خدا کے دین کو پہنچانا ہے اور دعوت کے تمام تقاضوں کو برتتے ہوئے اس کو جاری رکھنا ہے۔ یہ دونوں صفتیں موجودہ مسلمانوں کے اندر تقریباً مفقود ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۹۱

کئی سال پہلے ریڈرس ڈائجسٹ میں کسی نفسیات داں کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: اندرونی تحریک کی پیروی کرو (Obey that impulse) مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض اوقات اندر سے کسی کام کے بارہ میں موافق یا مخالف تحریک اٹھتی ہے۔ یہ فطرت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔

یہ بالکل درست ہے۔ مجھے بار بار اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کل میں نے غسل کیا۔ اس کے بعد بدن کا پانی تولیہ سے پوچھے بغیر کپڑا پہننے لگا۔ عین اس وقت اندر سے ایک احساس ابھرا کہ تولیہ سے بدن پوچھ کر کپڑا پہنو۔ مگر میں نے اس احساس کی پروا نہیں کی اور بھیگے بدن پر کپڑا پہن لیا۔ چند گھنٹے کے بعد طبیعت خراب ہو گئی۔ آج تھرما میٹر سے دیکھا تو تقریباً سو ڈگری حرارت ہو گئی تھی۔ فطرت ہر معاملہ میں اپنا الارم دیتی ہے۔ یہ الارم نہایت درست ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ فطرت کے الارم کو کبھی نظر انداز نہ کرے۔

۱۳ اگست ۱۹۹۱

لکھنؤ کے عربی جریدہ الرائد (۳ محرم ۱۴۱۲ھ) میں ایک عرب شاعر عمر ابوریشہ کی نظم پڑھی۔ اس کا عنوان "امتی" ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے کہ اے میری امت، کیا تمہارے لئے دنیا کی قوموں کے درمیان تلوار یا قلم کے اعتبار سے کوئی بلند مقام ہے:

امتی ھل لکِ بینَ الاُمم منبَرٌ للسیف او للقلم

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے سو دو سو سال سے اس بات کا ماتم کر رہے ہیں کہ مسلم قوم کے لئے موجودہ زمانہ میں وہ بلند مقام حاصل نہیں جو ماضی میں اس کو حاصل تھا۔ اس بات کو جب میں سوچتا ہوں تو مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام کے نام سے صرف بعد کی تاریخ جانتے ہیں۔ اصل اسلام سے انھیں براہ راست کوئی آگاہی نہیں۔

اسلام کا اصل پہلو یہ ہے کہ ہم کو غیر محرف دین دیتا ہے۔ وہ ہم کو رب العالمین سے ملاتا ہے۔ ہمارے لئے ابدی جنت کا راستہ کھولنے والا ہے۔ یہ بلاشبہ زیادہ بڑی باتیں ہیں جو آج بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اسلام سے واقفیت نہیں۔ اس لئے انھیں اسلام کے ان اصل پہلوؤں کی خبر بھی نہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۹۱

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور ہر آدمی بے تکان بول رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا چاہتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میری زبان سے نکلا —— لوگ جتنا بولتے ہیں اتنا وہ کریں، اور جتنا وہ کرتے ہیں اتنا وہ بولیں تو ساری دنیا کا نقشہ بدل جائے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۱

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۸ اگست ۱۹۹۱) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے اس کا عنوان ہے: تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ

تھی کہ اتنے مسلمان اس سے پہلے کبھی مہاجر نہیں بنے۔

مگر مآل کے اعتبار سے اس ہجرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حقیقی ہجرت ایک انتہائی بامعنی اور انتہائی بامقصد عمل ہے۔ حقیقی ہجرت وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہو۔ جو ہجرت بے فائدہ ہو وہ بھگدڑ ہے نہ کہ فی الواقع ہجرت۔

۱۶ اگست ۱۹۹۱

خالق کائنات کی جو صفتیں قرآن میں بتائی گئی ہیں وہ تمام صفتیں انسان کے اندر بھی رکھ دی گئی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ صفات انسان کے اندر محدود ہیں اور خدا کے اندر لامحدود۔ انسان کے اندر وہ ناقص صورت میں ہیں اور خدا کے اندر کامل صورت میں۔ انسان ان تمام صفات کے باوجود ایک فانی ہستی ہے اور خدا ایک باقی ہستی۔ انسان کی صفتیں عطیہ ہیں اور خدا کی صفتیں اس کی اپنی ذات کا حصہ ہیں۔

میرا حال یہ ہے کہ جب میں ایک زندہ اور صحت مند انسان کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا انسان مخلوق کی سطح پر خالق کا تعارف ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۹۱

ایمان باللہ سادہ طور پر تلفظ کا معاملہ نہیں۔ یہ ناقابل فہم کو قابل فہم بنانے کا معاملہ ہے۔ یہ محدود کو لامحدود کا ادراک کرانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان باللہ ایک مشکل ترین عمل ہے۔ اگر آدمی کا پیدائشی وجدان اس کی مساعدت نہ کرے تو کسی بھی شخص کے لئے ایمان باللہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔

۱۸ اگست ۱۹۹۱

کلیم الدین احمد حیدر آبادی چند سال سے نیویارک میں ہیں۔ وہاں وہ سرگرمی کے ساتھ الرسالہ مشن کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر بتایا کہ میشی گان کے ایک امریکی نومسلم یحییٰ ایمرک (Yahya Emerick) کو انگریزی الرسالہ اور ہماری دوسری انگریزی مطبوعات ملی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد وہ اتنا متاثر ہوئے کہ اپنے پانچ دوستوں کے نام اپنی طرف سے

انگریزی الرسالہ جاری کرایا۔ انھوں نے ٹیلیفون پر کلیم الدین صاحب کو بتایا کہ ان کتابوں میں صحیح معنوں میں دعوہ میٹریل (Dawah material) ہے۔ باقی جو کتابیں ہیں ان میں زیادہ تر جہاد کے نام سے لڑائی بھڑائی کی باتیں ہوتی ہیں جو فطرت کو اپیل نہیں کرتیں۔

۱۹ اگست ۱۹۹۱

میرے جاننے والوں میں ایک صاحب ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ہے۔ اس کو انھوں نے معیاری انگلش اسکول میں پڑھایا۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ اس کو امریکہ بھیج کر کمپیوٹر انجینئرنگ کا کورس کرائیں۔ برسوں سے وہ اسی کے مطابق بچہ کی تیاریاں کرا رہے تھے۔ اب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں ہیں۔ بچہ کا داخلہ امریکہ کے ایک تعلیمی ادارہ میں ہوگیا۔ امریکی سفارت خانہ نے ویزا بھی دے دیا۔ انھوں نے بچہ کی بیرونی تعلیم کے لئے ضروری ڈالر بھی حاصل کر لئے۔ کل ان سے ملاقات ہوئی تو پہلا جملہ جو ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا: ۳ ستمبر کو ہمارا بیٹا امریکہ کے لئے روانہ ہو جائے گا۔

لوگوں کے لئے سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ ان کا بیٹا امریکہ پہنچ جائے۔ مگر مومن کے لئے سب سے بڑی خبر کچھ اور ہے۔ یہ وہی ہے جس کو النبأ العظیم کے الفاظ میں قرآن کی سورہ نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۱

اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۲۵ سالہ "جہاد" کے ذریعہ کشمیر سے راس کماری تک ایک عظیم سلطنت بنائی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک عظیم اسلامی ایمپائر قائم کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر جب ملک فتح ہو چکا تو معلوم ہوا کہ اس کو چلانے کے لئے صالح افراد کی ضرورت ہے اور وہ اس کے پاس موجود نہیں۔ اس نے حسرت کے ساتھ کہا:

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

تاہم بعد کے لوگوں نے اس سے کوئی سبق نہیں لیا۔ سید احمد شہید بریلویؒ نے اسی انداز پر پشاور میں اسلامی حکومت قائم کی جو افراد نہ ہونے کی وجہ سے بکھر گئی۔ اقبال اور جناح نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے پاکستان کے نام سے ایک جغرافی ٹکڑا حاصل کیا

مگر وہ بھی افراد سے محرومی کی بنا پر صرف ایک قومی اسٹیٹ بن کر رہ گیا۔ سید قطب اور ان کے ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ مصر میں شاہ فاروق اور انور السادات کو تخت سے ہٹا کر وہ اسلام کی حکمرانی قائم کرسکتے ہیں۔ مگر افراد کے بغیر یہ اسکیم بھی ناکام ہوگئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت کا خیال تھا کہ ایوب خاں اور بھٹو کو ختم کر کے وہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے جارہے ہیں مگر وہ بھی افراد نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہے۔

قرآن میں افرادکار کے حصول کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک ابراہیمی طریقہ، جس کے ذریعہ دو ہزار سال سے زیادہ مدت میں ایک نازہ نسل تیار کی گئی۔ دوسری مثال بنی اسرائیل کی ہے جن کو چالیس سال کے لئے صحرائے سینا میں ڈال دیا گیا اور اس کے بعد ان کے نوجوانوں کو لے کر ایک ٹیم بنائی گئی۔

تیسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں استبدال قوم کہا گیا ہے۔ یعنی تبلیغ کے ذریعہ غیر مسلم قوموں سے نیا خون حاصل کرنا۔ موجودہ حالات میں میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی اصلاحی کوشش کے ساتھ انتہائی ضروری ہے کہ غیر مسلم قوموں میں بڑے پیمانہ پر تبلیغ کی جائے۔ دوسری قوموں سے جب تک نیا خون (new blood) نہ ملے صرف مسلمانوں کی بنیاد پر کوئی گہرا نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے یہ باتیں کہیں۔

۲۱ اگست ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر غیر مسلم مفکرین کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی ایک بات اپنے مطلب کے مطابق لے لیتے ہیں۔ حالاں کہ اگر ان کی پوری بات کو لیا جائے تو وہ آپ کی تردید بن جائے گی۔ یہ طریقہ کہاں تک درست ہے۔

میں نے کہا کہ لبید بن ربیعہ العامری قدیم عرب کے ایک شاعر تھے۔ بعد کو انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے دور جاہلیت میں یہ شعر کہا تھا:

الا کل شئ ما خلا اللہ باطل   وکل نعیم لا محالۃ زائل

اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک بار قریش کی مجلس میں انھوں نے اپنا یہ شعر پڑھا۔ وہاں حضرت عثمان موجود تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے پہلے مصرعہ کو سن کر کہا: صَدَقْتَ

مگر جب لبید نے دوسرا مصرعہ پڑھا تو انھوں نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ جنت کی نعمت کبھی ختم نہ ہوگی
کذبت ، نعیم الجنة لا یزول) البدایة والنھایہ ۹۲/۳

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: اصدق کلمة قالھا شاعر کلمة لبید۔ اس کے بعد آپ نے مذکورہ شعر کا صرف پہلا مصرعہ پڑھا۔ آپ نے اس کا دوسرا مصرعہ نہیں پڑھا۔ کیوں کہ، جیسا کہ حضرت عثمان نے کہا، اس میں ایک قابل اعتراض پہلو موجود تھا۔ (البدایة والنہایہ ۲۲۱/۴

۲۲ اگست ۱۹۹۱

قرآن میں یہ آیت ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۳۹،۷) دوسری طرف قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں کو قتل انبیا پر سرزنش کی گئی ہے۔ (۱۵۵، ۴) حالانکہ قتل انبیا کا یہ فعل قدیم یہودیوں نے کیا تھا نہ کہ آپ کے ہم زمانہ یہودیوں نے۔ پھر بعد کے یہودیوں کو قدیم یہودیوں کے جرم کا ذمہ دار کیوں ٹھہرایا گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کے ہم عصر یہودی اپنے قومی اکابر کے اس فعل کو disown نہیں کرتے تھے۔

قومی جرم کے لئے اسلام کا اصول یہی ہے۔ قوم کے کچھ افراد اگر ایک جرم کریں تو قوم کے دوسرے افراد کو اس کی مذمت کرنی پڑے گی۔ اگر دوسرے لوگ اس کی مذمت نہ کریں تو وہ بھی اس قومی جرم میں شریک سمجھے جائیں گے۔ پہلے لوگ اگر اسلام کی نظر میں براہ راست مجرم ہیں تو دوسرے لوگ اس کے بالواسطہ مجرم۔

۲۳ اگست ۱۹۹۱

سید شوکت صاحب احمد آباد کے باشندے ہیں۔ کئی سال سے وہ دبئی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کا پورا خاندان الرسالہ (انگریزی) کا قاری ہے۔ وہ اپنی اہلیہ اور دو بچیوں کے ساتھ آئے۔ ان کی دونوں بچیاں شارجہ میں انڈین انگلش اسکول میں پڑھتی ہیں۔ اس اسکول کی خاتون ٹیچر سب کی سب ہندو یا کرسچین ہیں۔ کچھ ٹیچر اسکول میں اسلام کا مذاق اڑاتی تھیں۔ سید شوکت صاحب کی بچیوں نے ان ٹیچروں کو انگلش الرسالہ دینا شروع

کیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد ان ٹیچروں کا ذہن بدل گیا۔ اب وہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کرتی ہیں۔

جب کوئی اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو مسلمان فوراً اس کو تعصب کا معاملہ بتا کر اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ حالاں کہ اکثر اوقات میں یہ مخالفت محض ناواقفیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر اسلام کی صحیح معلومات پہنچائی جائیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی مخالفت موافقت میں تبدیل ہو جائے۔

۲۴ اگست ۱۹۹۱

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ الرسالہ میں صرف مسلمانوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے مضامین میں نیشنل اپروچ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ الرسالہ میں بہت سے مضامین خالص نیشنل انداز کے ہوتے ہیں جو کسی فرقہ سے نہیں بلکہ پوری ہیومن کائنڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں مضامین کا ایک مجموعہ "تعمیر کی طرف" کے نام سے چھاپا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بظاہر مسلمانوں کو مخاطب کرنے والے مضامین بھی غیر نیشنل نہیں ہوتے۔ الرسالہ میں مسلمانوں سے متعلق جو مضامین ہوتے ہیں ان میں مسلمانوں کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ وہ اس ملک میں پروٹسٹنٹ گروپ بن کر نہ رہیں بلکہ وہ ملک کے ایک creative group بنیں۔ وہ صرف مطالبہ نہ کریں بلکہ دینے والے بنیں۔ یہ بھی عین نیشنل اپروچ ہے۔ بلکہ یہ لوگوں کے اندر نیشنل اپروچ پیدا کرنے کا سب سے موثر قدم ہے۔

۲۵ اگست ۱۹۹۱

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "تجدید و احیاء دین" میں جزئی مجدد اور کامل مجدد کی تقسیم کی ہے۔ انھوں نے مہدی کو کامل مجدد قرار دیا ہے۔ یہ تقسیم بظاہر درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر کامل مجدد کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ وہ مکمل اسلامی انقلاب برپا کریگا۔ اور ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرے گا۔

یہ تعریف مجھے درست نظر نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ بعد کے دور میں کسی مجدد کے لئے

" ہادی" کا رول مقدر نہیں۔ بعد میں آنے والے کے لئے صرف " مہدی" کا رول مقدر ہے۔ اس لئے دور آخر کے مجدد کو حدیث میں المہدی بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے الہادی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ غالباً مہدی کے ذریعہ جو کام انجام پائے گا وہ دین کا کامل اظہار ہے نہ کہ دین کا کامل نفاذ۔

۲۶ اگست ۱۹۹۱

الجیریا سے ٹیلیفون آیا۔ کسی عرب نوجوان نے بتایا کہ محمد سلیمان القائد کو طرابلس کی پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ وہ اس وقت پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔ اللہ خیر فرمائے۔ اور محمد سلیمان القائد اور ان کے تمام ساتھیوں کو محفوظ رکھے۔

لوگ اس قسم کے واقعات سن کر عرب حکمرانوں کے اوپر غصہ ہوتے ہیں۔ مگر مجھے سب سے زیادہ غصہ ان نام نہاد اسلامی جماعتوں پر ہے جنھوں نے " اسلامی سیاست" کی تحریکیں چلائیں اور اپنے عمل سے یہ تاثر دیا کہ اسلام نام ہے حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا۔ مصر کے سید قطب اور ان کی جماعت اور پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت اس سیاست کے چیمپئن ہیں۔ انھیں تحریکوں کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلم حکمراں اسلام کو اپنے لئے سیاسی خطرہ سمجھنے لگے۔ اور ہر اس آدمی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے جو اسلام کے نام پر کام کرنے کے لئے اٹھے۔

اللہ تعالیٰ نے جبر کے حالات کو ختم کر کے ہمیں یہ موقع دیا تھا کہ اسلام کی دعوتِ توحید کو کسی رکاوٹ کے بغیر پھیلا سکیں۔ مگر قطب اور خمینی اور مودودی جیسے لوگوں نے اپنی جھوٹی تحریکوں کے ذریعہ غلط طور پر دوبارہ جبر کے حالات پیدا کر دئے۔ ان کے اوپر عبداللہ بن عمرؓ کے وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو انھوں نے فتنہ زبیر میں ملوث لوگوں سے کہے تھے۔

قد قاتلنا حتی لم تکن فتنة وکان الدین للّٰه وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنة ویکون الدین لغیر اللّٰه (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۰۸)

۲۷ اگست ۱۹۹۱

دور قدیم میں سب سے بڑا دعوتی مسئلہ یہ تھا کہ توحید کا نظریہ اسٹیٹ کا حریف

بن گیا تھا۔ قدیم زمانہ" خدائی بادشاہت" کا زمانہ تھا۔ ہر بادشاہ کسی نہ کسی مشرکانہ عقیدہ سے اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کئے ہوئے تھا۔ اس بنا پر توحید اس کو اپنے حق حکمرانی کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ صحابہ کرام کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ سیاست میں جمہوریت کا دور آیا۔ اس انقلاب کے زیر اثر شرک محدود معنوں میں ایک مذہبی عقیدہ بن کر رہ گیا۔ سیاسی عقیدہ کی حیثیت سے اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔

مگر موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنما اٹھے جنھوں نے اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس نظریہ سے متاثر افراد اپنے حکمرانوں سے ٹکرا گئے۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ ان سے یہ کہتا تھا کہ ان حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹاؤ تاکہ اسلام کا قانونی اور سیاسی نظام نافذ کیا جاسکے۔ اس کے نتیجہ میں اہل دین اور اہل حکومت کے درمیان غیر ضروری طور پر حریفانہ فضا پیدا ہو گئی۔ قدیم فتنہ دوبارہ نئی شکل میں لوٹ آیا۔

۲۸ اگست ۱۹۹۱

پچھلے زمانہ میں علم کا تصور آج سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ علم وہ ہے جو سچائی کا راستہ دکھائے۔ جو علم سچائی کا راستہ نہ دکھائے وہ علم ہی نہیں:

علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است

آج علم کو روزگار اور دولت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ آج روزگار رخی (job-oriented) تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ باصلاحیت نوجوان ان علمی شعبوں میں ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہے ہیں جس میں کمائی کے زیادہ سے زیادہ مواقع پائے جاتے ہوں۔ ہندستان میں اس وقت پونے دوسو یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر سال ہزاروں لوگ ان میں پڑھ کر نکل رہے ہیں۔ مگر "جہالت" میں کمی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ علم کا تصور ہی سرے سے بدل گیا ہے۔

۲۹ اگست ۱۹۹۶

مسٹر کمال علیگ میرٹھ کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ چند سال سے دہلی میں بزنس کرتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے کافی قدرداں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے

وطن گئے۔ وہاں ایک مسلمان کسان داداگیری کرنے لگا تھا۔ اس نے کئی قتل کئے۔ کئی ڈاکے ڈالے۔ اس کے اوپر آٹھ مقدمات چل رہے تھے۔ کمال صاحب نے کہا کہ تم میرے پاس دہلی آؤ۔ میں تم کو ایک تعویذ دوں گا۔ جب وہ دہلی آیا تو انھوں نے اس کو 'رازحیات' مطالعہ کے لئے دی۔ کمال صاحب نے بتایا کہ اس کتاب کو پڑھ کر اس کی زندگی بدل گئی۔ اس نے اب جرائم کی زندگی چھوڑ دی ہے اور اپنی کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہوگیا ہے۔ اور بچوں کو تعلیم دلا رہا ہے۔ اسی طرح انھوں نے بتایا کہ دہلی کے ایک اسکول کے ماسٹر صاحب کو انھوں نے الرسالہ اور کتابیں دیں۔ اب ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو پڑھ کر تو میری دنیا بدل گئی۔ اس طرح کی رپورٹیں برابر مختلف مقامات سے ملتی رہتی ہیں۔

۳۰ اگست ۱۹۹۱

جی ڈبلیو ایف ہیگل (۱۸۳۱ - ۱۷۷۰) مشہور جرمن فلسفی ہے۔ اس کا ایک قول ہے کہ واقعات ہیرو بناتے ہیں، ہیرو واقعات کو ظہور میں نہیں لاتے:

Events make heroes, not heroes, events.

یہ قول میرے خیال سے آدھی صداقت ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہیرو دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی زندگی ہی میں ہیروانہ شہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ واقعات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مگر ہیروؤں کی ایک اور قسم ہے جو واقعات کو ظہور میں لاتی ہے۔ یہ ہیرو وہ ہیں جو موت کے بعد ہیروانہ حیثیت حاصل کرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ زیرو ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کے بعد ہیرو۔

۳۱ اگست ۱۹۹۱

ہیون سنگ (Hsuan-tsang) ایک چینی بدھسٹ ہے۔ وہ ۶۰۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۶۶۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۶۲۹ء میں چین سے سفر کرکے انڈیا آیا۔ انڈیا کے بارہ میں اس کا سفرنامہ بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا: ' ہندستان ایک خوشحال ملک ہے جہاں دودھ کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ اور پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کو تالا نہیں لگاتے۔ اور اپنے

کھانے پینے کا سامان خود پیدا کرتے ہیں۔"

آج کا ہندستان اس سے سراسر مختلف ہے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ ساتویں صدی عیسوی کے ہندستان اور بیسویں صدی کے ہندستان میں اتنا زیادہ فرق کیوں۔ وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

یکم ستمبر ۱۹۹۱

آج ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب کے یہاں اجتماع تھا۔ میں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ باتیں کہیں۔ اس ذیل میں میں نے کہا کہ ٹیپو سلطان کی فوج میدان جنگ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ تھوڑے ہی لوگ ٹیپو کے ساتھ رہ گئے۔ دوسری طرف انگریزوں کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ اس کے باوجود ٹیپو نے جنگ کی اور مارے گئے۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جہاد کا حکم آیا۔ اس وقت بنی اسرائیل نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے ساتھ رہ گئے۔ اس کے بعد جہاد کا حکم ملتوی کر دیا گیا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اپنی طاقت اور دشمن کی طاقت میں بہت زیادہ نابرابری ہو، اس وقت دشمن سے جنگ کرنا پیغمبروں کا طریقہ نہیں۔

یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ایک مسلمان نے کہا: آپ ٹیپو کا comparision پیغمبر سے کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگ بھی کتنے بے پڑھے لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے پیغمبر اور ٹیپو میں تقابل نہیں کیا تھا۔ بلکہ میں نے پیروی کی بات کہی تھی۔ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ پیغمبروں کا طریقہ کیا ہے جس کی ہمیں پیروی کرنا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں بیشتر مسلمانوں کا حال یہی ہے۔ اختلاف پیش آتے ہی وہ غیر منطقی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

۲ ستمبر ۱۹۹۱

رات کو ایک خواب دیکھا۔ صبح چار بجے اٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں سفر کے دوران کہیں ٹھہرا ہوں۔ وہاں ایک صاحب ہیں جنھوں نے بہت جائداد بنائی ہے۔ میرے ایک ساتھی نے کہا، دیکھئے، انھوں نے اپنے بیٹوں کے لئے کروڑوں روپیہ

کی جائداد بنائی ہے۔ ہم مریں گے تو ہمارے بیٹوں کے لئے کچھ نہیں ہوگا۔ اس شخص نے کئی بار اپنے اس جملہ کو دہرایا۔ میں نے کہا کہ آپ غلط کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی نے اپنے بیٹے کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اس نے اپنے بیٹے کے لئے سب سے بڑی چیز چھوڑی۔ اس نے شوقِ عمل چھوڑا۔ اور شوقِ عمل سے بڑی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔

میرا مذکورہ ساتھی اس جملہ کو سن کر بہت متاثر ہوا۔ وہ دوڑ کر گیا اور جلدی سے ایک کاغذ لایا۔ اور کہا کہ اپنے اس جملہ کو کاغذ پر لکھ دیجئے۔ میں نے قلم لے کر یہ جملہ کاغذ پر لکھا۔

۳ ستمبر ۱۹۹۱

ماہنامہ افکار ملی (دہلی) ستمبر ۱۹۹۱، صفحہ ۵ پر ایک خط چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "اسلامی نظام کے علمبرداروں کا رویہ" مکتوب نگار ایک ہندستانی مسلمان ہیں۔ اس وقت وہ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنا نام ظاہر کرنے کے بجائے "ایک بہی خواہ" کا لفظ لکھنا پسند کیا ہے۔ ۱۷ جون ۱۹۹۱ کو لکھے ہوئے اس خط کا خلاصہ یہ ہے کہ سعودی عرب میں امریکیوں کے آنے کے بعد وہاں برائیاں پھیل رہی ہیں۔ مگر امریکیوں کی دل آزاری کے اندیشہ کی بنا پر مجرموں کو شرعی سزا نہیں دی جا رہی ہیں۔

میں اس سلسلہ میں یہ اضافہ کروں گا کہ امریکیوں کے ڈر سے سعودی حکام اگر اسلامی سزاؤں کو نافذ نہیں کر رہے ہیں تو خود مکتوب نگار نے بھی اس معاملہ میں اسی کردار کا ثبوت دیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے سعودی حکام کے ڈر سے اپنا نام ظاہر نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ مکتوب نگار کی رپورٹ درست ہو۔ مگر ایسی صورت میں زیادہ صحیح اور مطابق واقعہ بات یہ تھی کہ مکتوب نگار خط کے آخر میں اپنا نام "ایک بہی خواہ" لکھنے کے بجائے "ایک بزدل" تحریر فرماتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا دانشور طبقہ اسی قسم کے بزدلانہ مظاہروں کا بہادر بنا ہوا ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے کئی ساتھیوں (محمد ہاشم قاسمی، محسن عثمانی ندوی)

نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مشن میں خامی ہے۔ ورنہ یہ لوگ آپ کا ساتھ کیوں چھوڑتے۔ میں نے کہا کہ یہ کسی شخص یا کسی مشن کو جانچنے کا کوئی معیار نہیں۔ اگر آپ اس کو معیار بنائیں گے تو اس کا سلسلہ صرف مجھ پر نہیں رکے گا۔ وہ بہت دور تک جا پہنچے گا۔

حضرت مسیح کے متعلق انجیل میں بتایا گیا ہے کہ جب لوگ تلواریں اور لاٹھیاں لیکر آئے تو اس وقت آپ کے سب شاگرد آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی ۲۶ : ۵۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے لئے ایک ہزار مسلمانوں کے ساتھ نکلے۔ درمیان میں عبد اللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو لے کر آپ کی جماعت سے نکل آیا (سیرۃ ابن کثیر ۳/۲۵) حضرت عبد اللہ بن الزبیر کے اکثر ساتھیوں نے آخر وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا ...خذله عامة اصحابه، (الاعلام للزرکلی، ۴/ ۸۷) تازہ مثال یہ ہے کہ مولانا احمد علی قاسمی نے لکھا ہے کہ امیر شریعت سید منت اللہ رحمانی کی وفات کے بعد یہ انتہائی افسوسناک پہلو سامنے آیا ہے کہ جن حضرات کو مولانا رحمانی نے تہائی صدی تک تربیت دے کر تیار کیا تھا انھیں میں سے بعض حضرات امارت شرعیہ کے خلاف مذموم اور منظم سازش کرنے میں مبتلا ہیں۔ (ماہنامہ دعوت وعزیمت ستمبر ۱۹۹۱، صفحہ ۲)

۵ ستمبر ۱۹۹۱

کچھ لوگ آئے جو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے فکر سے متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی فکر غیر مکمل ہے۔ آپ کے پیغام میں امت کے تمام مسائل کا جواب نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی تفکیر مبنی بر نظام (system-based) تفکیر ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری تفکیر مبنی بر فرد (individual-based) تفکیر ہے۔ آپ کے ذہن پر مبنی بر نظام فکر چھا چکا ہے، اس لئے مبنی بر فرد فکر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے کہا کہ مولانا مودودی اور ان کے جیسے دوسرے حضرات کی فکر یہ ہے کہ حکومتی نظام پر قبضہ کرکے اس کی طاقت سے فرد اور سماج کی اصلاح کی جائے۔ ان کے نزدیک مثالی نظام اسی طرح بنایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ دورِ اوّل میں حصول

اقتدار سے پہلے فکری تحریک کے ذریعہ ایک لاکھ افراد کی ٹیم تیار ہوئی۔ اس نے ایک انقلاب برپا کیا۔ اس کے بعد جب خلافت راشدہ کی صورت میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہوئی تو حکومتی ذرائع سے دوبارہ اس قسم کی صالح ٹیم نہ بن سکی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد سازی کا کام فکری تحریک کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ حکومتی طاقت کے ذریعہ۔

۶ ستمبر ۱۹۹۱

محمد محفوظ صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ ایس آئی ایم کے پریسیڈنٹ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۳-۲۴-۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ کو بمبئی میں وہ لوگ اپنا انٹرنیشنل اجتماع کر رہے ہیں۔ اس کا نام "اقدام امت کانفرنس" ہوگا۔ مجھ سے کانفرنس کے لئے پیغام مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں کیا پیغام دوں۔ میرے نزدیک تو اس قسم کی کانفرنسیں بالکل نررتھک ہیں۔

موجودہ حالات کے اعتبار سے ضرورت ہے کہ "تیاری امت کانفرنس" کی جائے، اور آپ لوگ "اقدام امت کانفرنس" کر رہے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسان بیج ڈالنے کے موسم میں فصل کاٹنے کی تقریب منانے لگے۔

۷ ستمبر ۱۹۹۱

مسٹر اے این ڈار کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (۵ ستمبر ۱۹۹۱) میں پڑھا۔ کشمیر کی جنگ جویانہ سیاست کے مقابلہ میں نئی دہلی کی تشدد کی پالیسی سے انھوں نے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کشمیر میں انڈیا کی پالیسی عوام رخی ہونی چاہئے نہ کہ بندوق رخی:

...the policy should be people-oriented, instead of gun-oriented.

کشمیر کے بارہ میں اکثر لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ رائے محض سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ کشمیر کا معاملہ انڈیا اور پاکستان دونوں کے لئے کرپشن کا مسئلہ ہے۔ دونوں جگہ اس کے نام پر لوٹ مچی ہوئی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے موجودہ پاکستانی حکمرانوں پر الزام لگایا ہے کہ کشمیر کے بارہ میں بیرونی ملکوں میں مہم چلانے کے

نام پر انھوں نے دس کروڑ روپے سرکاری خزانہ سے وصول کر لئے (نوائے وقت ۳۰ اگست ۱۹۹۱) اسی طرح مسٹر موہن چراغی نے قومی آواز (۶ ستمبر ۱۹۹۱) میں تفصیل سے بتایا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ختم نہ ہونے کی واحد وجہ رشوت ہے۔

کشمیر کے اشو پر لوگ لیڈری حاصل کر رہے ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر ایک اس کے نام پر رقمیں وصول کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا اصلی حل یہ ہے کہ کرپشن کو ختم کیا جائے۔ فائرنگ بند کرو کی چیخ پکار سے کوئی فائدہ نہیں۔

۸ ستمبر ۱۹۹۱

ڈاکٹر شمس الآفاق اور ان کے ساتھیوں نے ٹیلی فون پر سوال کیا کہ صبر کی انتہا کیا ہے، اور صبر اور بزدلی میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ صبر ایک مقصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ جب کہ بزدلی کسی مقصد کے بغیر محض انفعالی جذبہ کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صبر کی حد کیا ہے۔ صبر اس وقت تک کرنا ہے جب تک وہ مقصد کے حصول میں مددگار رہو۔ جب وہ مقصد کے حصول میں مددگار نہ رہے تو اس کے بعد صبر کی حد آجائے گی ــــــ صبر برنبائے مقصد ہوتا ہے اور بزدلی برنبائے کمزوری۔

صبر کی حد آنے کے بعد صبر کا معاملہ مقصد سے متعلق نہیں رہتا، وہ استطاعت سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کے اندر قوت ہے تو وہ عزیمت کا طریقہ اپنائے۔ اور اگر وہ اپنے اندر قوت نہیں پاتا تو اس کے لئے جائز ہو جاتا ہے کہ وہ رخصت کا طریقہ اختیار کرے۔

۹ ستمبر ۱۹۹۱

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے گفت گو ہوئی۔ ان کو الرسالہ مشن کے صبر و اعراض والے پہلو سے اختلاف تھا۔ میں نے قطعی دلائل کے ذریعہ اس کی اہمیت ثابت کی۔ مگر وہ آخر وقت تک ماننے پر راضی نہیں ہوئے۔ صبر و اعراض کی اہمیت کو جب میں قرآن و حدیث سے ثابت کرتا تو وہ عقلی اشکالات پیش کر دیتے۔ اور جب میں اس کو عقلی

دلائل سے ثابت کرنا تو وہ کہتے کہ ہم کو قرآن وحدیث کے ذریعہ بتائیے۔

میرا بار بار کا تجربہ ہے کہ خواہ کتنے ہی زیادہ طاقت ور دلائل سے ثابت کردیا جائے آدمی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ وہ نکتہ بحث کو بدل دیتا ہے۔ وہ ایک اعتراض پیش کرتا ہے۔ اور جب اس کے اعتراض کو دلائل سے رد کر دیا جائے تو وہ نکتۂ بحث کو بدل دے گا۔ اس طرح نئے نکتۂ بحث کی روشنی میں اس کو سابقہ بات غیر ثابت شدہ نظر آنے لگے گی۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۱

امریکہ سے مسز عابدہ بیگم ــــــــــــــــ کا خط موصول ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہاں کے مسلمان جو جدید تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام کے بارہ میں طرح طرح کے اعتراضات کر رہے ہیں۔ مثلاً غلامی، وغیرہ

اس قسم کے خط میرے پاس اکثر آتے رہتے ہیں جن میں جدید طبقہ کے اعتراضات ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کا جواب دیا جائے۔ ان میں سے کوئی شخص یہ نہیں سوچتا کہ ان اعتراضات کا جواب تو سو سال سے دیا جا رہا ہے، پھر اعتراضات ختم کیوں نہیں ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ مسئلہ اعتراض کا جواب دینے کا نہیں ہے۔ بلکہ معترض کے ذہن کو صحیح کرنے کا ہے۔

یہ بہت آسان ہے کہ جب بھی کوئی شخص اعتراض کرے تو اس کے اعتراض کا پرشور جواب دے دیا جائے۔ مگر یہ طریقہ بے فائدہ ہے۔ اصل مسئلہ تزکیہ ذہنی ہے۔ یہی کام ہم الرسالہ اور کتابوں کے ذریعہ کر رہے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۱

ہندستانی ٹی وی (دوردرشن) پر کوئز پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ اگست ۱۹۹۱ میں اس قسم کا ایک کوئز پروگرام تھا۔ اس میں مختلف سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ کیا گیا کہ کون شخص ہے جس کو آزادیٔ ہند (۱۹۴۷) سے پہلے مسلم لیگی لیڈر مسٹر محمد علی جناح نے کانگریس کا شو بوائے کہا تھا۔

Whom Jinnah described as a showboy of the Congress in the pre-Independence era?

حصہ لینے والے نوجوان طلبہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ یہ تاریخی اعتبار سے صحیح جواب تھا۔ چوں کہ اس کا تعلق ایک تاریخی واقعہ سے ہے اس لئے وہ بظاہر قابل اعتراض بھی نہیں۔ مگر مسلم حلقوں میں اس پر زبردست شوروغل شروع ہوگیا۔ اس کو مولانا آزاد کی توہین قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ پر کثرت سے پرجوش مضامین اور خطوط اخباروں میں شائع ہوئے۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

یہ لفظ (شوبوائے) اگر مولانا آزاد کی توہین ہے تو اس توہین کا ارتکاب کرنے والے مسٹر محمد علی جناح ہیں نہ کہ دوردرشن۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اس بات پر دوردرشن کی مذمت کر رہے ہیں اور مسٹر جناح کو ان کے اس ریمارکس کے باوجود "قائد اعظم" بنائے ہوئے ہیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۹۱

مولانا انیس لقمان ندوی سے ایک گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ اس دنیا میں کسی بھی شخص کو دلیل کے ذریعہ چپ کرانا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ آزمائش کی مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہاں التباس اور اشتباہ کا ماحول قائم کر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز پر شبہ قائم کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

اسی حالت اشتباہ کی وجہ سے یہاں ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف اس شخص کو مطمئن کرنا ممکن ہے جو شبہ کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ جو شخص اس ذہنی قربانی کے لئے تیار نہ ہو اس کو کوئی بھی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ حتی کہ سادہ اور معروف حقائق بھی نہیں۔

اس دنیا میں کسی داعی کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ حق کا اعلان کرتا رہے۔ وہ سنانے کے تقاضے پورے کرے، خواہ دوسرے لوگ سننے کے تقاضے پورے نہ کر رہے ہوں۔ حقیقت کے غیر مشتبہ اظہار کے لئے ہمیں صرف صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہئے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۱

۲۶ جولائی ۱۹۹۱ کو مولانا اسعد مدنی نے ممبران پارلیمنٹ کو مسجد عبد النبی میں بلایا۔ کل ۲۰ ممبر جمع ہوئے۔ ممبران کے سامنے ایک انگریزی میمورنڈم دستخط کے لئے پیش کیا گیا۔ بتایا گیا کہ اس میں وزیر اعظم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے جس میں یہ ضمانت ہو کہ ملک کی تمام مساجد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی پوزیشن پر باقی رکھی جائیں گی۔ سب نے میمورنڈم پر دستخط کر دیا۔ عبد الصمد صدیقی ایم پی نے کہا کہ میں تو پڑھے بغیر اس پر دستخط نہیں کروں گا۔ انھوں نے پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ ماسوا بابری مسجد (except Babri Masjid) عبد الصمد صاحب نے کہا کہ میں اس میمورنڈم پر صرف اس وقت دستخط کروں گا جب کہ مذکورہ الفاظ کی جگہ بشمول بابری مسجد (including Babri Masjid) ہو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس کے بعد ۲۳ اگست ۱۹۹۱ کو اسی مضمون کا بل ہندستانی پارلیمنٹ میں کانگرس کی طرف سے پیش کر دیا گیا۔ اس میں بابری مسجد کو مستثنیٰ کر کے بقیہ مساجد کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی پوزیشن پر برقرار رکھنے کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کا نام Places of Worship (Special Provision) Bill ہے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۹۱ کو لوک سبھا نے کثرتِ رائے سے اس بل کو پاس کر دیا۔ اس کے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو راجیہ سبھا نے بھی اس کی منظوری دے دی۔

اجودھیا کی بابری مسجد میں ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ کو رات کے وقت مورتیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بڑے بڑے مسلم لیڈر زندہ موجود تھے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۱

مولانا ابوالکلام قاسمی نے بتایا کہ ۱۹۸۸ میں وہ بمبئی گئے۔ وہ محلہ ناگ دیوی میں تھے۔ انھوں نے اپنے میزبان سے کہا کہ مجھے بوہرہ فرقہ کے کسی آدمی سے ملاؤ۔ وہ لوگ مولانا کو پڑوس کے ایک بوہرہ تاجر کے پاس لے گئے۔ یہ ایک بڑا تاجر تھا۔ مولانا نے اس سے سوال کیا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عام مسلمانوں کے بارہ میں آپ حضرات کے احساسات کیا ہیں۔ بوہرہ تاجر نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے انداز میں کہا: "مولانا صاحب، ہیں

دل کا مریض ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے بولنے سے منع کیا ہے۔"

یہ تاجرانہ کردار کی ایک اچھی مثال ہے۔ تاجر ہمیشہ نزاعی گفت گو سے پرہیز کرتا ہے۔ یہ تاجرانہ مزاج تجارت میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۱

کچھ عرب حضرات نے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کا مقصد ـــــ اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of Knowledge) ہے۔ میں اس کے ایک سمینار (کوالالمپور) میں شریک ہوا تھا۔ سفرنامہ مطبوعہ الرسالہ دسمبر ۱۹۸۴ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اس وقت اس کے صدر مرحوم ڈاکٹر فاروقی فلسطینی تھے۔ آجکل اس کے صدر ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی سعودی ہیں۔

ڈاکٹر عبد الحلیم عویس (جامعۃ الامام ریاض) کل ہمارے یہاں آئے ہیں۔ ان سے میں نے ذکر کیا کہ ڈاکٹر فاروقی کے بعد یہ تحریک کیسی چل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب وہ بہت طاقت ور ہو چکی ہے اور کئی ملکوں میں اس کے دفاتر قائم ہیں۔ اس کا صدر دفتر واشنگٹن میں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اگرچہ عرب حکومتوں سے انھیں براہ راست مدد نہیں ملی۔ مگر انھوں نے مختلف ذرائع سے ایک سو ملین ڈالر جمع کر لئے ہیں۔

عملی نتیجہ کے اعتبار سے میں اس تحریک کا کوئی فائدہ نہیں سمجھتا۔ مگر اس تحریک نے مسلمانوں کو ایک بہت بڑا عنوان دیا ہے ـــــ سائنسی علوم کو اسلامی بنانا۔ موجودہ مسلمانوں کو چھوٹا کام اپیل نہیں کرتا۔ البتہ بڑے بڑے کاموں کی طرف وہ دوڑ پڑتے ہیں اور اس کو بڑا بڑا تعاون دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی نتیجہ ہمیشہ چھوٹے کاموں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ بڑے کاموں کے ذریعہ۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۱

پچھلے سیکڑوں سال سے مسلمانوں کے درمیان اسلامی سرگرمیوں کی دھوم برپا ہے۔ مگر حقیقی اصلاح کے اعتبار سے نتیجہ بالکل صفر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سرگرمیاں وہ ہیں جو مسلمانوں کے اندر فخر کی نفسیات ابھارنے والی ہیں۔ جبکہ اصلاح کی اصل جڑ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہو۔

یہ سرگرمیاں تقریباً سب کی سب کسی نہ کسی عظمت کو ابھارنے میں مشغول ہیں۔ عظمت کے احساس کو ابھارنا بذات خود درست ہے۔ مگر عظمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک، خدا کی عظمت۔ دوسرے، خدا کے علاوہ دوسری چیزوں کی عظمت۔ خدا کی عظمت کا احساس آدمی کے اندر عجز اور فروتنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری تمام چیزوں کی عظمت کا احساس فخر کی نفسیات کو جگاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کوئی بھی تحریک خدا کی عظمت کے احساس کو ابھارنے والی نہیں اٹھی۔ مسلمانوں میں اس دوران میں جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئیں وہ سب کی سب غیر خدائی عظمت کا احساس ابھارنے میں مشغول رہیں۔ رسول کی عظمت، تاریخ اسلام کی عظمت، بزرگان دین کی عظمت، فضائل اعمال کی عظمت، نظام اسلام کی عظمت، وغیرہ۔ اس قسم کی ہر عظمت مسلمانوں کے اندر فخر کی نفسیات جگا سکتی تھی اور وہی اس نے ان کے اندر جگایا۔

صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اللہ رب العالمین کی عظمت کا احساس ابھارا جائے۔ اللہ کی عظمت کا احساس آدمی کے اندر عجز اور فروتنی اور تواضع کی نفسیات کو بیدار کرتا ہے اور یہی ہر قسم کی اصلاح کی اصل جڑ ہے۔ جب کہ دوسری تمام عظمت کا تذکرہ آدمی کے اندر فخر اور برتری کے احساس کو بیدار کرتا ہے۔ اور فخر اور برتری کا احساس اصلاح کا قاتل ہے نہ کہ اس کا محرک۔

۷ ستمبر ۱۹۹۱

اسلام کے علمی مطالعہ کے سلسلہ میں بہت بڑا مسئلہ اختلاف کا ہے۔ میں نے اپنے مطالعہ میں پایا ہے کہ تقریباً تمام امور میں علماء اسلام کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عالم کے حوالے سے اپنی بات کہہ سکے۔

مثلاً ابن مسعود اور معوذتین کے مسئلہ کو لیجئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود معوذتین کو قرآن سے خارج سمجھتے تھے وہ ابن حجر عسقلانی کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح میں امام احمد اور امام ابن حبان کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو اپنے مصحف میں نہیں لکھتے تھے۔ اور جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں ان

کا کہنا ہے کہ محدث ابن حزم نے قدح المعلّی میں لکھا ہے کہ یہ ابن مسعود پر ایک الزام ہے اور یہ ایک موضوع قول ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو داخل مصحف نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح امام نووی مہذب کی شرح میں لکھتے ہیں کہ معوذتین کو داخل قرآن نہ سمجھنے کے بارہ میں ابن مسعودؓ کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر باطل ہے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۹۱

اصحاب رسول کا امتیازی مقام ان کے امتیازی عمل کی بنا پر ہے۔ ان کا یہ امتیازی عمل، ایک لفظ میں یہ تھا کہ انھوں نے ساتھ نہ دینے والے عمل کا ساتھ دیا۔

اصحاب رسول نے بے اعترافی کے حالات میں اعتراف کیا۔ انھوں نے ناقدری کے حالات میں قدردانی کی۔ انھوں نے التباس کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو پہچانا۔ انھوں نے بے عظمت چیز کو عظمت کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے وہاں بینا ہونے کا ثبوت دیا جہاں لوگ اندھے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں سچائی کی آواز سنی جہاں کان والوں کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۱

ایک مصری عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ الاخوان المسلمون کی فکر سے اتفاق رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ جمال عبد الناصر اور انور سادات دونوں پہلے اخوانی تھے۔ اور ان کے اجتماعات میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ پھر انقلاب (۱۹۵۲) کے بعد دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ناصر اور سادات دونوں یہودی جاسوس تھے۔ وہ جاسوس کے طور پر اخوانی جماعت میں شامل ہوئے تھے۔

اس جواب میں بظاہر ناصر اور سادات کے مخالفانہ کردار کی توجیہہ مل رہی ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ایک اور شدید تر مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اخوانی قیادت اتنی سادہ لوح تھی کہ وہ خطرناک جاسوسوں کو پہچان نہ سکی۔ حتی کہ انھیں جاسوسوں کے تعاون سے انھوں نے شاہ فاروق کو اقتدار سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ اور اپنی خوش فہمی کے تحت یہ سمجھتے رہے کہ شاہ فاروق کا ہٹنا یہودی مسئلہ کے حل کی

طرف مؤثر اقدام ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۱

دکتور عبد الحلیم عویس مصری سے میں نے پوچھا کہ آپ نے شیخ حسن البنا کو دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ وہ میری پیدائش سے سات سال پہلے شہید کئے جا چکے تھے۔ البتہ مصریوں کی زبان سے ان کی بابت بہت کچھ سنا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حسن البنا بہت خوش الحان تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں ہمیشہ قرآن دیر تک پڑھتے تھے۔ اکثر ان کا نصف وعظ قرآن کی تلاوت پر مشتمل ہوتا تھا۔ مصری ان کی تلاوت کو بہت رغبت سے سنتے تھے۔

اسی سے ملتا جلتا کیس کشمیر کے شیخ عبد اللہ کا ہے۔ شیخ عبد اللہ بہت خوش الحان تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اقبال کے اشعار خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے۔ اس کو سن کر کشمیری مسحور ہو جاتے۔ مذکورہ گفتگو سے میں نے سمجھا کہ کشمیر میں شیخ عبد اللہ کی مقبولیت کا جو راز تھا وہی راز مصر میں شیخ حسن البنا کی مقبولیت کا تھا۔ دونوں میں سے کسی کے یہاں کوئی گہری تفکیر نہیں تھی۔ البتہ حسن صوت میں دونوں کو وافر حصہ ملا تھا۔ اور یہی ان کی مقبولیت کا خاص سبب بنا۔

۲۱ ستمبر ۱۹۹۱

۱۱ ستمبر کو میں لاہور میں تھا۔ وہاں کرامت شیخ صاحب کے یہاں قیام تھا۔ وہ عرصے کویت میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کویت میں ایک قومی ترانہ بنایا گیا تھا جس کو تمام بچے گاتے تھے۔ اس کا ٹیپ کا بند یہ ہوتا تھا کہ ہم سب کویت کے لئے ہیں (کلنا لکویت) لاہور میں ایک بڑے تاجر کے یہاں ہمارا شام کا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد گفتگو کے دوران مذکورہ تاجر نے کہا: اگر کوئی شخص پاکستان کے خلاف بولے تو ہم اس کو مار ڈالیں گے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی عام حالت یہی ہے۔ وہ غیر خدا کے بارہ میں حساس ہیں، مگر وہ خدا کے بارہ میں حساس نہیں۔ انھوں نے کسی محسوس چیز یا کسی محسوس شخصیت کو غیر معمولی اہمیت دے دی ہے۔ اس کے خلاف وہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مگر خدا کے بارہ میں وہ عملاً بے حس بنے ہوئے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا

مذہب محسوس پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

۲۲ ستمبر ۱۹۹۱

لاہور کے سفر میں جناب مصطفیٰ صادق (مالک اور اڈیٹر روزنامہ وفاق) نے ایک کتاب دی۔ اس کا نام "نفاذ اسلام، منزل بہ منزل" ہے۔ اس میں وہ تمام انٹرویو چھاپے گئے ہیں جو موصوف نے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے لئے تھے۔ اس میں ایک سوال کے ذیل میں مصطفیٰ صادق صاحب نے کہا: ۱۹۷۱ میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے شوکتِ اسلام کے نام سے جلوس نکالے۔ اس میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوئے۔ شوکتِ اسلام کے اس جلوس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان انتخابات میں جیت جائے گی۔ مگر نتائج بالکل الٹے نکلے۔

میں نے کہا کہ جس زمانہ میں شوکت اسلام کا "عظیم الشان" جلوس نکالا گیا، میں الجمعیۃ ویکلی کا اڈیٹر تھا۔ میں نے الجمعیۃ میں لکھا تھا کہ اس قسم کے جلوسوں کی بھیڑ ہرگز اس بات کی علامت نہیں ہے کہ جماعت اسلامی الکشن میں جیت جائے گی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی شوکت اسلام کے جلوس کی بھیڑ کو دیکھ کر یہ بیان دے رہے تھے کہ جماعت اسلامی ۷۵ فیصد سیٹوں پر قبضہ کرلے گی۔ جب کہ میں نے الجمعیۃ میں لکھا تھا کہ جماعت اسلامی کو چند سیٹ سے زیادہ نہیں ملے گی۔ نتائج نے بتایا کہ میرا اندازہ صحیح تھا اور مولانا مودودی کا اندازہ غلط۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۱

کرامت شیخ صاحب لاہور کے ایک پوش علاقہ نیو گارڈن ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ یہاں ان کا بہت بڑا مکان ہے۔ ان کے مکان کے ایک طرف ایک اور مسلمان کا مکان ہے۔ دوسری طرف کا پلاٹ خالی ہے۔ مکان والے نے بڑھا کر اپنی دیوار بنالی ہے۔ خالی زمین پر ایک اور دادا قسم کا مسلمان ناجائز طور پر اپنا خیمہ ڈالے ہوئے ہے۔ وہاں وہ لوگوں کو جمع کرکے گندگی اور شور وغل کرتا رہتا ہے۔ مگر کرامت شیخ صاحب دونوں سے اعراض کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی سے نہیں الجھتے۔

میں نے پوچھا کہ آپ ان کے بارہ میں خاموش کیوں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم ان سے الجھیں تو وہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ بڑا مسئلہ پیدا کر دیں گے۔ اس لئے میں نے ان کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک یہی بات میں ہندستان میں مسلمانوں سے کہتا ہوں تو وہ الزام دیتے ہیں کہ تم بزدلی سکھا رہے ہو۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۱

الندوة العالمية للشباب الاسلامي (ریاض) کی طرف سے ایک مجلہ شہریہ اسلامیہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام المستقبل ہے۔ کل کی ڈاک سے اس کا شمارہ محرم ۱۴۱۲ھ ملا۔ اس کے صفحہ اول پر مسلم اقلیتوں پر ان مظالم کا ذکر ہے جو ان کے ملکوں میں ان کے اوپر ڈھائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک، اس کے بیان کے مطابق یہ ہے: عورتوں اور بوڑھوں اور بچوں کا قتل صرف اس گناہ کی بنا پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے (قتل النساء و الشيوخ و الاطفال بغير ذنب الا ان يقولوا ربنا الله) مسلم اقلیتوں کی تعداد اس وقت ساری دنیا میں تقریباً ۴۰ کروڑ ہے۔ اتنی بڑی تعداد اگر صرف اس بنا پر بدترین ظلم کا شکار بنائی جا رہی ہو کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتی ہے تو یہ اللہ کی غیرت کے خلاف ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ اتنی بڑی تعداد صرف اللہ کو اپنا رب کہنے پر ستائی جائے اور اللہ ان کی مدد نہ کرے۔ لوگ اپنی بات کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے اللہ کی بات غلط ثابت ہو رہی ہے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۹۱

جمال عبد الناصر نے ۱۹۵۲ میں فوجی انقلاب برپا کیا اور شاہ فاروق کو بے دخل کر کے مصر کے اقتدار پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے مصری دانشوروں کی میٹنگ میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے اس میں انسانیت اور اشتراکی پہلو کی تلاش کی جائے اور اس کے مطابق کتابیں لکھی جائیں۔ اس کے بعد مصری اہل قلم متحرک ہو گئے۔ انھوں نے اس اندازہ پر کتابیں لکھیں مثلاً انسانية محمد، شخصية محمد، اشتراكية محمد، نبي الانسانية،

محمد رسول الحریۃ ، وغیرہ۔

سیرت رسول پر موجودہ زمانہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر دو قسم کی ہیں۔ یا تو عقیدت اور ثواب کے لئے یا اپنے طے شدہ نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی سیرت کی کتابیں وقت کی ضرورت کو پورا نہ کرسکیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱

اردو کا ایک ماہنامہ "الفلاح" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ اگست ۱۹۹۱ کے اداریہ کی ابتدائی سطریں یہ ہیں: "فضا دھواں دھار ہے۔ تاریکی پھیل رہی ہے۔ تیرگی کی رات امنڈ رہی ہے۔ اور تاریکیوں کے نقیب ہر آن ظلمتوں کے چراغ جلا کر ظلمت میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں"۔ ایک اور ماہنامہ "الرشاد" کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ کے اداریہ کی پہلی سطر یہ ہے: اس وقت پوری دنیا میں مسلمان سیاسی طور پر جتنے بے وزن ہو گئے ہیں اس سے پہلے اتنے بے وزن کبھی نہ تھے"۔

آجکل مسلمانوں کے رسائل وجرائد کا یہی حال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے جرائد آخر کیوں جاری کئے جاتے ہیں جو صبح وشام اس قسم کے اعلانات کرتے ہیں۔ یہ جرائد اگر اپنا نام الخسران اور الضلالۃ رکھیں تو کم از کم انھیں اسم بامسمّیٰ ہونے کا کریڈٹ ملے۔ موجودہ حالت میں انھیں کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

۲۷ ستمبر ۱۹۹۱

بھوپال کے ایک صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی کہ دین اسلام کے نام پر کثرت سے تحریکیں چل رہی ہیں مگر لوگوں کے اندر خوف خدا اور فکر آخرت پیدا نہیں ہوتا جو دین اسلام کا اصل خلاصہ ہے۔

میں نے کہا کہ تحریک نام ہے کسی چیز کی اہمیت بتا کر لوگوں کو ابھارنے کا۔ اس وقت مسلمانوں میں جو دینی واسلامی تحریکیں چل رہی ہیں وہ خوف خدا والے دین کو ابھارتی ہی نہیں۔ پھر لوگوں میں خوف خدا کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

کوئی مسائل کی اہمیت بتا کر لوگوں کو ابھار رہا ہے۔ کوئی اکابر کی عظمت بیان کر رہا ہے

کوئی لوگوں کو تاریخ کے کارنامے سنا رہا ہے۔ کوئی اعمال کے فضائل بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ کوئی اسلامی نظام کی خوبیاں سنا کر متاثر کر رہا ہے۔ وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی چیز آدمی کی روح میں تھرتھری پیدا کرنے والی نہیں۔ روح میں تھرتھری اور قلب میں خوف کی کیفیت صرف خدا کی عظمت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس وقت مسلم دنیا میں کوئی بھی تحریک ایسی نہیں جو خدا کی عظمت کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہو۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۱

لاہور میں لوگوں نے بار بار اصرار کیا تھا کہ دوبارہ آپ لاہور کا پروگرام بنائیں۔ غور و فکر کے بعد اس سلسلہ میں میں نے جناب مصطفیٰ صادق کو ایک خط روانہ کیا ہے۔ انھیں لکھا ہے کہ دس لکچروں کی صورت میں ایک پروگرام بنایا جائے۔ لکچر کے موضوعات حسب ذیل تحریر کئے ہیں۔

۱. اسلامی فلسفہ ـــــــ طریق استدلال کا مسئلہ
۲. اسلامی تعلیمات کی سائنسی تصدیق
۳. جہاد اسوۂ رسول اور اسوۂ صحابہ کی روشنی میں
۴. اسلام دور جدید کا خالق
۵. غلبۂ اسلام کی منصوبہ بندی
۶. عہد حاضر عہد اسلام ہے
۷. دعوت الی اللہ : فتح مبین
۸. امت مسلمہ اور اتحاد
۹. عورت کا درجہ اسلام میں
۱۰ اسلام اکیسویں صدی میں

۲۹ ستمبر ۱۹۹۱

مولانا انیس لقمان الندوی نے بتایا کہ "تعبیر کی غلطی" کا صفحہ ۱۳۲ پڑھا تو انھوں نے میرے اس مطالبہ پر کہ مولانا مودودی کی طرف سے کسی جزئی تردید و تغلیط کو بھی وہ اپنے لئے

کلی تردید سمجھیں گے اور تعبیر کی غلطی کو شائع نہیں کریں گے۔ اس کو پڑھ کر انھوں نے اپنا تاثر اس طرح نوٹ کیا: موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پیش کش بتا رہی تھی کہ 'تعبیر کی غلطی' کا مصنف انتہائی سنجیدہ اور انتہائی سائنٹفک ذہن کا آدمی ہے۔ مگر مولانا مودودی نے اس کی قدر نہ کی۔ شاید صرف اس لئے کہ اس نے مولانا موصوف پر تنقید کر دی تھی۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۱

لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ بتاتے ہیں کہ آپ کو معراج ہوئی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے اوپر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور سب سے عجیب انعام یہ تھا کہ آپ کو ایک 'خیرامت' عطا کی گئی۔ ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بندی کے ذریعہ آپ کے لئے ایک قوم بنائی گئی جس کو مارگولیتھ نے بجا طور پر ہیروؤں کی قوم (a nation of heroes) بتایا ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو ہم عزت کے ساتھ اصحاب رسول کہتے ہیں۔ ایسی صفات والے لوگ نہ پہلے کبھی تاریخ میں پائے گئے اور نہ اس کے بعد۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۱

ہندستان کے ایک بزرگ عالم عرصہ سے مدینہ میں مقیم تھے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے دہلی آئے تو ہندستان کے مختلف مقامات سے لوگ ان کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ بزرگ کی زیارت کے لئے آپ لوگ دور دور سے چلے آرہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی درخت کی پتی کی بھی زیارت کی۔ کیا آپ نے کائنات میں خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے بھی کوئی سفر کیا۔ انھوں نے میرے الفاظ کو اس طرح سنا جیسے کہ میں کسی نامعلوم زبان میں بول رہا ہوں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو مخلوق کی عظمتوں میں گم ہوں مگر خالق کی عظمتوں کی انھیں کوئی خبر نہ ہو۔

۲ اکتوبر ۱۹۹۱

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بہت سے انقلابی مفکرین اٹھے ہیں۔ لاکھوں لوگ ان کی تقریروں اور تحریروں سے متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک اہل ایمان کا سب سے بڑا

کام یہ ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی حکومت قائم کریں۔ وہ اسلامی قانون پر مبنی نظام ظہور میں لائیں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کا نظام اگر بالفرض ظہور میں آجائے تب بھی وہ میرے نزدیک ایک بہت چھوٹا واقعہ ہوگا۔ سب سے بڑا واقعہ جو ایک مومن کے ذریعہ اس دنیا میں ظہور میں آتا ہے وہ نفسیاتی واقعہ ہے نہ کہ کوئی سیاسی واقعہ۔

ایک مومن نے اپنی آنکھ کھولی۔ اس نے کائنات میں خدا کی تجلی کو دیکھا۔ اس کے ذہن نے اس مشاہدہ کو ایک ربانی دریافت میں بدلا۔ اور پھر اس کی روح میں معرفت خداوندی کا سمندر موجزن ہوگیا۔ اس کی آنکھیں شدت احساس سے بہہ پڑیں۔ اس کی زبان پر حمد الٰہی کے کلمات جاری ہوگئے۔ اس قسم کے واقعہ کا ظہور میں آنا بلاشبہ نظام قائم کرنے کے واقعہ سے بے حساب گنا زیادہ عظیم ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس سب سے بڑی حقیقت کو جانتے ہوں۔ چھوٹی باتوں کو جاننے والے بے شمار ہیں مگر بڑی بات کو جاننے والا کوئی نہیں۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱

گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع تھا۔ اس میں آر کے پورم کے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ خوش تدبیری سے بات بنتی ہے۔ اور بد تدبیری سے بات بگڑ جاتی ہے۔ اس کی تائید کرتے ہوئے آر کے پورم کے ایک صاحب نے بتایا کہ آر کے پورم میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی مسجد تھی۔ اس کو اب ہم نے نئی تعمیر کرکے شاندار مسجد کی صورت میں بنالیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ مسجد کے احاطہ میں ایک بڑا پیپل کا درخت تھا۔ ہندو اپنے عقیدہ کے مطابق اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس کو ختم کرنا ایک بہت نازک مسئلہ تھا۔ غور وفکر کے بعد ہم نے یہ کیا کہ خاموشی سے رات کے وقت اس کی جڑوں میں تیزاب ڈال دیا۔ وہ درخت سوکھنے لگا، یہاں تک کہ سوکھ کر ختم ہوگیا۔ اس عمل کی تکمیل میں تقریباً تین سال لگ گئے۔ مگر مسئلہ اس طرح ختم ہوگیا جیسے کہ وہ تھا ہی نہیں۔

دوسری طرف اسی دہلی میں لال کنواں میں ایک پیپل ہے۔ وہ مدرسہ عبدالرب کی زمین پر اگ آیا ہے۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف ہنگامہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں فساد ہوا۔ مسلمان مارے

گئے اور پیپل بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ وہاں پولیس کی مستقل چوکی قائم کر دی گئی ہے جو رات دن اس کی حفاظت کرتی ہے۔ پیپل سے متصل ایک چھوٹا سا مندر بھی تعمیر ہوگیا ہے۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۱

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت آٹھ سو سال تک قائم رہی۔ القیروان کے اغالبہ نے نویں صدی عیسوی میں سسلی (صقلیہ) پر قبضہ کیا جو ۱۰۹۱ء تک باقی رہا۔ مسلمانوں نے ان علاقوں کو غیر معمولی ترقی دی۔ سابق حکمراں عوام کو ظالمانہ ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے دبائے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے اس بوجھ سے انھیں نجات دی۔ انھوں نے ان ملکوں کو زراعت اور باغبانی کے اعتبار سے ایک نئے دور میں پہنچا دیا۔ مسلمانوں نے یہاں ایسی صنعتیں قائم کیں جن کا نام بھی اہل یورپ نہیں جانتے تھے۔ مگر یہی ملک بعد کو مسلمانوں کے لئے مذابح بن گئے۔ مسلمانوں پر بدترین قسم کا ظلم کیا گیا۔ انھیں چن چن کر قتل کیا گیا۔ یہاں تک کہ اسپین اور سسلی مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جب ان ملکوں کو ترقی دی تھی تو ان ملکوں کے لوگ مسلمانوں کے اتنے زیادہ مخالف کیوں ہوگئے۔ اس کی وجہ قومی اور مذہبی نفرت کا جنون تھا۔ قومی اور مذہبی نفرت کا جنون اگر پیدا ہو جائے تو اس کے بعد انسان کو کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی۔ یہی بات ہندستان میں انگریزوں کے ساتھ پیش آئی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انگریزوں نے ہندستان کو غیر معمولی ترقی دی۔ مگر جب نیشنلزم کا ذہن پھیلا تو انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں میں اتنی نفرت پھیلی کہ وہ سب کچھ بھول گئے اور انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہ ہو سکے۔

۵ اکتوبر ۱۹۹۱

لاہور کے زمانۂ قیام میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے کچھ طلبہ اور ڈاکٹر میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی مسجد میں آپ کے خطاب کا پروگرام رکھا ہے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ اپنی تقریر میں میں نے آخرت اور جنت دوزخ کی باتیں کہیں۔ اس ضمن میں

جزئی طور پر میں نے کہا کہ اسلام اصلاً مبنی بر فرد دین ہے نہ کہ مبنی بر نظام دین۔

تقریر کے بعد ایک نوجوان نے سوال کی اجازت مانگی۔ اس کے بعد وہ کھڑے ہو کر پرجوش بلکہ اشتعال انگیز تقریر کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے بالکل بیکار باتیں کہیں۔ اسلام جہاد اور انقلاب کا دین ہے۔ آپ اس کو محض نماز روزہ کا دین بنا دینا چاہتے ہیں۔ وغیرہ۔

جب نوجوان اپنی اشتعال انگیز تقریر مکمل کر چکا تو میں نے کہا کہ میں نے جو کچھ بیان کیا اگر وہ غلط ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے مجھے معاف فرمائے اور آپ حضرات کے سینہ سے اسے محو کر دے۔ اور اگر میں نے صحیح کہا ہے تو مجھ کو اس پر جما دے اور آپ حضرات کا سینہ اس کو سمجھنے کے لئے کھول دے۔ اس کے سوا میں نے اور کوئی جواب نہیں دیا۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۱

ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت کو زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو منہدم کر دینے والی ہے۔ (أكثروا ذكر هادم اللذات الموت) مشکاۃ المصابیح / ۱ / ۵۰۴)

لذت در اصل انا کی تسکین کا نام ہے۔ اس تسکین کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً اپنے گرد و پیش مادی ساز و سامان جمع کر کے خوش ہونا۔ بڑائی کا درجہ پا کر خوش ہونا۔ کسی سے شکایت ہو جائے تو اس کو ذلیل اور برباد کر کے خوش ہونا۔ وغیرہ۔

جس آدمی کو حقیقی معنوں میں موت کا احساس ہو جائے اس کے اندر انا کا بت ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر چیز اس کی نظر میں ہیچ بن جاتی ہے۔ اس کے لئے سارا مسئلہ اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دنیا کی باتوں سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اس کی ساری توجہ آخرت کی طرف لگ جاتی ہے۔ موت کا تصور اس کے لئے پورے معنوں میں لذتوں کو ہدم کرنے والا بن جاتا ہے۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۱

لطیفہ بیگم (اوکھلا، دہلی) ایک دردمند مسلم خاتون ہیں۔ وہ اوکھلا کے علاقہ میں

بچوں کا ایک اسکول چلا رہی ہیں۔ فی الحال وہاں آٹھویں درجہ تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کے اسکول میں تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ آئے تاکہ بچوں کو دین کی باتیں بتائیں۔ انھوں نے بچوں کو جمع کرنا چاہا مگر بچے اِدھر اُدھر بھاگنے اور چھپنے لگے۔ خاتون نے سبب پوچھا تو کسی بچہ نے کہا کہ اللہ میاں کی پولیس آئی ہے۔ خاتون نے کہا کہ آج اللہ میاں کی پولیس انسان کی صورت میں آئی ہے تو تم بھاگ رہے ہو۔ ایک روز اللہ میاں کی پولیس فرشتہ کی صورت میں آئے گی، اس وقت تم کیا کروگے۔ کیوں کہ وہ وقت ایسا ہوگا کہ تم بھاگنا چاہو گے تو تمہارے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

۸ اکتوبر ۱۹۹۱

فلسطینی مہاجرین مغربی جرمنی سے اپنا ایک ماہوار پرچہ عربی میں نکالتے ہیں۔ اس کا شمارہ جولائی ۱۹۹۱ مجھے تاخیر سے اب ملا ہے۔ اس کے صفحہ ۸ پر ایک مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: مگر فلسطینیوں کے لئے کوئی رونے والا نہیں (ولکن الفلسطینی لا بواکی لہ)

یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان تقریباً بلا استثناء فلسطینیوں کے لئے گریہ کناں ہیں۔ مجلسیں، اجتماعات، اخبار و رسائل سب فلسطین کے تذکروں سے معمور ہیں۔ فلسطین کے محاذ پر جان و مال کی قربانی اتنی زیادہ دی گئی ہے جو صلیبی جنگوں کی مجموعی قربانی سے بھی زیادہ ہے۔ وغیرہ

جہاں تک عمل کا تعلق ہے، وہ فلسطین کے محاذ پر مسلسل جاری ہے۔ البتہ اس کا مطلوبہ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ فریاد بے معنی ہے کہ فلسطین کے لئے کوئی رونے والا نہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ فلسطین کے بارہ میں جو طریق عمل اختیار کیا گیا اس پر نظر ثانی کی جائے۔ کیوں کہ جو چیز مفقود ہے وہ عمل نہیں ہے بلکہ نتیجۂ عمل ہے۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۱

۸ اکتوبر کو میں روم میں تھا۔ ڈاکٹر لیونارڈ کی مدد سے میں نے ویٹیکن اور روم کا زیر تعمیر اسلامک سنٹر دیکھا۔ ڈاکٹر لیونارڈ نے نہایت دلچسپی اور مکمل تعاون کے ساتھ دونوں مقامات دکھائے۔ اس کے برعکس جب میں اسلامک سنٹر پہنچا تو وہاں کے لوگوں میں کوئی جوش

نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ میں نے اسلامک سنٹر کا تعارف نامہ مانگا تو ان کے پاس مجھے دینے کے لئے کوئی تعارف نامہ بھی موجود نہ تھا۔

اس فرق کی وجہ غالباً دعوتی ذہن ہے۔ مسیحی حضرات میں دعوتی ذہن ہے، اس لئے وہ دوسرے انسان کی رعایت کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں دعوتی ذہن نہیں۔ اس لئے ان کے اندر دوسرے انسانوں کے لئے کوئی جوش نہیں پایا جاتا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱

چند دن مالٹا میں گزرے۔ مالٹا میں لیبیا کی مدد سے ایک بہت بڑا اسلامک سنٹر قائم کیا گیا ہے۔ تعمیری اعتبار سے وہ کافی شاندار ہے۔ مگر وہاں کوئی دعوتی یا تعمیری کام نہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک سنسان سی عمارت نظر آئی۔ مرکز سے تعلق رکھنے والے چند ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شکایت کی کہ مالٹا کی حکومت انھیں پسند نہیں کرتی اور ان کو کوئی تعاون نہیں دیتی۔

میرا قیاس ہے کہ اپنی عادت کے مطابق، یہ لوگ وہاں کی سیاست میں غیر ضروری دخل دیتے ہیں۔ اس لئے مالٹا والوں میں غیر مطلوب ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتی کام کے لئے سیاست سے علیحدگی انتہائی ضروری ہے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱

آج میں قاہرہ میں تھا۔ قاہرہ میں مجھے ہر طرف پسماندگی کی چھاپ نظر آئی۔ مصر کے پاس نہایت قیمتی وسائل تھے۔ مگر نام نہاد ثورہ کے بعد جمال عبدالناصر اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے عالمی قیادت حاصل کرنے کے شوق میں اس کے تمام وسائل کو برباد کر ڈالا۔ تقریباً یہی حال انڈیا کا بھی ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱

بخاری (کتاب الاطعمة) کی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ابن حجر العسقلانی لکھتے ہیں: قال النووی اجمع العلماء على استحباب التسمية على الطعام في اوله وفي نقل الاجماع على الاستحباب نظر (فتح الباری ۹/۴۳۲)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "اس پر علمار کا اجماع ہے"؛ یہ جمہور کا قول ہے"؛ جیسے الفاظ اتنے حتمی نہیں ہوتے جیسا کہ عام لوگ اس کو سمجھ لیتے ہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۱

کوئی چیز جب اپنی آخری حد پر پہنچ جائے تو اس کے بعد وہ پیچھے کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ دنیا کا قانون ہے۔ ایک شخص غصہ ہو کر آپ کو گالی دینے لگے تو آپ چپ ہو جائیے۔ آپ کا چپ ہونا اس کے غصہ کو حد تک پہنچنے میں مددگار ہو جائے گا۔ اگر آپ چپ کی حکمت اختیار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آخر کار اس کا غصہ شرمندگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ اپنی حد کو پہنچ کر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱

صحیح بخاری (کتاب الاطعمۃ) میں عمر بن ابی سلمہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں غلام تھا، اس وقت میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے پر بیٹھا۔ کھانا ایک بڑے پیالہ میں رکھا ہوا تھا۔ میں ہر طرف سے لے لے کر کھانے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لڑکے، بسم اللہ کہو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور جو قریب ہو اس کو کھاؤ۔ اس کے بعد یہی میرا کھانے کا طریقہ بن گیا (فما زالت تلك طعمتي بعدُ) فتح الباری ۹ / ۴۳۱

مذکورہ نوجوان کو کوئی شخص آغاز میں دیکھتا تو کہتا کہ یہ بڑا اَن گھڑ لڑکا ہے، اور اس کی اصلاح ہونے والی نہیں۔ مگر بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس کے اندر نصیحت پذیری کا مادہ تھا۔ چنانچہ ابتدائی دور کا غیر مہذب نوجوان ہمیشہ کے لئے ایک مہذب نوجوان بن گیا۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے بارہ میں کبھی مایوسانہ رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱

قاہرہ میں عرب نوجوانوں سے ملاقات کے ایک پروگرام میں میں نے کہا کہ ماضی قریب میں مسلمانوں کے درمیان احیار نو کی جو تحریکیں اٹھیں یا آج جو تحریکیں ان کے درمیان چل رہی ہیں

وہ سب کسی نہ کسی اعتبار سے قومی جوش کو ابھار کر مسلمانوں کو اسلام کے راستہ پر لگانا چاہتی ہیں۔ مگر اس سے کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے دوبارہ اسلام کو اکتشاف بنایا جائے۔ وہ ازسرِنو اسلام کو دریافت کریں۔ اس قسم کا ایمان پیدا کرنے کے بعد ہی ان کے درمیان کوئی حقیقی کام وجود میں آسکتا ہے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱

سوال یہ نہیں ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کس لئے کھڑے ہیں۔ مسجد میں کھڑا ہونا بھی غلط ہو سکتا ہے اور کوڑے خانہ پر کھڑا ہونا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں کہا گیا ہے کہ الاعمال بالنیات۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱

میں قاہرہ ایرپورٹ پر اترا تو وہاں میرے ایک واقف کار مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے آپ کو میرے یہاں چلنا ہوگا۔ ہماری گاڑی ایک دس منزلہ عمارت کے سامنے رکی جس کی آخری منزل پر مذکورہ عرب عالم کا مکان تھا۔ اس عمارت کے نیچے گراؤنڈ فلور پر ایک مصری کی پھلوں کی دکان تھی۔ جیسے ہی ہم گاڑی سے باہر آئے وہ مصری کیلا لیکر آگیا اور چھیل چھیل کر ہم کو دینے لگا۔ ہم لوگ ۴ آدمی تھے، ہر ایک کو اس نے اسی طرح ایک ایک کیلا دیا۔

دہلی واپس آنے کے بعد میں نے اس واقعہ کا ذکر ایک ہندستانی سے کیا۔ وہ قاہرہ میں کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ عربوں کے حسن اخلاق کا پہلا تجربہ تھا جو مجھ کو قاہرہ پہنچ کر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں مصریوں کو جانتا ہوں۔ یہ حسن اخلاق نہیں، حسن فروخت تھی۔ آپ کے میزبان سے انھوں نے اس کا پیسہ وصول کرلیا ہوگا۔

میں نے سوچا کہ اس دنیا میں تعبیری اختلاف کی کتنی زیادہ گنجائش ہے۔ ایک ہی واقعہ جو مجھ کو اخلاق کا معاملہ نظر آتا ہے وہ دوسرے کی نظر میں تجارت کا واقعہ بن جاتا ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۱

ڈاکٹر ظفر الاسلام نے بتایا کہ بیروت کے ایک اخبار کے اڈیٹر سلیم اللوذی نے اپنے اخبار میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: لماذا یکذب النظام (حکومت جھوٹ کیوں بولتی ہے) اس سے

مراد شام کے صدر حافظ الاسد تھے۔ اس پر حافظ الاسد اتنے برہم ہوئے کہ اڈیٹر کو قتل کروادیا۔ حافظ الاسد کے آدمیوں نے گھات لگا کر اس کو پکڑا اور جنگل میں لے جا کر اس کے ایک ایک عضو کو کاٹ کر سخت تعذیب کے ساتھ اس کو مار ڈالا۔

یہ ایک بدنام شخص کا قصہ ہے۔ مگر خوش نام اکابر بھی میرے نزدیک اس سے مختلف نہیں۔ اس کی زندہ مثال میں خود ہوں۔ میں نے جن زندہ اکابر پر تنقید کی وہ اور ان کا پورا حلقہ میرے خلاف جھوٹے الزامات کا طوفان اٹھائے ہوئے ہے۔ میری عزت وآبرو کو انھوں نے حلال کر رکھا ہے۔ مجھ کو مباح الدم قرار دینے کی طاقت ان کے پاس نہیں۔ تاہم انھوں نے مجھ کو مباح العِرض یقیناً قرار دے دیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ جرم کسی بھی اعتبار سے مذکورہ جرم سے کم ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۱

نظام الدین احمد صاحب، بمبئی (فون نمبر 6127648) ایک ریٹائرڈ افسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کئی مہینے ایسا کیا کہ بمبئی کی مختلف مسجدوں میں جمعہ کی نماز پڑھی تاکہ ہر مسجد کا حال معلوم کروں۔ میں نے پایا کہ مسجدیں تعمیر کے اعتبار سے تو خوب شاندار ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے غیر شاندار۔ ان کے الفاظ میں ـــــــ مسجد بڑی اور امام چھوٹا۔

یہ حال صرف مسجد کا نہیں بلکہ موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم اداروں کا ہے۔ ہر جگہ در و دیوار میں ترقی ہو رہی ہے۔ مگر وہاں جو انسان ہیں وہ اپنے فکر اور اپنے کردار سے پست نظر آتے ہیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۱

نظام الدین صاحب بمبئی ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں۔ انھوں نے تقسیم سے پہلے کا زمانہ دیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے مسلمانوں کے ذہن پر جن مسائل کا غلبہ تھا، ان میں سے ایک لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ تھا جس پر سکھوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اس کو گرودوارہ کہنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں مسٹر جناح نے کہا کہ مجھ کو پاکستان دو اور میں تم کو مسجد شہید گنج دے دوں گا:

Give me Pakistan and I will give you Masjid Shaheedganj.

ستمبر ۱۹۹۱ میں میں نے لاہور کا سفر کیا۔ وہاں میں نے مسجد شہید گنج دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ آج بھی

وہ مسجد نہیں ہے۔ آج بھی وہاں گوردوارہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ الفاظ میں اور حقیقت میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۱

یہودیوں کے مذہبی الفاظ میں ایک لفظ مشناہ ہے۔ یہ عبرانی زبان سے آیا ہے۔ یہود کے یہاں یہ لفظ قدیم اسرائیلی روایت کے مجموعہ کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ہر قسم کی صحیح اور غلط چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ چوں کہ مشناہ اور سنہ میں صوتی مناسبت ہے اس لئے کچھ مستشرقین نے یہ کہہ دیا کہ مسلمانوں نے مشناہ کی تعریب کرکے سنہ کا لفظ بنالیا ہے۔

مگر اس قسم کا نظریہ قائم کرنے کے لئے صرف صوتی مناسبت کافی نہیں ہے۔ اس کے فیصلہ کی اصل بنیاد لغت ہے۔ لغات اور قدیم کلام کی تحقیق سے دیکھا جائے گا کہ سنۃ کا لفظ اصلاً عربی لفظ ہے یا وہ یہودی روایات سے آیا ہے۔ اگر صوتی مناسبت کو فیصلہ کی بنیاد بنایا جائے تو ایک شخص کو ہم یہ کہنے سے نہیں روک سکتے کہ شیکسپیر اصل میں ایک مسلمان تھا اور اس کا نام شیخ پیرو تھا۔ شیخ پیرو کو انگریزی میں شیکسپیر بنالیا گیا۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۱

مسلم سلطنت کے زمانہ میں مسلمانوں نے سکھوں سے جنگ کی۔ سکھ سردار مارے گئے۔ پھر ۱۹۴۷ کے زمانہ میں پاکستانی علاقہ سے سکھوں کو مار کر نکالا گیا۔ مگر آج سکھوں اور مسلمانوں میں کوئی عداوت نہیں۔ دونوں کے درمیان آج نارمل تعلقات ہیں۔ ہندوؤں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مسلم سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں سے بھی لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۹۴۷ کے زمانہ میں پاکستانی علاقہ میں ہندوؤں کے ساتھ ظلم ہوا۔ مگر یہاں اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ آج بھی ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں نے سکھوں سے کوئی رقابت (rivalry) قائم نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ماضی کی یاد ان کے ذہنوں سے نکل گئیں۔ دوسری طرف ہندوؤں سے مسلمانوں نے طرح طرح کی رقابتیں قائم کر رکھی ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی قصہ ان کے درمیان چھڑ جاتا ہے اسی بنا پر کشیدگی یہاں زندہ ہے۔ مثلاً بابری مسجد جیسے کیس پنجاب

میں بھی کثرت سے ہیں۔ یہاں مسلمانوں نے اس قسم کی کوئی تحریک نہیں اٹھائی جیسی تحریک بابری مسجد کے لئے اٹھائی گئی۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۱

خوشی کی حالت بھی آدمی کے ذہن کو متحرک کرتی ہے اور غم کی حالت بھی۔ مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ خوشی آدمی کے دماغ کو انٹرسٹ کے رخ پر متحرک کرتی ہے اور غم آدمی کے دماغ کو اصولی باتوں کی طرف متحرک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش رہنے والا آدمی ظاہری حقائق کو خوب جانتا ہے مگر وہ گہرے حقائق سے بے خبر رہتا ہے۔ دوسری طرف غم پسند آدمی ظاہری حقائق سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ البتہ گہرے حقائق کی معرفت اس کو دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱

مسٹر چندر شیکھر مانٹو سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے کہا کہ کوئی بات جو آپ نے پڑھی ہو بتائیے۔ انھوں نے پنجاب کیسری کی ایک بات بتائی جو چنڈی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۱ کو دسہرہ تھا جب کہ ہندو نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہر جگہ راون کا پتلا جلاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب کیسری نے اپنے ۱۸ اکتوبر کے شمارہ میں لکھا تھا "راون کو جلانا ہے تو پہلے رام بنئے"۔

یہی بات مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے۔ مسلمان ہر سال نہایت دھوم کے ساتھ میلاد النبی کے جلسے کرتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ میلاد النبی اور سیرت رسول کا جلسہ کرنا ہے تو پہلے رسول کو اپنی زندگی کے لئے اسوہ بنائیے۔ رسول کو اپنے لئے اسوہ نہ بنانا اور رسول کے نام پر جلسے کرنا محض ایک قومی ہنگامہ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۱

صحافت کی ایک اصطلاح بریکنگ نیوز (breaking news) ہے۔ ایک اخبار معمول کے مطابق مرتب کیا جا چکا ہے۔ اور اب پریس میں چھپنے کے لئے بھیجا جانے والا ہے۔ اچانک آخر وقت میں یہ خبر آتی ہے کہ وزیر اعظم کو گولی مار دی گئی۔ تو اس کے بعد اخبار کے صفحہ اول کو فوری طور پر بدل دیا جائے گا اور وزیر اعظم کے قتل کو پہلی نمایاں خبر کے طور پر شائع

کیا جائے گا۔ اس قسم کی خبر کو اخبار کی زبان میں بریکنگ نیوز کہا جاتا ہے۔

سب سے بڑی بریکنگ نیوز قیامت کے آنے کی ہوگی جس کو قرآن میں النبأ العظیم کہا گیا ہے۔ موجودہ قسم کی بریکنگ نیوز صرف اخبار کے صفحہ کو بدلتی ہے۔ مگر قیامت کی بریکنگ نیوز پوری زندگی اور سارے عالم کا نقشہ بدل دے گی۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱

مولانا عبداللہ طارق صاحب (نظام الدین) کو زندگی کے بہت سے تجربات ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک تجربہ ان لفظوں میں بیان کیا: کسی کام کو انجام دینے کے لئے جس قدر علمی صلاحیت کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ اس عملی صلاحیت کی ضرورت ہے جس سے آدمی موانع راہ پر قابو پاسکے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۱

محمد تاج الدین راج (پیدائش ۱۹۶۷) اس وقت بی ایس سی (ایگریکلچر) کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۵ میں ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دو سال تک وہ زیر علاج رہے۔ پڑھائی چھوٹ گئی۔

اس حادثہ کے بعد وہ سخت مایوس ہوگئے۔ انھوں نے سمجھا کہ اب میں تعلیم حاصل نہیں کرسکتا۔ میری زندگی ختم ہوگئی۔ اسی درمیان ان کو الرسالہ ملا۔ اس میں انھوں نے پڑھا کہ عذر کو عذر نہ بناؤ۔ آدمی کا ماضی اور حال تباہ ہوجائے تب بھی اس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے۔ اس قسم کی باتوں سے ان کے اندر نیا عزم اور حوصلہ پیدا ہوگیا۔ انھوں نے داخلہ لیا۔ وہ فرسٹ آئے اور پھر انھیں بی ایس سی (ایگریکلچر) میں داخلہ مل گیا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ الرسالہ نے مجھے وہ چیز دے دی جو کسی اور نے مجھ کو نہیں دی تھی۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے خلاف آجکل بہت مضامین اور کتابیں چھپ رہی ہیں۔ ہر جگہ آپ کے خلاف پروپگنڈا کیا جارہا ہے اور آپ خاموش ہیں۔ آپ کوئی

جوابی کارروائی نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے عربی کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

قیل انّ الالٰہ ذو ولد — قیل انّ الرسول قد کہنا

ما نجا اللّٰہ والرسول معا — من لسان الوریٰ فکیف انا

۲۹ اکتوبر ۱۹۹۱

کسی بزرگ کا قول ہے کہ میرا سب سے اچھا دوست وہ ہے جو مجھ کو میری غلطیاں بتائے (ابن الصدیق الی الذی یھدی الیّ اخطائی) ان کو الفاظ کی زبان سے ادا کرنا انتہائی آسان ہے مگر ان پر واقعۃً عمل کرنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱

موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کی مشترک غلطی یہ ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ فرض کر لیا کہ امت مسلمہ پہلے سے موجود ہے۔ اب ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس موجود ملت کو کسی نہ کسی طرح جوش دلا کر اس کو کھڑا کر دیا جائے۔

مگر یہ اندازہ ہلاکت خیز حد تک غلط تھا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ مسلمان ایک زوال یافتہ قوم کی سطح پر پہنچ چکے تھے۔ ایسی حالت میں کرنے کا اصل کام صرف یہ تھا کہ اس قوم کو از سر نو ایک زندہ ملت بنا دیا جائے۔ اس کے افراد میں دوبارہ ایمانی شعور اور ربانی اسپرٹ کا طوفان پیدا کیا جائے۔ اس ابتدائی کام کے بغیر اقدام صرف خودکشی کے ہم معنی تھا۔ مگر ہر ایک نے یہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کا اقدام امت کے حق میں صرف خودکشی کی چھلانگ ثابت ہوا۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۱

۱۹۴۷ میں اقوام متحدہ کے رزولیوشن نمبر ۱۸۱ کے تحت اسرائیل کا قیام وجود میں آیا تو سوویت یونین اس کے حامیوں میں سے تھا۔ روس نے فوراً اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے۔ اسرائیل میں باہر سے آکر جو یہودی آباد ہوئے ان میں اکثریت روس کے یہودیوں کی تھی۔ ۱۹۵۲ میں روس نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات توڑ لئے تھے۔ اس کی وجہ فلسطینیوں سے ہمدردی نہیں تھی۔ بلکہ فروری ۱۹۵۲ میں تل ابیب کے روسی سفارت خانہ میں بم پھٹا تھا۔ اس پر غصہ ہو کر روس نے اپنا سفیر واپس بلا لیا تھا۔ اگرچہ ابھی فلسطین کا مسئلہ حل نہیں ہوا ہے مگر اکتوبر

۱۹۹۱ میں روس نے دوبارہ اسرائیل سے اپنا سفارتی تعلق قائم کرلیا ہے۔ اسرائیل میں روسی یہودی اتنے زیادہ ہیں کہ اسرائیل کی سکنڈ لینگویج روسی زبان ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمال عبد الناصر اور یاسر عرفات کا فلسطینی مسئلہ کے حل کے لئے روس سے امیدیں قائم کرنا کتنا احمقانہ تھا۔ روس کبھی بھی اس معاملہ میں عربوں کا ساتھی نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بنا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۹۱

مولانا فرید الوحیدی (حال مقیم جدہ) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ سعودی عرب میں بڑی تجارت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۳۱ اکتوبر کو انتہا پسند بڑی تعداد میں اجودھیا میں گھس گئے۔ انھوں نے بابری مسجد کی چہار دیواری توڑ ڈالی۔ مسجد کے تینوں گنبدوں پر اپنا بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ آج کے تمام اخباروں کے صفحہ اول کی یہ اہم ترین خبر ہے۔ مسلمانوں کے سابقہ مزاج کے تحت میں سمجھتا تھا کہ آج ضرور جگہ جگہ فساد ہوگا۔ مگر سارے ملک میں کہیں سے بھی جلوس یا فساد کی خبر نہیں آئی۔

پھر انھوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ الرسالہ کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ مشن نے لوگوں کی سوچ میں نمایاں تبدیلی کی ہے۔ اب وہ برداشت اور اعراض کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں۔

۲ نومبر ۱۹۹۱

امام الشافعی کا مشہور قول ہے کہ جب میرا قول سنت کے مخالف ثابت ہو جائے تو اس وقت میرے قول کو دیوار پر مار دو (اذا ظهر في قولي ما يخالف السنة فاضربوا بقولي عرض الحائط حينئذ)

موجودہ زمانہ میں ہر عالم اس قول کو مانتا ہے۔ مگر جب اس قول کی زد خود اس کی ذات پر پڑے تو وہ فوراً اس کا انکار کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قول میں توجیہہ کی بے حساب گنجائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر اپنی غلطی کو ماننے کا جذبہ نہ ہو تو اس کے خلاف خواہ کتنی

ہی دلیل دی جائے وہ اپنے قول کی توجیہہ کرتا رہے گا، وہ اپنی تصحیح کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوگا۔

۳ نومبر ۱۹۹۱

بخاری اور مسلم میں یہ روایت ہے کہ تم اپنے آپ کو ظن سے بچاؤ۔ کیوں کہ ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے (إياكم والظن فان الظن أكذب الحديث) ظاہر الفاظ کے اعتبار سے دیکھئے تو ہر قسم کا ظن ممنوع قرار پاتا ہے۔ مگر شارحین حدیث نے صراحت کی ہے کہ حدیث میں جو چیز ممنوع ہے وہ حسن ظن نہیں ہے بلکہ سوء ظن ہے (ان النهي ليس عن كل الظن وانما النهي عن سوء الظن) یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام خواہ بظاہر مطلق الفاظ میں ہو، مگر اس کا مفہوم اکثر اوقات مطلق نہیں ہوتا۔

۴ نومبر ۱۹۹۱

۴ نومبر کو میں پونہ میں تھا۔ وہاں انعام دار صاحب ایک بلڈر ہیں۔ انھوں نے وقف کی ایک جائداد کو لے کر اس کے اوپر تعلیمی ادارہ بنانے کا ارادہ کیا۔ نقشہ یہ تھا کہ کئی منزلہ عمارت بنا کر اس کے اندر مختلف تعلیمی کلاس چلائیں گے۔ اس دوران وہ رقم حاصل کرنے کے لئے دبئی گئے۔ وہاں وہ شیخ کے یہاں پہنچے تو چندہ مانگنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ان کو بھی قطار میں بٹھا دیا گیا اور باری آنے پر دوسروں کی طرح انھیں ایک معمولی رقم دے دی گئی۔

انعام دار صاحب نے اس تجربہ کے بعد طے کیا کہ وہ چندہ کا طریقہ ختم کر دیں۔ انھوں نے مجوزہ عمارت کا پورا حصہ کرایہ پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح لوگوں سے بڑی رقم بطور ایڈوانس حاصل کی اور اس سے بلڈنگ تیار کی۔ اب اوپر کی منزلوں میں تعلیمی ادارے ہیں اور نیچے کے تمام حصے کرایہ پر ہیں۔ جن سے ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ کرایہ آئے گا۔

اس تبدیلی پر کچھ ممبران نے مخالفت کا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ پہلے پوری عمارت تعلیم میں لینے کا منصوبہ تھا۔ پھر آپ نے اس کے نیچے کے حصوں کو کرایہ پر کیوں دے دیا۔ میں نے مخالفین سے کہا کہ آپ اتنی سی بات پر مخالفت کا جھنڈا اٹھا رہے ہیں۔ صحابہ کرام نے اس سے بہت زیادہ بڑے قسم کے اختلافات کو برداشت کیا۔ اس کے بعد ہی اسلام کی تاریخ بن سکی۔

۵ نومبر ۱۹۹۱

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی کرے گا (ان اللہ لیؤید ھٰذا الدین برجل فاجر)

مسجد قریش میں نماز سے پہلے میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک میرے ذہن میں آیا کہ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ہے۔ فاجر آدمی ہمیشہ اپنے انٹرسٹ پر چلتا ہے۔ اگر وہ ذاتی انٹرسٹ کے بغیر کام کرنے لگے تو وہ فاجر نہ رہے بلکہ مخلص بن جائے۔ اس نکتہ کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس حدیث میں مستقبل کے اس دور کی طرف اشارہ ہے جبکہ "دین" کے اندر دنیوی فائدہ کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ جب امت کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کی بنیاد پر قیادت مل سکے گی۔ جب مسجد اور مدرسہ کے کام میں تجارتی پہلو شامل ہو جائے گا۔ جب دین کے نام پر عہدے اور مناصب کا ملنا ممکن ہو جائے گا۔ جب یہ نوبت آئے گی تو فاجر شخص بھی دین کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ دین کی راہ سے بھی اس کو وہی مادی نفع ملے گا جس کو وہ صرف دنیا سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

۶ نومبر ۱۹۹۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔ اور اگر تم اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اور عورت کے اندر ٹیڑھ ہے (المرأة كالضلع. ان اقمتها كسرتها وان استمتعت بها استمتعت) البخاری، کتاب النکاح، باب المداراۃ مع النساء۔

خیال آیا کہ اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ مخصوص طور پر صرف عورت سے متعلق نہیں۔ بلکہ وہ فطرت کا ایک قانون ہے جو ہر ناپسندیدہ صورت حال پر چسپاں ہوتا ہے۔

اس دنیا میں اکثر اوقات آدمی کے لئے دو میں سے ایک کا انتخاب (چوائس) رہتا ہے مگر وہ تیسرے انتخاب کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ مثلاً پسلی کے معاملہ میں آدمی کو ٹیڑھی پسلی اور سیدھی پسلی میں چوائس نہیں ہے بلکہ ٹیڑھی پسلی اور ٹوٹی پسلی میں چوائس ہے۔ یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔

۷ نومبر ۱۹۹۱

دہلی سے مسلمانوں کا ایک ماہنامہ التوعیہ کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ نومبر ۱۹۹۱ کے اداریہ کا ایک پیرگراف یہ ہے: "اورنگ زیب پر جو مندر کی تباہی کا الزام ہے وہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر نہیں تھا۔ اس کا سبب سیاسی تھا۔ ان مندروں میں سلطنت مغلیہ کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں۔ اور اگر ان کا تدارک نہ کیا جاتا تو سلطنت کا وجود خطرہ میں پڑ سکتا تھا۔ اس لئے اورنگ زیب کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔ بالکل اسی طرح جیسے سنت بھنڈراں والے کی شورش سے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے اندرا گاندھی کو امرتسر کے سورن مندر پر یلغار کرنا پڑی۔ اندرا گاندھی کے اس اقدام کو کوئی بھی مذہبی تعصب کی کارروائی نہیں بتاتا" صفحہ ۶

سیاسی سبب سے کسی شخص کو گرفتار کرکے اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ مگر سیاسی سبب سے کسی مندر کو ڈھاکر وہاں مسجد بنانا سراسر غلط اور غیر اسلامی فعل ہے۔ اندرا گاندھی کی مثال بھی درست نہیں۔ کیوں کہ اندرا گاندھی نے امرتسر کے گوردوارہ میں صرف ہتھیاروں کی تلاش کرائی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ سکھ گوردوارہ کو ڈھاکر اس کی جگہ ایک ہندو مندر کھڑا کر دے۔

۸ نومبر ۱۹۹۱

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے ہندی زبان میں ایم اے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ہندوؤں میں دعوت کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو وہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی سازشوں کی تفصیل بتانے لگے۔ ان کے لفظ لفظ سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ دعوت اور نفرت ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ آپ پہلے اپنے دل سے ہندوؤں کی نفرت ختم کیجئے۔ اس کے بعد ہی آپ ہندوؤں کے درمیان دین حق کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرسکتے ہیں۔

۹ نومبر ۱۹۹۱

۹ نومبر کو میں بمبئی میں تھا۔ بمبئی کے لئے میرا پہلا سفر ۱۹۴۲ یا ۱۹۴۳ میں ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ میں حق کی تلاش میں تھا اور دیوانگی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتا

پھرتا تھا۔ اب پچاس برس بعد میں بمبئی گیا تو میں حق کو دریافت کرچکا تھا اور میرے پاس ایک واضح پیغام تھا جس کو میں دوسروں کے سامنے پیش کرسکوں۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۷ جنوری ۱۹۹۰) کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکہ کے صدر جارج بش نے کہا تھا کہ امریکہ اب واحد سپر پاور ہے۔ امریکہ خلیج کی جنگ میں فتح پاکر ویت نام کے ڈراونے خواب (Vietnam syndrome) سے نجات پاچکا ہے۔ اور اب آنے والے دور کا نام امریکہ کی صدی (American century) ہوگا۔

مسلم دانشوران الفاظ سے بھڑک اٹھتے ہیں اور منفی ذہن کے تحت امریکہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ایک مثبت اثر لینے کا موقع بھی موجود ہے۔ امریکہ اپنے نظریہ کے تحت امن امریکہ (Pax Americana) کا دور لانے کے لئے عالمی سطح پر مواصلاتی ذرائع پھیلا رہا ہے۔ مسلمان اگر داعیانہ انداز سے سوچیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ یہ ان کے لئے ایک انتہائی نادر موقع ہے۔ جدید مواصلاتی نظام وہ خود قائم نہیں کرسکتے تھے۔ امریکہ نے اپنی طرف سے اس کو قائم کردیا۔ اگر اس کو ہوش مندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اگلی صدی امریکی صدی نہ ہو بلکہ وہ اسلامی صدی بن جائے۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۱

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے سوویت روس کے مقابلہ میں جو جنگی حکمت عملی اختیار کی اس کا ایک خاص جزء وہ تھا جس کو اصول مزاحمت (strategy of deterrance) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی برتر قوت کا حصول جس کی ہولناکی کو محسوس کرکے دشمن اپنے جارحانہ اقدام سے باز رہے۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی طریق جنگ ہے جس کو قرآن میں قوت مرہبہ کا حصول کہا گیا ہے۔ (الانفال ۶۰)

۱۲ نومبر ۱۹۹۱

دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا میں برطانیہ کی عالمی بالادستی جس کو خوبصورت طور پر پیکس برٹانیکا (Pax Britannica) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد پیکس امریکانا (Pax Americana) کا

دور شروع ہوا جو سوویت یونین کے زوال کے بعد زیادہ نمایاں طور پر قائم ہو گیا ہے۔

پچھلے دو سو سال سے مسلمانوں کے اوپر جہادی ذہن چھایا ہوا تھا۔ وہ جہاد (بمعنی قتال) کے ذریعہ اسلام کے غلبہ کے دور کو واپس لانا چاہتے تھے۔ اب خلیج کی جنگ کے بعد بظاہر مسلمانوں کے لئے کسی نتیجہ خیز جنگ کے مواقع ختم ہو چکے ہیں۔ ایسی حالت میں ان مسلمانوں کو اپنا رول ختم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ہر طرف مایوسی اور جھنجھلاہٹ کی باتیں کی جارہی ہیں۔ اب تک وہ بے فائدہ جنگ میں مصروف تھے اور اب وہ بے فائدہ مایوسی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے اندر دعوتی ذہن ہوتا تو ان کے لئے نہ پہلے مایوسی کا سوال تھا اور نہ اب ان کے لئے مایوسی کا سوال ہے۔ دعوت مسلمانوں کے حق میں ایک ایسی نظریاتی طاقت ہے جس کا رول کبھی کسی حال میں ختم نہیں ہوتا۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۱

پاکستان بننے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۴۸ میں وہ مہم شروع کی جس کو 'مطالبہ نظام اسلامی' کی مہم کہا جاتا ہے۔ یعنی پاکستان میں اسلام کے قانونی نظام کو نافذ کرنا۔ مگر پچاس سالہ کوشش کے باوجود یہ مہم سراسر ناکام ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس 'مطالبہ' کی بنیاد محض ایک غلط مفروضہ پر قائم تھی۔ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں نے یہ فرض کر لیا کہ "پاکستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔" اس لئے پاکستان کے حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ پاکستانی عوام کی متفقہ خواہش کے مطابق ملک میں اسلامی قانون کا نفاذ کریں۔

یہ مطالبہ جس مفروضہ پر قائم ہے وہ بجائے خود بالکل غلط تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں نے پاکستان اس لئے بنوایا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس مفروضہ کی غلطی اس سے واضح ہے کہ حکومتی ادارہ سے باہر جو اسلامی اصول ہیں، ان پر عمل کرنا ہر وقت ان مسلمانوں کے لئے ممکن تھا مگر پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ممکن دائرہ میں اسلامی اصول پر عمل

نہ کر سکے۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۱

۱۲-۱۳ نومبر کو میں شولاپور میں تھا۔ ۱۴ نومبر کو وہاں سے واپسی ہوئی۔ شولاپور میں کئی اجتماعات ہوئے۔ ہر اجتماع میں وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوا۔ سفر سے پہلے مجھے شولاپور کے بارہ میں کوئی اندازہ نہ تھا۔ الرسالہ کی دعوت اب ہر جگہ تعلیم یافتہ لوگوں کے حلقہ میں داخل ہو گئی ہے۔ الحمد للہ

۱۵ نومبر ۱۹۹۱

نیپال کی کل آبادی ۱۷ ملین ہے۔ ان میں تقریباً ڈیڑھ ملین مسلمان ہیں۔ ایک نیپالی عالم عبداللہ عبدالتواب کا انٹرویو الدعوۃ (۱۴ نومبر ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نیپال میں ہماری سب سے بڑی مشکل تعصب ہے (التعصب ابرز مشاکلنا)

آج تمام دنیا کے مسلم دانشور اسی قسم کی بولی بول رہے ہیں۔ میں اس کو بالکل لغو سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم قائدین زمانہ حال کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے مسلمانوں کو غلط رہنمائی دی۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان ہر جگہ دوسری قوموں سے بچھڑ گئے۔ اس پچھڑے پن کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جو مسائل در پیش ہیں ان کو وہ "تعصب" کا نام دئے ہوئے ہیں۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۱

ایک عرب نوجوان نے یہ سوال کیا: لماذا اصبح الخوض فی اعراض الناس عند البعض اسہل من تنفس الہواء (کیوں ایسا ہے کہ لوگوں کی آبرو پر کلام کرنا کچھ لوگوں کے لئے ہوا میں سانس لینے سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔) اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے دل سے خدا کا خوف نکل گیا ہے۔ اس لئے انھیں لوگوں کی آبرو پر حملہ کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۱

ہندی ہفت روزہ پانچ جلیہ کے نائب مدیر مسٹر سبھاش چندر سنگھ نے انٹرویو لیا۔ انٹرویو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ آخر میں مسٹر سبھاش نے کہا: شہاب الدین کے ساتھ بیٹھنے

میں من کڑوا ہو جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ بیٹھنے میں من کو لائٹ ملتی ہے۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۱

آج ایک صاحب نے بتایا کہ بنگلور شہر کے وسطی علاقہ میں عیسائیوں کی ایک زمین تھی۔ اس کا رقبہ ایک ایکڑ تھا۔ گورنمنٹ اپنی کسی اسکیم کے تحت اس کو لینا چاہتی تھی۔ گورنمنٹ کا کہنا تھا کہ یہ زمین آپ ہم کو دیدیں۔ اس کے بدلے شہر کے باہر ہم آپ کو بہت بڑی زمین دیدیں گے۔ چرچ کے ذمہ داروں نے گورنمنٹ کی اس درخواست پر غور کرکے اسے منظور کرلیا۔ اس کے بدلے گورنمنٹ نے بنگلور شہر کے باہر پانچ سو ایکڑ زمین دے دی۔ چرچ والوں نے اس کو قبول کرلیا اور وہاں کامپلکس بنا کر ہر قسم کے ادارے کھول دئے۔ آج یہ جگہ عظیم مسیحی سنٹر بنی ہوئی ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۱

رابطۃ العالم الاسلامی کی طرف سے بڑے سائز پر ایک ہفتہ وار عربی اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام "العالم الاسلامی" ہے۔ اس کے شمارہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۱ کے پہلے صفحہ کی پہلی خبر اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں ہے۔ اس خبر کی سرخی جلی الفاظ میں اس طرح قائم کی گئی ہے:

المتطرفون يطالبون بهدم المسجد البابري قبل ١٨ نوفمبر (ہندو انتہا پسند ۱۸ نومبر سے پہلے بابری مسجد کو ڈھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں)

نومبر کی ۱۸ تاریخ گزر گئی اور ابھی تک بابری مسجد منہدم نہیں ہوئی۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم اخبارات ورسائل کس طرح فرضی خبریں شائع کرکے مسلمانوں کے ذہن کو مسلسل بگاڑ رہے ہیں۔ چند دیوانے ہندو اگر مسجد کو منہدم کرنے کی بات کریں تو مسلم دانشوروں کو فوراً اس کی خبر ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ۹۵ فیصد سے زیادہ ہندو اس قسم کے نعروں کے خلاف ہیں، اور وہ مسلم دانشوروں کو دکھائی نہیں دیتا۔ کیسا عجیب ہے ان کا جاننا اور کیسا عجیب ہے ان کا نہ جاننا۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۱

روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا نظریہ مسلح انقلاب

تھا۔ چنانچہ روس کی کمیونسٹ حکومت نے اپنے بہترین وسائل جنگی تیاریوں پر صرف کردئے۔ اس وقت دنیا میں فوجی تیاریوں پر ۲۰ لاکھ ڈالر فی منٹ خرچ ہو رہے ہیں۔ ان فوجی مصارف میں ۷۰ فیصد روس اور امریکہ کا حصہ ہے۔

کمیونسٹ روس نے امریکہ سے زیادہ فوجی مدوں میں خرچ کیا۔ مسلح افواج پر امریکہ کے مصارف کا تناسب اس کی مجموعی قومی آمدنی کا چھ فیصد ہے، اور سوویت یونین کا فوجی خرچ اس کی مجموعی قومی آمدنی کا ۱۲ فیصد۔ ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۸ تک امریکہ نے اپنی مسلح فوجوں پر تقریباً ۲۴ کھرب ڈالر خرچ کئے۔ جب کہ سوویت یونین نے اسی دس سالہ مدت میں تقریباً ۲۷ کھرب ڈالر خرچ کئے۔

سوویت یونین کی اس غیر معمولی فوجی تیاری کے باوجود ۱۹۸۹ میں دیوار برلن ٹوٹ گئی۔ اس کو افغانستان میں شکست کھانی پڑی۔ اس کی ریاستیں خود مختاری کے راستہ پر چل پڑیں اور سوویت یونین کے لئے یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ ان کو روک سکے۔

یہ واقعہ فوجی طاقت کی بے وزنی کو بتارہا ہے۔ مگر عین انھیں حالات کے درمیان مسلمانوں کے قائد اور دانشور ہر طرف جہاد و قتال اور مسلح اسلامی انقلاب کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ یہ بے خبری بھی کیسی عجیب ہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۱

فادر ایگنل (Fr. Agnelo) ۲۱ جنوری ۱۸۶۹ کو گوا میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۲۷ کو بمبئی میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے نام پر دہلی میں ایک اسکول (ایگنل سکول) قائم کیا گیا ہے۔ ان کا ایک قول یہ ہے:

It is not the clothing that honours a man, but his virtue.

ایگنل اسکول میں فادر ایگنل کے نام پر ہر سال ۲۰ نومبر کو خصوصی تقریب ہوتی ہے۔ اس میں طلبہ و طالبات کے علاوہ طلبہ کے سرپرست اور اسکول کے اسٹاف کے ممبران وغیرہ شریک ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت پر میں اس تقریب میں شریک ہوا اور امن

کے موضوع پر تقریر کی۔ حاضرین کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔

مجھے وہاں کا ماحول بہت پسند آیا۔ نہایت صاف ستھرا اور تعمیری مزاج کا ماحول تھا۔ اسکول کے ریکٹر نے گفتگو کے دوران کہا کہ صرف خدا ہماری مدد کر سکتا ہے:

مسلمان موجودہ زمانہ میں علم جدید میں پچھڑ گئے۔ اور یہی موجودہ زمانہ میں ان کی مشکلات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۱

پٹنہ کے دو صاحبان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں اور مسلمانوں کو جہاد سے روکتے ہیں۔ یہ اسلام کے مطابق نہیں۔

میں نے کہا کہ صبر بھی جہاد ہے۔ مگر آپ لوگوں نے صبر کو جہاد کے معنی میں لے لیا ہے، اس لئے آپ کو صبر و اعراض کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ میں صبر کو اس لئے اہمیت دیتا ہوں کہ خود قرآن و حدیث میں صبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ ان اللّٰہ مع الصابرین (البقرہ ۱۵۳) انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب (الزمر ۱۰) حدیث میں ہے کہ اعلم ان النصر مع الصبر۔

یہ قرآن و حدیث کے حوالے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن و حدیث میں ایسا کہیں نہیں ہے کہ ان اللّٰہ مع المقاتلین، انما یوفی المقاتلون اجرھم بغیر حساب، اور یہ کہ اعلم ان النصر مع القتال۔ ایسی حالت میں آپ کو اپنی بات کہنے کے لئے پہلے قرآن و حدیث کا انکار کرنا پڑے گا۔ قرآن و حدیث کو مانتے ہوئے آپ ایسا کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں قرآن و حدیث کو نہیں مانتا۔ میں تو صرف عقل کو مانتا ہوں۔ تو اس کے بعد البتہ آپ سے عقلی سطح پر بات ہو سکتی ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی صفیہ تھیں۔ ان کا قد کسی قدر کم تھا۔ ایک روز عائشہ کی زبان سے ان کی بابت یہ جملہ نکل گیا: حسبك من صفية كذا وكذا

(صفیہ کا یہی عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سخت ناپسند کیا۔ اور فرمایا کہ عائشہ، تم نے ایسی بات کہہ دی جس کو اگر سمندر میں ملا دیا جائے تو اس کو بھی وہ کڑوا کر دے۔

حضرت عائشہ نے جو بات کہی وہ نفس واقعہ کے اعتبار سے غلط نہ تھی۔ مگر انھوں نے یہ بات بطور واقعہ نہیں کہی تھی بلکہ بطور تحقیر کہی تھی، اس لئے وہ قابل ملامت ہوگئی۔ ایسی حالت میں جو لوگ ایک مسلمان کی کردار کشی کے لئے اس کے اوپر جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ اس کی زندگی کے کسی پہلو کو غلط انداز میں پیش کرکے اس کو بدنام کرتے ہیں، ان کا یہ فعل کس قدر قابل مذمت ہے۔

مزید یہ کہ حضرت عائشہ نے اپنی بات صرف اپنے گھر کے اندر ایک آدمی کے سامنے کہی تھی۔ جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی بات کو لاؤڈ اسپیکر پر بول کر دور تک پھیلاتے ہیں۔ وہ اس کو اخبار اور رسالے میں چھاپ کر ساری دنیا میں بکھیر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا جرم اس سے زیادہ ہے کہ اس کو لفظوں میں بیان کیا جاسکے۔

۲۴ نومبر ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۴ نومبر) میں ڈاکٹر رفیق زکریا بمبئی والے کا مضمون چھپا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کا سبب ہندو فرقہ پرست تنظیموں اور حکومت کی متعصبانہ پالیسی کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے شکایت کی ہے کہ ڈاکٹر گوپال سنگھ کمیشن اور گجرال کمیشن نے اپنی رپورٹوں میں مسلمانوں کے لئے جو فلاحی تجویزیں رکھی تھیں حکومت نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ وغیرہ

مگر عین اس وقت جب کہ ہندو انتہا پسندوں کی زیادتی اور حکومت کا تعصب مسلمانوں کی معاشی ترقی کو روکے ہوئے ہے، خود ڈاکٹر رفیق زکریا کے دو صاحبزادے ارشد اور فرید ہندستان میں پیدا ہوئے ہیں اور یہاں اعلیٰ تعلیم پاکر اب ہارورڈ یونیورسٹی اور ییل یونیورسٹی میں اپنی علمی تکمیل کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان دونوں صاحبزادوں کے نام اپنی درج ذیل کتاب ڈیڈیکیٹ کی ہے:

ڈاکٹر رفیق زکریا کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ ہندو حکومت کی شکایت کرنے کے بجائے قارئین کو یہ بتلاتے کہ اسی متعصب اور فرقہ پرست ملک میں انھوں نے کس طرح اپنے لڑکوں کو ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہنچا دیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ان کے مسلم بھائیوں کے لئے زیادہ مفید ہوتا۔ کیوں کہ وہ اس میں اپنے لئے ایک عملی رہنمائی پا لیتے۔ موجودہ مضمون سے تو مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں کہ ان کی جھنجھلاہٹ اور مایوسی میں مزید کچھ اضافہ ہو جائے۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۱

ایک صاحب موجودہ زمانہ کی ان مسلم شخصیتوں سے متاثر تھے جن کو انقلابی مفکرین کہا جاتا ہے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ خدا جب اپنی زمین پر ایک درخت اگانا چاہتا ہے تو وہ بیج سے اس کا آغاز کرتا ہے۔ اس طرح خدا فطرت کی زبان میں یہ پیغام دے رہا ہے کہ :

My way is to begin from the begining

اس کے برعکس مسلم مفکر کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں سیاسی انقلاب کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کرے اور پھر اسلامی قانون کی حکومت قائم کرے۔ اس کے برعکس مسلم مفکر کا نعرہ برعکس طور پر یہ ہے کہ :

My way is to begin from the top

یہ بلاشبہ غلط ہے کیوں کہ وہ فطرت کے طریقہ کے خلاف ہے اور خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ فطرت کے مقررہ طریقہ کے خلاف چلیں وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۱

قومی آواز (۲۶ نومبر) میں مسٹر عشرت علی صدیقی کا مضمون (صدام حسین کے بعد معمر قذافی کی باری) چھپا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اپریل ۱۹۸۶ میں امریکہ نے لیبیا کے

شہر بن غازی پر حملہ کر دیا۔ اس وقت امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن تھے۔ اس حملہ میں قذافی کا مکان برباد ہوگیا۔ اس مکان کو حکومت لیبیا نے اسی برباد شدہ حالت میں برقرار رکھا ہے۔ وہاں ایک تختی لگا دی گئی ہے جس پر لکھا ہوا ہے: اس گھر پر بم باری اس بات کا ابدی ثبوت ہے کہ اصلی دہشت گرد کون ہے۔

بن غازی میں معمر قذافی کی یہ تباہ شدہ رہائش گاہ میں نے جون ۱۹۸۷ میں دیکھی تھی جبکہ میں نے ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے لیبیا کا سفر کیا تھا۔ ایک واقعہ یہ ہے۔ دوسری طرف ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک اور واقعہ ہوا۔ امریکی ہوائی کمپنی (پان ایم) کا ایک مسافر بردار ہوائی جہاز اسکاٹ لینڈ میں لاکربی کے اوپر اڑ رہا تھا کہ اس کے اندر بم پھٹا۔ اس حادثہ میں جہاز کے ۲۷۰ مسافر ھلاک ہو گئے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ یہ بم دو لیبی افسروں نے رکھا تھا۔ انھوں نے مالٹا میں ایک سوٹ کیس لیا۔ اور اس کے اندر جاپانی ٹرانسسٹر بم ڈال کر ہوائی جہاز کے اندر رکھوا دیا۔ اب امریکہ نے اس جہاز کے ٹوٹے اور جلے ہوئے ڈھانچہ کو اپنے یہاں محفوظ کر دیا ہے اور اس پر دوبارہ یہ الفاظ لکھ دئے ہیں: اس جہاز کی بم کے ذریعہ تباہی اس بات کا ابدی ثبوت ہے کہ اصلی دہشت گرد کون ہے۔

کہانی کا نصف حصہ لیبیا نے لکھ رکھا ہے اور بقیہ نصف امریکہ نے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ملک میں بھی منصفانہ نقطۂ نظر پیدا نہ ہوسکا۔ لیبیا میں امریکہ کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے اور امریکہ میں لیبیا کے خلاف۔ قرآن میں اعدلوا (المائدہ ۸) کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ آدھی بات نہ کہو بلکہ پوری بات کہو۔

۲۷ نومبر ۱۹۹۱

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک کتاب الطریق الی المدینۃ ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں شام کے مشہور بزرگ سید علی الطنطاوی کا مقدمہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شام سے حجاز کا سفر پہلے زمانہ میں بڑی تیاریوں کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔ اور مسافر کو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعہ ہم چند گھنٹوں میں یہ سفر طے کر لیتے ہیں۔ مگر پہلے جو ذوق و شوق اور طویل سفر کے دوران حرمین کی زیارت

کا جو اشتیاق دل میں پیدا ہوتا تھا وہ اب باقی نہ رہا۔ ہم نے وقت کو تو بچایا مگر عواطف کو ہم نے کھو دیا۔ (کَسَبْنَا الوقت وخَسِرْنَا العَواطِف)

مجھے اس تبصرہ سے اتفاق نہیں 'عواطف' کا تعلق مشکل سفر یا آسان سفر سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق مسافر کی قلبی صلاحیت سے ہے۔ آدمی کا قلب اگر زندہ ہو تو وہ ہر حالت میں عواطف کی غذا پاتا رہے گا۔ پر مشقت سفر میں اگر عجز کا تجربہ اس کو قادر مطلق کی یاد دلائے گا تو آسان سفر میں اس کے اندر خدا کی نعمتوں کا احساس ابھرے گا۔ پہلی صورت میں اس کی آنکھیں عجز کے آنسو بہائیں گی اور دوسری صورت میں شکر کے آنسو۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۱

الفُضَیل بن عیاض سمرقند میں پیدا ہوئے۔ مکہ میں ۱۸۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: المومن قلیل الکلام کثیر العمل والمنافق کثیر الکلام قلیل العمل (مومن کم بولنے والا اور زیادہ کرنے والا ہوتا ہے۔ اور منافق زیادہ بولنے والا اور کم کرنے والا ہوتا ہے)

مومن کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو قلیل الکلام اور کثیر العمل بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس منافق ایک بے حس آدمی ہوتا ہے اور اس کی بے حسی اس کے اندر یہ صفت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ عمل میں کم اور قول میں زیادہ ہو۔

۲۹ نومبر ۱۹۹۱

مصطفیٰ صادق صاحب (اڈیٹر وفاق، لاہور) دہلی آئے اور تین دن قیام کیا۔ وہ پاکستان کے اسلام پسند لوگوں میں ہیں اور جماعت اسلامی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی سے نہایت گہرے طور پر وابستہ رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مولانا مودودی کے ساتھ بہت سے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ جڑے۔ اور پھر ان کی زندگی ہی میں ان سے الگ ہو گئے۔ دوسری طرف ہندستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ گاندھی کے ساتھ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ وابستہ ہوئے اور وہ آخر وقت تک گاندھی سے الگ نہیں ہوئے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا مودودی ایک صاحب فکر آدمی تو ضرور تھے مگر عملی صلاحیت ان کے اندر نہیں تھی۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۱

قاہرہ کے سفر میں ایک مصری نے یہ لطیفہ بتایا کہ ایک شخص کسی بخیل کے یہاں مہمان ہوا۔ کھانا دسترخوان پر رکھا گیا اور مہمان نے کھانا شروع کیا تو بخیل میزبان نے کہا کہ دیکھو، اطبا رکا قول ہے کہ پیٹ کے تین حصے کرو۔ ایک حصہ کھانے کے لئے، دوسرا حصہ پانی کے لئے اور تیسرا حصہ ہوا کے لئے۔ مہمان نے جواب دیا: کلّ انسان اَعلم بثلثہ (ہر آدمی اپنے تیسرے حصہ کو زیادہ جانتا ہے)

یکم دسمبر ۱۹۹۱

مولانا حمید الدین فراہی پر ۸ - ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۱ کو مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں "فراہی سیمنار" ہوا۔ میرے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا مگر میں اس میں شرکت نہ کر سکا۔

مولانا فراہی اپنی کتاب فی ملکوت اللہ میں لکھتے ہیں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا ہے کہ حکومت الٰہیہ کا قیام امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ یہ دونوں صاحبان مفسر قرآن ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ وہ ایک ایسی بات کو امت کا نصب العین بتاتے ہیں جس کا سارے قرآن میں کہیں ذکر ہی نہیں۔

ذکر سے میری مراد براہ راست ذکر ہے۔ کسی آیت سے اگر استنباطی طور پر یہ نصب العین نکالا جائے تو میرے نزدیک وہ نکلا ہی نہیں۔ کیوں کہ مشن کے درجہ کی چیز کو براہ راست عبارت النص سے نکلنا چاہئے نہ کہ بالواسطہ استنباط سے۔

۲ دسمبر ۱۹۹۱

بمبئی کے ایک مسلم نوجوان (جاوید صاحب) آئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ہندو تھیں۔ اب انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور مجھ سے ان کا نکاح ہو چکا ہے۔ ایک لڑکی بھی پیدا ہو چکی ہے۔ مگر خاتون کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اس

سے متفق نہیں ہیں۔ میں نے مسلم نوجوان سے پوچھا کہ کیا انھوں نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ مگر خاتون نے فوراً ہی ان کی بات کاٹی اور کہا کہ:

I don't think so

آجکل کثرت سے ایسے کیس ہورہے ہیں۔ یا تو مذہب بدلے بغیر یا فرضی طور پر تبدیلی مذہب کا اعلان کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں میں شادیاں ہورہی ہیں۔ یہ برائی مشترک تعلیم کے ذریعہ آرہی ہے۔ تعلیم کے دوران دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح نکاح کی تقریب کرکے میاں بیوی بن جاتے ہیں۔

۳ دسمبر ۱۹۹۱

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے آواگمن کے نظریہ پر بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں میں کوئی اچھے حال میں ہے اور کوئی برے حال میں۔ یہ فرق بتاتا ہے کہ آواگمن کا نظریہ درست ہے۔ کیوں کہ جو اچھے حال میں ہے وہ اپنے اچھے کام کا انعام پا رہا ہے۔ اور جو برے حال میں ہے وہ اپنے برے کرم کی سزا بھگت رہا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ اگر انعام ہے تو انعام پانے والے کو اس کا شعور ہونا چاہئے۔ اسی طرح اگر یہ سزا ہے تو سزا پانے والے کو بھی اس کا شعور ہونا چاہئے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں میں سے کسی کے بھی زندہ شعور میں یہ بات موجود نہیں۔ ایسی حالت میں یہ صرف ایک مفروضہ ہے نہ کہ حقیقۃً انعام اور سزا۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانوں میں فرق ہونا انعام وسزا کا کوئی معاملہ نہیں۔ یہ دراصل نظام فطرت کا ایک معاملہ ہے۔ واقعات بتلاتے ہیں کہ پانے والے کے اندر عملی کمیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر کار وہ ملی ہوئی چیز کو کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس کھونے والے کے لئے کھونا ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ اور وہ مزید محنت کرکے کھوئی ہوئی چیز کو پالیتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو یہ فرق سادہ طور پر صرف حال اور مستقبل کا معاملہ نظر آئے گا۔ جس آدمی کو آج ملا ہوا ہے اس سے کل چھن جانے والا ہے۔ اور جو آدمی آج محروم ہے وہ کل از سر نو پانے والا ہے۔

۴ دسمبر ۱۹۹۱

عن علی الازدی قال : اردت الجهاد فقال لی ابن عباس : الا ادلّك علیٰ ما هو خیر لك من الجهاد۔ تاتی مسجد افتقرئ فیه القرآن وتعلم فیه الفقه (الجامع لاحکام القرآن ۲۹۶/۸

علی ازدی کہتے ہیں کہ میں نے جہاد کا ارادہ کیا تو عبد اللہ بن عباسؓ نے مجھ سے کہا۔ کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو جہاد سے زیادہ بہتر ہے۔ تم کسی مسجد میں چلے جاؤ اور اس کے اندر قرآن پڑھو اور شریعت سیکھو۔

جہاد (بمعنی قتال) ایک وقتی ضرورت ہے۔ جب کہ دین میں تفقہ حاصل کرنا ایک مستقل ضرورت۔ مخاطب وقتی ضرورت کو مستقل ضرورت سے زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا اس لئے حضرت عبد اللہ بن عباس نے اس قسم کی نصیحت فرمائی۔

۵ دسمبر ۱۹۹۱

عطاء الرحمان صاحب فیض آبادی ملاقات کے لئے آئے۔ مدرسۃ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کا ساتھ تھا۔ غالباً ۱۹۴۳ میں ان کے وطن جگن پور گیا تھا۔ یہاں ان کے عزیز ماسٹر نقیب احمد سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت اچانک بارش آگئی جو عام خیال کے مطابق بے موسم تھی۔ نقیب صاحب نے کہا: واہ اللہ میاں، برستے برستے بوڑھے ہو گئے مگر برسنا نہ آیا۔

عطاء الرحمان صاحب کے ساتھ میں اجودھیا گیا تھا۔ وہاں میں نے بابری مسجد میں داخل ہو کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد میں بمبئی گیا۔ وہاں عطاء الرحمان صاحب کے بہنوئی محمد شریف خاں سے ملا۔ وہ اس وقت ایک پارسی مسٹر لال کا کا کے یہاں ملازم تھے اور ان کے مکان پر رہتے تھے۔ میں اس مکان میں غالباً دو دن ٹھہرا۔ اس کے بعد اعظم گڑھ واپس آگیا۔

عطاء الرحمان صاحب نے بتایا کہ میرے پاس ابھی تک آپ کی وہ تصویر ہے جو فیض آباد کے فوٹو گرافر نے ہوائی جہاز میں رکھ کر بنائی تھی۔ اس تصویر میں آپ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ صرف تصویر ہے نہ کہ حقیقۃً ہوائی جہاز کا سفر۔

۶ دسمبر ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۶ دسمبر) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ لندن کا مسلم انسٹی ٹیوٹ (ڈائرکٹر کلیم صدیقی) ۱۹۹۲ کے شروع میں لندن میں ایک اجلاس کرنے والا ہے جس میں ۲۰۰ برطانی مسلمانوں پر مشتمل "برطانی پارلیمنٹ" بنائی جائے گی۔ اس کا خاص مقصد برطانی مسلمانوں کے اسلامی تشخص Islamic identity کی حفاظت کرنا ہے۔ آفیشل اعداد و شمار کے مطابق برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ملین ہے۔ مگر مسلم تنظیمیں برطانی مسلمانوں کی تعداد دو ملین بتاتی ہیں۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کے مطابق، برطانی مسلمانوں کو جو مذہبی مسائل درپیش ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ برطانی اسکولوں میں ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو مسلمان بچوں کے عقائد سے ٹکراتے ہیں۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ جغرافیہ کی کتابوں میں یورپی جغرافیہ کا بہت زیادہ تذکرہ ہوتا ہے اور تاریخ میں صلیبیوں کو اب ہیرو بتایا جاتا ہے:

They criticise, geography deals too much with Europe and that in history,

the crusaders are still. described as heroes

موجودہ مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ ساری دنیا میں اپنے "جغرافیہ" کو اہم بتائیں۔ مگر دوسرے لوگ خود اپنے ملک میں بھی اپنے جغرافیہ کو اہمیت نہ دیں۔ مسلمان ساری دنیا میں صلاح الدین ایوبی کو ہیرو کہیں مگر دوسرے لوگ خود اپنے ملک میں بھی اپنے اسلاف کو ہیرو نہ کہیں۔ مسلمانوں کا یہ مزاج زندگی کی علامت نہیں، وہ صرف موت کی علامت ہے۔ یہ حرکت مذبوحی ہے نہ کہ حرکت حقیقی۔

۷ دسمبر ۱۹۹۱

فقہاء اسلام کے یہاں ایک قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی عام ایسا نہیں ہے جس سے بعض کو خاص نہ کیا گیا ہو (ما من عام إلا خُصّ عنه البعض)

یہ فطرت کا قانون ہے۔ یہاں ہر عموم rule میں استثناء Exception ہوتا

ہے۔ اس کو جاننا انتہائی ضروری ہوتا ہے آدمی نہ زندگی کو سمجھ سکے گا اور نہ شریعت کو۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک صحیح کام کر رہا ہوگا۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ غلطی پر ہوگا۔

۸ دسمبر ۱۹۹۱

فقہ کا ایک اصول وہ ہے جس کو استحسان کہا جاتا ہے۔ فقہاء اربعہ میں سے تین نے اس کو مانا ہے۔ خاص طور پر احناف نے اس کو بہت استعمال کیا ہے۔ استحسان سے مراد یہ ہے کہ ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس طریقہ کو اختیار کرنا جو لوگوں کے لئے زیادہ مناسب ہو (الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما هو اوفق للناس) المبسوط فی الاستحسان للسرخسی۔

مثلاً ایک آدمی جوتہ ساز کے یہاں جاتا ہے۔ وہ اس سے جوتے کی قیمت طے کرتا ہے اور اپنا ناپ دے کر اس کو اپنے لئے ایک جوتا بنانے کا آرڈر دیتا ہے۔ قیاس کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ درست نہیں۔ کیوں کہ حدیث کے مطابق، شریعت کا اصول یہ ہے کہ سودے کی موجودگی اس کی بیع کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ اور مذکورہ مثال میں سودا (جوتا) ابھی موجود نہیں۔ مگر عرف عام کی بنا پر اس کو درست قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا نام استحسان ہے۔

مگر امام شافعی اس کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جس آدمی نے استحسان سے کام لیا اس نے نئی شریعت بنائی (من استحسن فقد شرع او وضع شرعاً جدیداً) منہاج الاصول۔

اس قسم کے بے شمار اختلافات فقہاء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

قرآن میں ہے: قل کل یعمل علی شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدیٰ سبیلا (الاسراء ۸۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی شاکلہ سے مطابقت کی بنا پر سمجھ لیتا ہے کہ یہ حق ہے۔ حالاں کہ حق وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق حق ٹھہرے۔

ہر آدمی کا ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کے حالات کے تحت اس کے اندر بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شاکلہ ہے۔ اپنے اس شاکلہ کی بنا پر کوئی چیز اس کے لئے قابل قبول ہوتی ہے اور کوئی چیز ناقابل قبول۔ اپنے مخصوص مزاج کے تحت وہ کسی مسلک کو اختیار کر لیتا ہے اور آخر کار

اس سے اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہی حق و صداقت ہے۔ مگر کسی کا ایک چیز سے مانوس ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ حق بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے ذاتی شاکلہ سے اپنے آپ کو نکالے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کیا چیز ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۱

"تبلیغ" کے لوگ اپنے طریقہ کو نقل و حرکت کا طریقہ بتاتے ہیں۔ وہ اس کو اہم سمجھتے ہیں اور قلم اور کتاب کا طریقہ ان کے نزدیک غیر اہم ہے۔ ایک تبلیغی عالم سے اس پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ کسی متعین کتاب کو غیر اہم بتائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جب آپ کتاب کے طریقہ کو طریقہ کی حیثیت سے غیر اہم بتاتے ہیں تو آپ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں۔ کیوں کہ قلم اور کتاب اور قرأت کا طریقہ قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔ مگر "نقل و حرکت" کا طریقہ سارے قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قلم اور کتاب کا طریقہ منصوص طریقہ ہے۔ اور آپ کا نقل و حرکت کا طریقہ اجتہادی طریقہ۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب شخصی معاملہ نہیں، مذہب پوری زندگی کا مکمل قانون ہے۔ میں نے کہا کہ یہ نظریہ بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ بالکل بے معنیٰ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب اصلاً ایک شخصی معاملہ ہے مگر حکماً وہ پوری زندگی کا معاملہ بھی ہے۔

مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا کی یاد میں جینے کا نام ہے۔ اس اعتبار سے وہ سراسر شخصی معاملہ ہے۔ جس آدمی کے اندر مذہب کی حقیقت اتر جائے وہ ایک مختلف انسان بن جاتا ہے۔ اس کا فکر، اس کی عبادت، اس کا اخلاق، اس کی سرگرمیاں ہر چیز خدا کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ یہی اصل دین ہے۔ اس کے بعد جب ایسا ہوتا ہے کہ کسی سماج کے بہت سے لوگ اسی طرح دیندار بن جائیں تو اس وقت مذہب کا تعلق پوری اجتماعی زندگی سے ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ پہلی تعبیر میں مذہب "نفاذ" کا موضوع بن جاتا ہے اور دوسری تعبیر میں وہ "تعمیل" کا موضوع ہوتا ہے۔ یہ فرق بذات خود یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ پہلی تعبیر غلط ہے اور دوسری تعبیر صحیح۔

۱۲ دسمبر ۱۹۹۱

آج صبح سرینگر سے جناب ابواللیث صدیقی صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ آج سرینگر کے اردو اخبارات میں صفحۂ اول پر آپ کے خلاف ایک خبر چھپی ہے۔ اس میں کشمیر کی جنگجو تنظیم کی طرف سے کہا گیا ہے کہ "مولانا وحیدالدین خاں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے ہماری مجاہدانہ سرگرمیوں کو دہشت گردی کہا ہے۔ اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ پورے کشمیر میں ان کا رسالہ ان کی کتابیں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں۔ جس شخص کے پاس بھی ان کی مطبوعات ہوں وہ فوراً ان کو برباد کر دے۔ پوسٹ آفس کو بھی ہمارا حکم ہے کہ ان کے رسالہ یا کتاب کا کوئی پیکٹ آئے تو کشمیر میں اس کی ڈلیوری نہ دے۔ ہمارے خصوصی اسکواڈ اس کی نگرانی کریں گے۔

آج ہی اتفاق سے اردو ہفتہ وار بلٹز کے چیف ایڈیٹر ہارون رشید صاحب آئے۔ ان سے میں نے اس خبر کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ اب آپ کا رسالہ اور زیادہ پڑھا جائے گا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۱

آج دوپہر کی فلائٹ سے مجھے رانچی جانا ہے۔ وہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک مشترک اجتماع ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوں گے۔ اور اس کا عنوان غیر مسلم صاحبان کے مشورہ سے یہ طے ہوا ہے: سوشل جسٹس اِن اسلام (اسلام میں عدلِ اجتماعی)

یہ میرے لئے نیا موضوع ہے۔ میں اشعار کو پسند نہیں کرتا۔ مگر پہلی بار میں نے اپنے اجتماع کے لئے ایک نظم کا انتخاب کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی ایک نظم "عدلِ جہانگیری" ہے جو ان کی کلیات میں شامل ہے۔ اس نظم کی فوٹو کاپی کر کے میں اپنے ساتھ

لے جا رہا ہوں۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ میرے خطاب سے پہلے یہ نظم پڑھی جائے، اس کے بعد مذکورہ موضوع پر میرا خطاب ہو۔ جہانگیر کے اس واقعہ کا تقابل میں اس کے معاصر برطانی بادشاہ جیمز فرسٹ کے واقعہ سے کرنا چاہتا ہوں۔

۱۴ دسمبر ۱۹۹۱

رانچی میں کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ دسمبر ۱۹۷۹ میں سوویت یونین نے اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کر دیں۔ اس کے بعد افغانی مجاہدین اور روسیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ آخر کار ۱۹۸۹ میں روسی فوجوں کو افغانستان سے واپس جانا پڑا۔ افغانی مجاہدین کا مقابلہ اب افغانی صدر ڈاکٹر نجیب اللہ سے تھا۔ مگر اب تک وہ نجیب اللہ پر غالب نہ آسکے۔ اس خونی جنگ میں افغانستان تباہ ہوگیا اور کل افغانی آبادی کا دسواں حصہ (one-tenth) ہلاک ہوگیا۔ زخمیوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔

روسیوں کی واپسی کو لوگ افغانی مجاہدین کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جن افغانیوں نے سپر پاور (روس) پر فتح حاصل کرلی وہی منی پاور (نجیب اللہ) کے مقابلہ میں ناکام کیوں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ ایک پراکسی وار (proxy war) تھی۔ اس میں امریکہ اور روس بالواسطہ طور پر لڑ رہے تھے۔ افغانی مجاہدین کو امریکہ پوری مدد پہنچا رہا تھا۔ اور ڈاکٹر نجیب اللہ کو روس سے فوجی اور غیر فوجی مدد مل رہی تھی۔ افغانستان میں روس کے مقابلہ میں افغانیوں کی کامیابی دراصل روس کے مقابلہ میں امریکہ کی کامیابی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اپنی فخر پسندی کے تحت اس کو اپنا کارنامہ سمجھ لیا۔ مسلمانوں کا یہی وہ غیر حقیقی مزاج ہے جس کی بنا پر وہ معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۱

رانچی میں ۱۹۶۷ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں "تقسیم" کا ذہن پیدا ہوا۔ مسلمان ہندو علاقوں کو چھوڑ کر مسلم علاقوں میں آنے لگے۔ دھیرے دھیرے دونوں کی آبادیاں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔

مگر اب رانچی کے مسلمانوں کو دوسرا شدید تر مسئلہ درپیش ہے، اور وہ خود مسلمانوں کے مجرم عناصر کا ہے۔ یہ لوگ مسلم آبادی میں آکر اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں کو آئے دن لوٹتے رہتے ہیں۔ مجھ سے ایک مسلم تاجر نے بتایا کہ انھوں نے رقم جمع کرکے ڈیڑھ لاکھ روپیہ اکٹھا کیا اور اسکوٹر پر لے کر بینک کے لئے روانہ ہوئے۔ مسلم داداؤں نے راستہ ہی میں ریوالور دکھا کر چھین لیا۔ حتی کہ اب یہ حالت ہے کہ مسلم گھروں سے لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اور کئی کئی دن تک اپنے یہاں رکھ کر واپس پہنچا دیتے ہیں۔ کوئی ان لوگوں کے خلاف بولنے والا نہیں۔

میں نے کہا کہ اصل کام مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح ہے۔ جب تک مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح نہ ہو ہر دوسری تدبیر الٹی پڑے گی۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۱

ہفت روزہ تعمیر حیات (۱۰ دسمبر ۱۹۹۱) میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر چھپی ہے جو انھوں نے لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل کے جلسہ منعقدہ ۲۲ اکتوبر میں کی تھی۔ اس تقریر کا ایک حصہ یہ ہے: مولانا علی میاں نے ارکان کونسل کے جلسہ میں کہا:

"میں تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ مجھے دنیا کے بے شمار ملکوں میں جانے اور قوموں کے عروج و زوال کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی ہے، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج ملت اسلامیہ جن مسائل سے دوچار ہے اور جن خطرات نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں تھی۔"

اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کی کل تعداد ۱۶۶ ہے۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے "بے شمار" ممالک ہیں جن کی زیارت کا موقع مولانا کو ملا ہے۔ اس سے قطع نظر، ملت کے عملی مسائل کو جاننے کے لئے بے شمار ملکوں کا مطالعہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی ضرورت اگر ہے تو مسائل کا حل بتانے کے لئے ہے۔ اور یہ حل میرے علم کے مطابق مولانا نے ابھی تک نہیں بتایا۔

۱۷ دسمبر ۱۹۹۱

قدرت کا ایک منظر دیکھ کر دل نے کہا ——— دنیا امکاناتِ جنت کا تعارف ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جو امکان کی جھلکیوں میں واقعہ کا منظر دیکھ لے اور حقیقی معنوں میں اس کا طالب بن جائے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ ایک مشن ہے۔ الرسالہ کا مقصد ہے ——— ایک ایسی دنیا جہاں لوگ صرف انسانوں سے فیض لینا جانتے ہوں ان کو خدا سے فیض لینے والا بنانا۔ جہاں لوگ مادی دریافت کو کامیابی سمجھتے ہوں وہاں ان کو روحانی یافت کو کامیابی سمجھنے والا بنانا۔ جہاں لوگ صرف دنیوی ساز و سامان کی سطح پر جی رہے ہوں وہاں لوگوں کو اخروی حقائق کی سطح پر جینے والا بنانا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۱

اشتراکی امپائر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اب عظیم سوویت یونین ہمیشہ کے لئے تاریخ کا جزء بن چکا ہے۔ اللہ تعالی کی مدد سے مجھے جولائی ۱۹۹۰ میں سوویت روس جانے کا موقع ملا اور اس کو میں قریب سے دیکھ سکا۔ اگر یہ سفر نہ ہوا ہوتا تو پھر کبھی میں سوویت یونین کو دیکھ نہیں سکتا تھا ——— آج میں نے ایک صاحب سے یہ بات کہی۔

۲۰ دسمبر ۱۹۹۱

شکیل احمد خاں انجینئر اور ان کے بھائی راشد احمد خاں نے مل کر بجلی کا ایک کام شروع کیا ہے۔ وہ الکٹرک ٹاور نصب کرنے کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔ انھیں ایک اعلیٰ صلاحیت کے جنرل منیجر کی ضرورت تھی۔ اس وقت انڈیا میں اس میدان میں ٹاپ کا آدمی ایک ہندو انجینئر ہے جس کا نام سنتوش کمار اروڑہ ہے۔ مسٹر شکیل اور مسٹر راشد نے مسٹر اروڑا کو راضی کیا کہ وہ اپنی سابقہ سروس کو چھوڑ کر ان کے یہاں آجائے۔ پہلے اس کو سولہ ہزار روپیہ مہینہ مل رہا تھا۔ انھوں نے ان کو مزید سہولتیں دیں۔ اس کے بعد اب اس کی ماہانہ آمدنی ۲۰ ہزار روپے ہوگئی۔

جس ہندستان میں مسلمانوں کو ایسے مواقع حاصل ہوں وہاں یہ فریاد کرنا کہ یہاں ہمارے لئے مواقع نہیں بالکل لغو ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۹۱

شکیل احمد خاں انجینئر شارجہ میں کام کرتے ہیں۔ وہ کل آئے اور دہلی میں اپنے بھائی راشد احمد خاں کے یہاں ٹھہرے۔ کل شام کو مجھ سے ملاقات میں انھوں نے کہا کہ میں اور میری بیوی سلمہ دونوں تذکیر القرآن پڑھتے ہیں۔ مگر قرآن کی ایک آیت آپ کی تشریح کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئی۔ چوں کہ انھیں حوالہ یاد نہیں تھا، اس لئے اس پر کوئی گفت گو نہیں ہو سکی۔

آج صبح سویرے وہ دوبارہ مجھ سے ملے۔ انھوں نے بتایا کہ رات کو میں نے ٹیلیفون پر اپنی بیوی سے بات کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سورہ الفرقان کی آیت نمبر ۷ ہے۔ اس کے بعد شکیل احمد صاحب سے اس آیت پر گفت گو ہوئی۔ اور وہ مطمئن ہو گئے۔

میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں جدید مواصلات communication کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسی عجیب نعمت دی ہے۔ مگر شاید ہی دنیا میں کوئی شخص ہو جو اس عجیب نعمت پر حقیقی معنوں میں شکر ادا کرتا ہو۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب سے جنت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا ــــ جنت کوئی مسٹیریس چیز نہیں۔ جنت دراصل امپرفکٹ کے مقابلہ میں پرفکٹ دنیا کا نام ہے۔ پرفکٹ مکان، پرفکٹ پارک، پرفکٹ احول، پرفکٹ ملاقاتیں، پرفکٹ سامان، غرض ہر چیز جہاں پرفکٹ ہو اسی کا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا میں ہماری تمام مطلوب چیزیں موجود ہیں۔ مگر وہ امپرفکٹ حالت میں ہیں۔ جنت میں یہی تمام چیزیں پرفکٹ صورت میں ہمیشہ کے لئے دیدی جائیں گی۔

دینی دعوت کا مقصد اصلاً صرف یہ ہے کہ انسان جو اپنے مطلوب فطرت کو امپرفکٹ دنیا میں تلاش کر رہا ہے، اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطرت کی طلب کو

پرلکٹ دنیا میں تلاش کرنے لگے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۱

موضوعی مطالعہ کرنے والے کو، انسانی تاریخ میں دو باتیں بڑی عجیب نظر آتی ہیں، ایک غلبۂ خداوندی۔ دوسرے، انقلاب محمدی۔

غلبۂ خداوندی سے مراد وہ شعور عبدیت ہے جو تمام انسانوں میں موجود ہے۔ وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ روس کی اشتراکی حکومت نے تمام طاقت ور ذرائع کو استعمال کرکے ۷۵ سال تک خدا اور مذہب کو مٹانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ پوری نسل ختم ہوگئی جو قدیم روایتی دور میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر آج روس میں آزادی ملی تو حال یہ ہے کہ وہاں مسجدیں اور چرچ دوبارہ پہلے سے زیادہ بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی بھی طرح ختم نہیں ہوتا۔

دوسری چیز وہ انقلاب ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ دنیا میں آیا۔ یہ انقلاب اتنا گہرا اور اتنا ہمہ گیر تھا کہ اس کے اثرات آج تک ختم نہ ہوسکے۔ یہ اسی انقلاب کا اثر تھا کہ پیغمبر اسلام کے ہزار سال بعد شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ ایک راہ گیر کو قتل کردیتی ہے۔ مفتیٔ شرع کہتا ہے کہ ملکہ قتل کے جواب میں قتل کی جائے گی اور جہاں گیر کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ کہے کہ میں اس مفتی کو نہیں مانتا۔ جب کہ جہانگیر کا معاصر برطانی بادشاہ جیمز فرسٹ اس سے کم تر بات پر جسٹس کوک کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کردیتا ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تم کو ملے تو اس پر خدا کا شکر کرو اور جب نہ ملے تب بھی شکر کرو۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کو ملے تو اس کو خدا کی عنایت سمجھو اور جب نہ ملے تو اس کو خدا کی مصلحت سمجھو۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۱

ایک صاحب جہاد (بمعنی قتال) کی پرجوش وکالت کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جہاد بالسیف ہی اسلام کا سب سے بڑا عمل ہے۔ میں نے کہا: اسلام ۹۹ فیصد غیر جہاد ہے

اور ایک فیصد جہاد۔ مگر آپ حضرات نے اس تناسب کو الٹ دیا ہے۔ آپ لوگوں کے نزدیک اسلام ۹۹ فیصد جہاد ہے اور ایک فیصد غیر جہاد۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۱

حضرت عمر کا قول ہے کہ اگر میں تاجر ہوتا تو میں عطر کی تجارت کرتا۔ اگر مجھے اس کا فائدہ نہ ملے تو اس کی خوشبو پھر بھی مجھے مل جائے (قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو کنت تاجراً ما اخترت غیر العطر۔ ان فاتنی ربحہ لم یفتنی ریحہ)

اس قول میں 'عطر' کا لفظ بطور تمثیل ہے۔ اس میں دراصل ایک اصولِ زندگی کو بذریعہ مثال بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو وہ کام کرنا چاہئے کہ اگر خارجی اعتبار سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہو تو ذاتی اعتبار سے پھر بھی اس کا فائدہ اسے مل جائے۔ مثلاً اگر آپ ایک ایسے فریق کے خلاف جنگ کا طریقہ اختیار کریں جو غیر متناسب حد تک آپ سے زیادہ طاقت ور ہے تو آپ اپنا سب کچھ کھو دیں گے اور اگر آپ اس سے صلح کا طریقہ اختیار کریں تو کم از کم آپ کا موجودہ اثاثہ آپ کے پاس باقی رہے گا۔ آپ دوسرے کو نقصان نہ پہنچا کر بھی خود اپنا فائدہ محفوظ رکھیں گے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۱

ایک مسلم نوجوان نے کہا کہ میں تحریر و تصنیف کے میدان میں کام کرنا چاہتا ہوں، مجھے اس سلسلہ میں اپنا مشورہ دیجئے۔ میں نے کہا کہ میں اپنا مشورہ ہر مہینہ الرسالہ میں لکھ کر چھاپ رہا ہوں۔ اس کو آپ پڑھ لیں۔ انھوں نے اصرار کیا، مگر میں نے کوئی مشورہ نہیں بتایا۔ صرف یہ کہا کہ آپ الرسالہ کو پڑھئیں۔ آخر میں انھوں نے اپنی نوٹ بک نکالی اور کہا کہ اس پر کچھ لکھ دیں۔ میں نے قلم لیا اور اس پر یہ الفاظ لکھ دئے: ہر ترقی کا ایک ہی راز ہے، اور وہ محنت ہے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۹۱

کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ نماز روزہ کی زندگی سے ہم کو بڑا سکون ملا ہے۔ میں نے دیکھا تو ان کے جسم خوب فربہ تھے اور چہرہ پر سکون کے آثار نظر آرہے تھے۔

یں نے انھیں ایک حدیث سنائی جس کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ قرآن کی یہ آیت کہ وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں، کیا یہ اس آدمی کے لئے ہے جو زنا کرے اور شراب پئے اور چوری کرے۔ آپ نے فرمایا کہ اے صدیق کی لڑکی، یہ اس آدمی کے لئے ہے جو روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور صدقہ کرے اور ڈرے کہ اس کا عمل غیر مقبول نہ ہو جائے۔

روی الامام احمد والترمذی عن عائشة رضی اللّٰہ عنها قالت. قلت یا رسول اللّٰہ۔ قول اللّٰہ تعالی: ان الذین هم من خشیة ربهم مشفقون (المؤمنون ۵۷) اهو الذی یزنی ویشرب الخمر ویسرق۔ قال۔ لا یا ابنة الصدیق ولکنه الرجل یصوم ویصلی ویتصدق ویخاف ان لا یقبل منه۔

حاتم الاصم سے ان کی نماز کے بارہ میں پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی حد تک پورے اہتمام کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ میری نماز مقبول ہوئی یا وہ میری طرف پھینک دی گئی (ثم لا ادری بعد امقبولة منی ام مردودة علیّ)

۲۹ دسمبر ۱۹۹۱

کچھ کشمیری نوجوانوں سے گفتگو ہوئی۔ وہ پر جوش طور پر اس کے حامی تھے کہ کشمیر کو آزاد ہونا چاہئے یا پھر اس کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ زندگی کے اکثر معاملہ میں، اور اسی طرح کشمیر کے معاملہ میں، اصل چیز وہ نہیں ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ دنیا "آئیڈیل" کے انتخاب کا نام نہیں ہے بلکہ "پریکٹیکل" کے انتخاب کا نام ہے۔ آپ حضرات کی غلطی یہ ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے لئے ہندستانی کشمیر اور آزاد کشمیر میں چوائس ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔ عملی حالت کے اعتبار سے آپ کے لئے جو چوائس ہے وہ ہندستانی کشمیر اور برباد کشمیر میں ہے۔ میرا اور آپ کا فرق حقیقةً یہ نہیں ہے کہ میں ہندستانی کشمیر کا حامی ہوں اور آپ آزاد کشمیر کے حامی ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان حقیقی فرق یہ ہے کہ میں ہندستانی کشمیر کا چوائس قبول کرنا چاہتا ہوں اور آپ برباد کشمیر کا چوائس قبول کئے ہوئے ہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۱

موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں میرے تجربات اتنے تلخ اور اتنے شدید ہیں کہ بے قراری کے ساتھ میری زبان سے نکلا: خدایا، گھاس کا پڑوس مجھے منظور ہے۔ مگر ان مسلمانوں کا پڑوس مجھے منظور نہیں۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۱

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی جس تحریر کو پڑھئے یا جس تقریر کو سنئے۔ ان سب کا خلاصہ صرف دو نکلتا ہے —— اپنے بارہ میں فخر کا ذہن، اور دوسروں کے بارہ میں نفرت کا ذہن۔ یہ دونوں ہی باتیں سراسر غیر اسلامی ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اپنے بارہ میں تواضع کا ذہن اور دوسروں کے بارہ میں خیر خواہی کا ذہن پیدا کیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا پیدا کردہ لٹریچر ان دونوں ہی اسپرٹ سے خالی ہے۔

۱۹۹۲

یکم جنوری ۱۹۹۲

رات کو پٹاخوں کی آواز سے نیند کھل گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی رات کو آخر کس لئے پٹاخے چھوڑے جارہے ہیں۔ گھڑی دیکھی تو اس میں بارہ بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ پھر یاد آیا کہ بارہ بجکر ایک منٹ پر نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اسی کی خوشی میں یہ پٹاخے چھوڑے جارہے ہیں۔

میں نے سوچا کہ لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ، نہ دنیا کی ذمہ داری کا اور نہ آخرت کی ذمہ داری کا۔ اسی لئے وہ نئے سال کی آمد پر خوش ہو کر پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔ اگر لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو تو نئے سال کی آمد انھیں فکرمند کر دے۔ وہ اپنا احتساب کرنے لگیں۔ انھیں پچھلے سال کی کوتاہیاں یاد آئیں اور اگلے سال کی ذمہ داریاں۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو وہ کبھی پٹاخہ بازی جیسے کام میں مشغول نہیں ہو سکتے۔ ان کا احساس ذمہ داری انھیں خاموش کر دے گا نہ کہ وہ غیر سنجیدہ ہو کر شور کرنے لگیں۔

۲ جنوری ۱۹۹۲

جمعیۃ علماء ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور میں نومبر ۱۹۲۱ میں ہوا۔ اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میرے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کی نسبت فرمایا تھا کہ : ابوالکلام نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

اس سبق سے مراد خلافت کی سیاسی تحریک ہے۔ اس کے مطابق تینں بڑے عالم، مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی کے نزدیک مسلمانوں کا بھولا ہوا سبق خلافت تھا۔ حالاں کہ اس کے برعکس، خلافت کا سبق مسلمانوں کو خوب یاد تھا اور اب بھی یاد ہے۔ البتہ جو سبق مسلمان بھول گئے ہیں وہ دعوت ہے۔ موجودہ مسلمانوں کو جس بھولے ہوئے دینی سبق کو یاد دلانے کی ضرورت تھی وہ دعوت ہے نہ کہ سیاست۔

۳ جنوری ۱۹۹۲

مولانا حمید الدین فراہی قرآن فہمی کے لئے حدیث کو اصل نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھنا چاہئے۔ اس پر فراہی اسکول کے ایک صاحب سے گفتگو ہوئی

انھوں نے مولانا فراہی کے مسلک کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ حدیث کی روشنی میں قرآن کی آیت کی تشریح کرنے میں بعض اوقات نہایت بھونڈی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے طور پر سورہ کوثر میں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ نحر سے مراد یہاں قربانی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد نماز میں رفع یدین ہے۔ کیا آپ اس تفسیر سے متفق ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی بعض روایات کی بنیاد پر علی الاطلاق پورے ذخیرۂ حدیث پر کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ابن کثیر حدیث کے ذریعہ قرآن کی تشریح کرنے کے قائل ہیں۔ مگر انھوں نے سورہ کوثر کی تفسیر میں مذکورہ روایتوں پر کلام کیا ہے۔ اور اس کو رد کر کے وانحر سے قربانی کرنا مراد لیا ہے۔ فراہی اسکول بھی ایسا ہی کیوں نہیں کرتا۔ آپ حدیث کی تفسیری اہمیت کو مانتے ہوئے انفرادی روایت کو رد کر دیجئے۔ نہ کہ آپ انفرادی روایت کی بنا پر خود حدیث کی تفسیری اہمیت کو رد کر دیں۔

۴ جنوری ۱۹۹۲

ٹائم میگزین کے شمارہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۱ کی کور اسٹوری سابق روسی صدر میخائیل گورباچیف کے بارہ میں تھی۔ اس کے صفحہ اول پر گورباچیف کی تصویر تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا ـــــــ ایک آدمی جو بے ملک ہو گیا :

A man without a country.

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ صرف گورباچیف کی کہانی نہیں۔ بلکہ ہر آدمی کی کہانی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کا ایک "ملک" ہے جس کا وہ مالک بنا ہوا ہے۔ مگر موت ہر آدمی کو اس کے ملک سے جدا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ ہر چیز سے محروم ہو کر آخرت میں پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے۔

۵ جنوری ۱۹۹۲

پہلی عالمی جنگ میں زار روس کی حکومت کمزور ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹ پارٹی نے روس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس میں مزید توسیع ہوئی۔ اور سوویت یونین وجود

میں آگیا جو آخر کار ایک سپر پاور بن گیا۔

دوسری عالمی جنگ میں ہٹلر کے زیر قیادت نازی پارٹی نے روس پر حملہ کیا مگر اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ اس کا دشمن بن گیا۔ ۱۹۴۷ میں دونوں کے درمیان کولڈوار (سرد جنگ) کا آغاز ہوگیا۔ اس میں جان ومال کی بے شمار بربادی ہوئی۔ مگر امریکہ سوویت یونین کو ختم نہ کرسکا۔ یہاں تک کہ جون ۱۹۹۰ میں کولڈ وار کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا۔

خارجی خطرہ سوویت یونین کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا مگر اندرونی مسائل نے سوویت یونین کو ہلا دیا۔ فروری ۱۹۸۹ میں روسی فوجوں کو افغانستان چھوڑ دینا پڑا۔ دسمبر ۱۹۸۹ میں مشرقی یورپ آزاد ہوگیا اور برلن وال (دیوار برلن) گرا دی گئی۔ دسمبر ۱۹۹۱ میں روسی وفاق کی گیارہ ریاستیں اس سے الگ ہوگئیں۔ ۱۹۹۱ کا خاتمہ سوویت یونین کا بھی خاتمہ بن گیا۔

انتظار خود ایک اعلیٰ تدبیر ہے۔ جو گروہ ناحق پر کھڑا ہو اس کے خلاف کسی کارروائی کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ انتظار کرسکیں تو ایک نہ ایک دن اس کی عمارت اپنے آپ ڈھ پڑے گی۔

۶ جنوری ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں اختلاف کو ایک بھیانک چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ دور اول میں اختلاف بالکل ایک عام بات تھی۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورہ تکاثر امام بخاری کے نزدیک مدنی ہے۔ جب کہ تمام مفسرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار اختلافات ہیں۔ مگر دور اول میں اس قسم کے اختلاف کو برا نہیں مانا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اختلاف کا نام آتے ہی لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہ زوال کی علامت ہے۔

۷ جنوری ۱۹۹۲

نانی پالکھی والا (Nani A. Palkhivala) ہندستان کا مشہور قانون داں ہے۔ اجودھیا کے مسئلہ کے بارہ میں ان کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مقدمہ بازی (litigation) اس مسئلہ کا حل نہیں۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلہ پر پچھلے چالیس سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ مگر اب تک اس کا کوئی حل نہیں نکلا۔

مقدمہ پر مقدمہ عدالت میں ڈالا جاتا رہے گا اور یہ سلسلہ ایک صدی تک جاری رہے گا:

old and new legal proceedings will go on for at least a century.

یہ نہایت درست ہے۔ عدالت کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ سطحی قسم کے مسلمان لیڈروں کا مطالبہ ہے کہ مدراس کا جج مقرر کرکے اس کا فیصلہ حاصل کیا جائے۔ مگر کسی بھی جج کا فیصلہ ہارے ہوئے فریق کو اس سے نہیں روکتا کہ وہ اوپر کی عدالت میں مرافعہ کرے یا نئی شق نکال کر از سر نو مقدمہ کی کارروائی شروع کردے۔

۸ جنوری ۱۹۹۲

ابن کثیر نے ۳۳۱ھ کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سال شاہ روم کا خط خلیفہ کے پاس آیا کہ آپ کے پاس حضرت مسیح کا جو مندیل ہے اس کو آپ ہمیں واپس کردیں تو ہم تمام مسلم قیدیوں کو چھوڑ دیں گے جو ہمارے قبضہ میں ہیں۔ یہ مندیل وہ تھا جس کے متعلق مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح نے اس سے اپنا چہرہ پوچھا ہے۔ خلیفہ نے علماء اسلام کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم مسیحیوں سے زیادہ عیسیٰ کے حق دار ہیں۔ اور اس مندیل کو واپس کرنے میں مسلمانوں کی ذلت ہے اور دین میں کمزوری کی بات ہے (نحن احق بعیسیٰ منھم وفی بعثہ الیھم غضاضۃ علی المسلمین ووھن فی الدین) البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۳۶
ان علماء نے مسلمانوں کی جان کے مقابلہ میں وقار کے مسئلہ کو زیادہ اہم قرار دیا۔ یہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ علماء کا یہ مزاج آج بھی مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔

۹ جنوری ۱۹۹۲

شاہ ولی اللہ صاحب پھلت میں پیدا ہوئے جو مظفر نگر کا ایک قصبہ ہے۔ بعد کو وہ دہلی منتقل ہوگئے۔ ایک صاحب پھلت سے ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ پھلت میں شاہ ولی اللہ صاحب کی کوئی یادگار ہے۔ انھوں نے کہا کہ اور کوئی چیز تو نہیں۔ البتہ ایک موئے مبارک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں حضرت شاہ صاحب کے پاس آئے اور ان کو اپنا ایک بال دیا۔ شاہ صاحب نیند سے اٹھے تو وہ بال ان کے ہاتھ میں موجود تھا۔ یہ مقدس بال اب بھی پھلت میں رکھا ہوا ہے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر شاہ صاحب کو عطیہ دینا چاہتے تھے تو بال سے زیادہ بڑا عطیہ یہ تھا کہ آپ ان کو ملت مسلمہ کے بارے میں رہنمائی دیتے۔ شاہ صاحب آخر عمر تک ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کو سمجھتے رہے۔ حالانکہ یہ بہت سطحی بات تھی۔ ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ انگریزوں کی اور مغربی تہذیب کی یلغار تھی۔ اس یلغار کا آغاز شاہ صاحب کے زمانہ میں ہو چکا تھا اور آئندہ بہت زیادہ بڑھنے والا تھا۔ مگر شاہ صاحب کو اس کا مطلق کوئی شعور نہ ہو سکا۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۲

امریکہ کا سابق صدر لنڈن جانسن علم کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ امریکہ کے بارہ میں ہماری امیدوں کی بنیاد علم پر ہے:

Learning is the basic to our hopes for America.

امریکہ میں مہاجرت کا جو قانون تھا اس میں سفید فام لوگوں کے لئے آسان ضابطے تھے۔ مگر سیاہ فام کے لئے امریکہ میں داخلہ پر سخت ضابطے مقرر کئے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے امریکہ سیاہ فام ماہرین کی خدمات بہت کم حاصل کر پاتا تھا۔ جانسن نے ۱۹۶۵ میں اس قانون میں ترمیم کر کے سب کے لئے یکساں طور پر امریکہ کے دروازے کھول دئے۔ اس نے کہا کہ ہم کو ان کی مہارت کی ضرورت ہے نہ کہ ان کے چمڑے کی:

We need their skills and not their skins

۱۱ جنوری ۱۹۹۲

میں نے عشاء کی نماز ابوالفضل انکلیو (اوکھلا) کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد سنتیں پڑھ رہا تھا کہ ایک احساس دل پر گزرا۔ مجھ کو یاد آیا کہ میری پوری زندگی "مکارہ" میں گزر گئی۔ پھر وہ حدیث یاد آئی کہ حُجِبَتِ الجنۃ بالمکارہ۔ میں نے کہا کہ خدایا، تو ان مکارہ کو میرے لئے جنت کے راستہ میں پیش آنے والے مکارہ بنا دے۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۲

پروفیسر جے جے پوری امریکہ میں رہتے ہیں۔ آج وہ مسٹر جوگندر سنگھ ایم اے کے ساتھ

ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے مختلف قسم کے مذہبی اور روحانی سوال کئے۔ ایک گھنٹہ کی ملاقات میں وہ مسلسل عقل کی نفی کرتے رہے۔ اسی طرح عیسائی پادریوں سے جب میں سنجیدہ گفتگو کرتا ہوں تو وہ بھی عقل کی نفی کرتے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ مذہب تو عقیدہ کا معاملہ ہے اس کو عقل سے جانچنا درست نہیں۔

اصل یہ ہے کہ تمام مذاہب تحریف کی بنا پر عقلی بنیاد سے محروم ہوگئے ہیں۔ یہ صرف اسلام ہے جو عقل کی بنیاد پر پورا اترتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد میں نے مولانا انیس لقمان ندوی سے کہا کہ آجکل ہمارے تمام رہنما مسلمانوں کو خطرات کی خبر سنا رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تمہارا تشخص مٹایا جارہا ہے۔ کوئی بتاتا ہے کہ ہندو اس ملک میں دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب بالکل لغو باتیں ہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طاقت سے باخبر کیا جائے۔ جو اب بھی اسلام کی صورت میں ان کے پاس موجود ہے۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۲

انڈین اکسپریس (۱۲ جنوری ۱۹۹۲) میں سابق سوویت یونین کی ایک تصویر چھپی ہے۔ لینن کا ایک بہت بڑا مجسمہ اوندھے منھ گرا ہوا نظر آتا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ تقریباً ۳۰ سال پہلے خروشچیف نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کمیونسٹ سرمایہ داری کو دفن کر دیں گے:

Communists would bury capitalism. (p. 9)

دوسروں کو دفن کرنے والے خود دفن ہوگئے۔ جدید تاریخ کا یہ واقعہ بھی کیسا عجیب ہے۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۲

ڈاکٹر کرن سنگھ کشمیر کی راجہ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے مرکزی وزیر رہ چکے ہیں۔ آجکل وہ ٹمپل آف ریلیجس انڈر سٹینڈنگ کے چیرمین ہیں۔ ہندستان ٹائمس (۱۳ جنوری ۱۹۹۲) کے مطابق، انھوں نے دہلی میں اپنی ایک تقریر کے دوران بتایا کہ مذہب کا رجحان پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جموں کے وشنو دیوی مندر میں ۱۹۵۰ میں ۲۵ ہزار آدمی زیارت کے لئے گئے تھے۔ ۱۹۹۰ میں یہ تعداد ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی:

He said that 25,000 people visited the Vaishno Devi shrine in 1950. In 1990 the number has become 25 lakh.

وشنو دیوی کا یہ مندر جموں کے پہاڑ کے اوپر ہے۔ وہاں تعلیم یافتہ اور دولت مند ہندو بھی کثرت سے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جموں سے وشنو دیوی کے لئے ہوائی جہاز کی سروس جاری کی گئی ہے۔ اور اس کے لئے وشنو دیوی مندر کے قریب ایک ہوائی پٹی بنائی گئی ہے۔

مذہب کی طرف رجحان کا یہ واقعہ ہر مذہبی گروہ میں ہو رہا ہے۔ مگر بہت سے مسلمان جو اس کو نہیں جانتے وہ اس کو اپنے بزرگوں کے خانہ میں لکھے ہوئے ہیں۔

۱۵ جنوری ۱۹۹۲

مولانا عبد اللہ طارق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آجکل ہمارے علماء اور مسلم رہنما بڑے زور و شور سے ایک خطرہ کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہندستان میں ہمارا اصلی تشخص مٹایا جا رہا ہے۔ آخر یہ تشخص مٹانے کا واقعہ کہاں ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے آج تک کوئی ایسا مسلمان نہیں دیکھا جس نے کرتا پائجامہ اتار کر دھوتی پہن لی ہو یا سر پر چوٹی رکھ لی ہو۔ آپ نے اگر کوئی ایسا مسلمان دیکھا ہو تو بتائیے۔

پھر میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مثال شاہ بانو کیس کی دی جاتی ہے۔ مگر یہ سراسر خلاف تقویٰ (المائدہ ۸) بات ہے۔ عدالت حاکم نہیں ہوتی، عدالت صرف اس آدمی کے معاملہ کا فیصلہ کرتی ہے جو اس کے پاس اپنا مقدمہ لے کر جائے۔ مدینہ میں کچھ مسلمان اپنا مقدمہ یہودی سرداروں کے پاس لے گئے۔ اس کے بارہ میں قرآن میں آیت اتری تو اس میں یہودیوں کی مذمت نہیں کی گئی۔ بلکہ ان مسلمانوں کی مذمت کی گئی جو اپنا مقدمہ یہودی سرداروں کے یہاں لے گئے تھے۔ اسی طرح ہندستانی علماء کو مسلمانوں سے کہنا چاہئے کہ وہ اپنا مقدمہ دار الافتاء میں لے جائیں نہ کہ وہ ملکی عدالت کی مذمت کرنے لگیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۲

امام شافعی اور ان کے پیروؤں کا مسلک یہ تھا کہ نماز میں بسم اللہ پڑھنا واجب اور ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں امام مالک اور ان کے پیروؤں کا مسلک یہ تھا کہ نماز میں بسم اللہ

پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اس قسم کے اختلافات ہمیشہ استنباطی ہوتے ہیں اور استنباط میں اختلاف سے بچنا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے استنباطی امور میں یہی صحیح مسلک ہے کہ ذاتی طور پہ ایک رائے رکھنے کے باوجود دوسرے کی مختلف رائے کا احترام کیا جائے۔ اسی کو امام شافعی نے ان لفظوں میں کہا تھا:
رأیٔ صواب یحتمل الخطاء ورأیٔ غیری خطأ یحتمل الصواب۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۲

قومی آواز (۱۲ جنوری ۱۹۹۲) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک تعلیم یافتہ خاتون یاسمین طلعت آفاق کا مضمون چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "ذاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۴۸ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلم یونیورسٹی میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیتے ہوئے کہا تھا کہ: اردو زبان کو ہمیشہ یہ فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی گئی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔"

آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے بیٹے شہزادہ جواں بخت کی شادی لال قلعہ میں ہوئی۔ تو ذوق اور غالب میں سہرا لکھنے کا مقابلہ ہوا۔ ہر ایک نے مضمون بندی میں کمال دکھایا۔ غالب کے سہرے کا پہلا شعر یہ تھا:

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

غالب کا شعر اور ذاکر حسین کی نثر دونوں کی حیثیت لفظی خیال آرائی کی ہے نہ کہ حقیقت بیانی کی۔ بہادر شاہ ظفر کے دور سے لے کر آج تک اردو زبان پر یہی انداز غالب ہے۔ اردو زبان ابھی تک اس سطحیت سے باہر نہ آسکی۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

آج میں محبوب نگر میں تھا۔ ایک صاحب نے اپنے یہاں صبح کے ناشتہ کے لئے بلایا۔ میں نے کہا کہ میں اس شرط پر آپ کے یہاں ناشتہ کے لئے آؤں گا جب کہ آپ مجھ کو وہی کھلائیں جو آپ روزانہ کھاتے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا۔ جب میں ان کے گھر پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک طرف کھچڑی اور چٹنی ہے۔ اور دوسری طرف دستر خوان پر مختلف قسم کے بسکٹ اور پھل رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا ناشتہ یہی کھچڑی اور

چٹنی ہے۔ میں نے بس یہی تیار کرایا تھا۔ مگر کچھ دیر پہلے فلاں صاحب میرے پاس آئے۔ انھوں نے پوچھا کہ مولانا کے ناشتہ کے لئے کیا انتظام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کھچڑی تیار کرائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تم نے کیا غضب کیا۔ بڑوں کو اس طرح نہیں کھلایا جاتا۔ چنانچہ میں بھاگ کر بازار گیا۔ اور پچاس روپیہ میں یہ پھل اور بسکٹ لے آیا۔

یہ سن کر مجھے اتنا افسوس ہوا کہ اس کے بعد میں ناشتہ نہ کر سکا۔ میرا مزاج یہ ہے کہ سادہ کھانا ہو تو میں شوق سے کھاتا ہوں۔ لیکن اگر دسترخوان پر "پرتکلف دعوت" کا منظر ہو تو میری بھوک غائب ہو جاتی ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۲

آج کشمیر کے کئی تعلیم یافتہ مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فلاں اور فلاں چیز ہم کو دے گا مگر اس نے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں کوئی بھی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ یہاں ہر شخص یا قوم کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی صلاحیت اس نے اپنے اندر پیدا کی ہے۔

میں نے کہا کہ قدیم پاکستان میں بنگالیوں کو یہ شکایت ہوئی کہ پاکستانی فوج پر پنجابیوں کا قبضہ ہے۔ حالاں کہ یہ شکایت کی بات نہیں تھی بلکہ اعتراف کی بات تھی۔ کیوں کہ پاکستانی فوج پر پنجابیوں کا قبضہ اس لئے تھا کہ وہ مارشل ریس سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح تقسیم کے بعد سندھیوں کو یہ شکایت ہوئی کہ مہاجر سندھ کے اقتصادی ذرائع پر قابض ہو گئے۔ مگر یہ بھی شکایت کی بات نہ تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مہاجر لوگ تعلیم میں سندھیوں سے بڑھے ہوئے تھے اس لئے وہ اقتصادی میدان میں زیادہ آگے بڑھ گئے۔ اسی طرح کشمیری بھی جو کچھ بھگت رہے ہیں، وہ اپنے پچھڑے پن کو بھگت رہے ہیں۔ اور پچھڑے ہوئے لوگوں کو ہمیشہ اس کی قیمت دینی پڑتی ہے، خواہ وہ ایک ملک میں ہوں یا دوسرے ملک میں۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۲

۲۰ جنوری کو میں حیدرآباد میں تھا۔ یہاں کے ایک بڑے صنعت کار مجھے اپنی نئی گاڑی پر لے کر کہیں جا رہے تھے۔ گاڑی میں اس وقت صرف ہم دونوں تھے۔ موصوف نے کہا کہ الرسالہ

مشن سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔ میں پابندی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتا ہوں یہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ اکثر جی چاہتا ہے میں سب کچھ چھوڑ کر بس الرسالہ مشن میں لگ جاؤں۔ پھر سوچنے لگتا ہوں کہ بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر قدم رک جاتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ اس قسم کے اندیشے محض فرضی ہوتے ہیں۔ اگر آدمی ایک بار ہمت کرکے اقدام کر دے تو اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ خدا کے فرشتے ہر جگہ اس کے استقبال کرنے کے لئے موجود ہیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۲

مولانا امیر اللہ خاں قاسمی نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک آدمی کھانا کھانے کے لئے ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ ایک کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا: اچھا کھانا، اور دوسرے دروازہ پر لکھا ہوا تھا بہت اچھا کھانا۔ وہ "اچھا کھانا" والے دروازہ میں داخل ہوگیا۔ اندر دوبارہ دو دروازے تھے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا سستا کھانا، اور دوسرے پر لکھا ہوا تھا مہنگا کھانا۔ وہ "سستا کھانا" والے کمرہ میں داخل ہوگیا۔ اب اس کے سامنے دوبارہ دو دروازے تھے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا مفت کھانا، اور دوسرے پر لکھا ہوا تھا قیمتی کھانا۔ وہ آدمی "مفت کھانا" والے دروازہ میں داخل ہوا۔ جب اس نے دروازہ پار کیا تو اس نے اپنے آپ کو سڑک پر پایا۔ پلٹ کر دیکھا تو بیرونی دروازہ پر بورڈ لگا ہوا تھا: اندر آنا منع ہے۔

میں نے کہا کہ اس دنیا میں کامیابی کے گھر میں داخلہ اسی کو ملتا ہے جو اس کی مطلوبہ قیمت دینے کے لئے تیار ہو۔ جو شخص قیمت دینا نہ چاہے اس کو ہر دروازہ پر یہی لکھا ہوا ملے گا۔ اندر آنا منع ہے۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۲

قرآن میں مختلف مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ آخرت کا قول الحمد للہ رب العالمین ہوگا۔ اس پر غور کرتے ہوئے یہ خیال آیا کہ آخرت کا کلام تمام تر حمد اورنیٹیڈ (Hamd oriented) کلام ہوگا۔ ایسی حالت میں وہاں صرف وہی لوگ کلام کے مواقع پائیں گے جو دنیا میں حمد خداوندی

میں چلے۔ جنھیں یہاں حمد کی معرفت حاصل ہوئی۔ جن کی زبان پر یہاں حمد کے کلمات جاری ہوئے۔

ایسے لوگ جب آخرت کے عالم میں داخل ہوں گے تو وہ گویا ایسے لوگ ہوں گے جو امتحان 1
اور تیاری کے مرحلہ میں کلام حمد کی تربیت پا چکے ہیں۔ ان کی تربیت انھیں آخرت کے حمد سے بھرے ہوئے ماحول میں بولنے کے قابل بنا دے گی۔ وہ وہاں اپنی زبان کا بھرپور استعمال پالیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ موجودہ دنیا میں کلام حمد سے خالی رہے وہ آخرت میں بھی کلام حمد سے محروم رہیں گے۔ وہ وہاں من کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ کا مصداق ٹھہریں گے۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۱

یونس سلیم صاحب (نئی دہلی) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ کی درمیانی رات کو اجودھیا کی بابری مسجد کے اندر مورتی رکھی گئی۔ اور یکم فروری ۱۹۸۶ کو ضلعی عدالت کے حکم سے اس کا تالا کھول دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۹ کے واقعہ کے بعد مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی دھوم نہیں مچائی، اگرچہ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد سمیت تمام مسلم اکابر زندہ تھے۔ فروری ۱۹۸۶ کے بعد البتہ اس مسئلہ پر زبردست دھوم مچائی گئی۔ مگر اب تک اس کا کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس طرح کی مختلف باتیں وہ کہتے رہے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل نہ لیڈروں سے ملاقاتیں ہیں اور نہ عدالت اور نہ عوامی ایجی ٹیشن۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ دونوں فریق کو اس پر راضی کیا جائے کہ مورخین کا ایک بورڈ بنایا جائے اور بورڈ جو فیصلہ کرے اس کو دونوں فریق بلا اختلاف مان لیں۔ یہی اس مسئلہ کا واحد باعزت حل ہے۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۲

مولانا نظام الدین اصلاحی سے ٹیلیفون پر جزیہ کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ قرآن (التوبہ ۲۹) میں اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت کو متعین کرنے کے سلسلہ میں علماء اور فقہاء کے درمیان کافی اختلافات ہیں۔ تاہم بنیادی سوال یہ ہے کہ جزیہ کس چیز کا بدل ہے۔ وہ اسلام کا بدل ہے یا جہاد کا بدل۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اسلام کا بدل ہے۔

اور اس کا تعلق دورِ نبوت کے اہل کتاب سے ہے نہ کہ ہر دور کے اہل کتاب اور شبہ اہل کتاب سے۔

اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے اوپر براہ راست پیغمبر کے ذریعہ اتمام حجت کر دی جائے وہ اس کے بعد زندگی کے حق سے محروم قرار پاتے ہیں۔ مشرکین عرب کا معاملہ یہی تھا۔ چنانچہ ان کے بارہ میں حکم دیا گیا کہ تا قبول اسلام ان سے جنگ کرو۔ عرب کے یہود ونصاریٰ کو اس سلسلہ میں جزئی رعایت دی گئی۔ ان کے متعلق یہ حکم آیا کہ اگر وہ جزیہ (مالی فدیہ) ادا کر دیں تو ان سے جزیہ قبول کر کے انھیں چھوڑ دو۔

جس طرح جنگ تا قبول اسلام کا حکم صرف دورِ نبوت کے مشرکین سے تھا۔ اسی طرح جنگ تا ادائے جزیہ کا حکم بھی دورِ نبوت کے اہل کتاب سے ہے۔ اب یہ دونوں حکم عملاً منسوخ ہو چکے ہیں۔ اب مسلم حکومتوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں پر یکساں مالی ٹیکس عائد کیا جائے گا۔ البتہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے لئے خاص رہے گی۔ کیوں کہ وہ مسلمانوں کے لئے مالی عبادت ہے جس طرح نماز ان کے لئے بدنی عبادت ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۲

غلامی (slavery) قدیم زمانہ میں ایک عام رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسلام کا ظہور ہوا تو ہر ملک میں انسانی غلام اسی طرح پائے جاتے تھے جس طرح موجودہ زمانہ میں صنعتی مزدور پائے جاتے ہیں۔ غلام کا آقا اپنے غلام سے ہر قسم کی خدمت لینے کا حق رکھتا تھا۔ حتی کہ آقا اگر اپنے غلام کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرے تو اس کے لئے بھی اسے سماجی اجازت (social sanction) حاصل تھی۔ (صفحہ ۸۵۳)

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ اسلام کے بعد بھی اگرچہ مسلم دنیا میں غلامی ایک عرصہ تک باقی رہی مگر وہ روم اور دوسرے ملکوں کی غلامی سے بہت مختلف (very different) تھی۔ مسلم گھروں میں غلام نہایت اچھے سلوک (well treated) کی حیثیت سے رہتے تھے۔ حتی کہ وہ اقتدار کے منصب پر بھی پہنچ سکتے تھے جس کی ایک ممتاز مثال مملوک سلاطین کی ہے جنھوں نے ۱۲۵۰ سے ۱۵۱۷ تک مصر میں حکومت کی (16/859)

مورخین کا مزید یہ کہنا ہے کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید تو کی مگر اسلام نے غلامی کی مذمت یا اس کے خاتمہ کا قانون جاری نہیں کیا۔ مگر یہی مورخین یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے ظہور کے بعد مسلم دنیا میں غلامی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ (صفحہ ۸۵۹) ان دونوں باتوں کو ملائیے تو اس معاملہ میں اسلام کا موقف واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کے یک لخت خاتمہ کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ اسلام نے اپنے عام اصلاحی اصول کے مطابق، اس کے خاتمہ کے لئے تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔ یہی تدریجی طریق کار تھا جس نے مسلم دنیا سے ہمیشہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۲

ڈاکٹر عبدالکریم نائک (بمبئی) نے ٹیلیفون پر بتایا کہ وہ دہلی کے ایک مشہور مدرسہ تحفیظ القرآن میں گئے۔ وہاں حافظ کے درجہ میں بیس پچیس لڑکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لڑکوں سے پوچھا کہ ' قرآن ' کا مطلب کیا ہے۔ سب لڑکے خاموش رہے۔ آخر میں ایک لڑکے نے کہا کہ اللہ میاں کی کتاب۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ السلام علیکم کا مطلب بتاؤ۔ مگر کوئی لڑکا اس کا مطلب نہ بتا سکا۔

ڈاکٹر صاحب نے استاد سے کہا کہ آپ لوگ طالب علموں کو یہ سب باتیں کیوں نہیں بتاتے استاد نے جواب دیا کہ اگر ہم یہ سب باتیں بتائیں تو طلبہ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور حفظ کرنے میں رکاوٹ پڑے گی۔

یہ صرف مدرسہ تحفیظ القرآن کی بات نہیں۔ یہی موجودہ مدارس کا عام مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس محدود ذہن پیدا کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۲

بی جے پی کے صدر مرلی منوہر جوشی کی قیادت میں ایکتا یاترا نکالی گئی۔ کنیا کماری سے کشمیر تک اس نے ۱۵ ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کیا۔ ۲۵ جنوری کو یہ یاترا جموں میں پہنچی۔ ۲۶ جنوری کو سرینگر پہنچ کر اس نے لال چوک پر انڈیا کا ترنگا جھنڈا لہرایا۔

کشمیر کے دو صاحبان، غلام نبی ہارون ایڈوکیٹ اور محمد امین شاہ آج ملاقات کے

لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۵ جنوری کو وہ جموں میں تھے۔ وہاں انھوں نے "ایکتا یاترا" دیکھی۔ انھوں نے اپنے کان سے ان لوگوں کو یہ نعرہ لگاتے ہوئے سنا: ایک طرف ۳۳ کروڑ، ایک طرف ایک اللہ (یعنی ہندوؤں کی حمایت میں ان کے ۳۳ کروڑ دیوتا ہیں۔ اور مسلمانوں کے پاس تو صرف ایک اللہ ہے۔)

میں نے کہا کہ یہ نعرہ انتہائی حد تک باغیانہ ہے۔ مگر اس پر کشمیر میں یا انڈیا کے مسلمانوں میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اگر یاترا والے یہ نعرہ لگاتے کہ "ہندوؤں کا رام ۳۳ کروڑ، مسلمانوں کا محمد صرف ایک" تو تقریباً ہر جگہ مسلمان مشتعل ہو کر زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں کا مذہب ہیرو پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۲

ایک مغربی مصنف نے ایک بار اسلام اور اس کی سادہ تعلیمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اسلام تو عقل عام کا مذہب ہے:

Islam is the religion of common sense.

عقل عام یا کامن سنس سے مراد فطرت ہے۔ مذہب در اصل فطرت انسانی کا لفظی بیان ہے۔ اس اعتبار سے ہر مذہب حقیقۃً کامن سنس ہی کا مذہب تھا۔ مگر بعد کو ان مذاہب کے علما نے اس میں تبدیلیاں کیں۔ اس بنا پر وہ محرف ہو گیا۔ اسلام چوں کہ غیر محرف مذہب ہے اس لئے وہ اپنی اصل اور ابتدائی صفت کو اب تک باقی رکھے ہوئے ہے۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۲

ایک آدمی کو بائیسکل کی ضرورت ہو تو وہ اس کی قیمت لے کر بازار جائے گا اور ضروری قیمت دے کر اپنے لئے ایک بائیسکل حاصل کر لے گا۔ اگر کوئی شخص مجھ سے یہ پوچھنے آئے کہ بائیسکل کیسے ملتی ہے تو میری رائے یہ ہوگی کہ وہ قیمت دئے بغیر بائیسکل کا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ بازار جانے کے بجائے میرے پاس آیا ہے۔

مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی معرفت کیسے ملتی ہے۔ تقویٰ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگ پوچھتے ہیں کہ لکھنا کیسے آتا ہے۔ کوئی آدمی مصنف کیسے بنتا ہے۔ وغیرہ۔ میں اکثر سوچتا

ہوں کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی کسی سے اس قسم کا سوال نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کیوں اس قسم کے سوال کرتے ہیں۔

غور کرنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ اس قسم کا سوال کرنے والے کا معاملہ وہی ہے جو بائیسکل کے لئے پوچھنے والوں کا معاملہ ہے۔ یہ لوگ قیمت دئے بغیر معرفت رب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قیمت دئے بغیر لکھنے والا بننا چاہتے ہیں۔ اگر وہ قیمت دے کر معرفت حاصل کرنا چاہتے یا قیمت دے کر لکھنے والا بننا چاہتے تو مجھ سے یا کسی سے اس قسم کا سوال نہ کرتے۔ انھیں پوچھے بغیر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی ایک قیمت ہے اور وہ قیمت ادا کرکے ہی میں اپنی مطلوب چیز حاصل کر سکتا ہوں۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۲

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اپنی کتاب "اقوال حکمت" میں لکھا ہے کہ "اکثر لوگ زندگی کی کتاب پڑھنا شروع کر دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انھوں نے زندگی کی زبان سیکھی ہو"۔ انھوں نے کہا کہ اس قول کا مطلب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ خود اپنی مثال سے اس قول کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ آپ ابھی ہندستان کی خرابیوں کا ذکر کر رہے تھے کہ یہاں انصاف نہیں، یہاں مسلمانوں کے ساتھ تعصب کا معاملہ کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ یہ زبان جو آپ بول رہے ہیں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمانوں کی بولی یہی ہے۔ یہ صحیح زبان نہیں۔ اگر آپ کو یہی زبان معلوم ہے تو یہ زبان آپ کو زندگی کی کتاب کو سمجھنے میں مدد نہیں دے سکتی۔

میں نے کہا کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو آزادی ہے۔ اس لئے یہاں آپ بالکل اپنی مرضی کا ماحول نہیں پا سکتے۔ یہاں لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں گے۔ اس لئے یہاں آئیڈیل زندگی کا بننا ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہے — معیار سے کم (less than ideal) پر راضی ہونے کا۔ معیار سے کم پر راضی ہونے والا آدمی اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔ جو لوگ معیار سے کم پر راضی نہ ہوں ان کو اس دنیا میں شکایت اور مایوسی کے سوا کچھ اور نہیں مل سکتا۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۲

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے پوچھا کہ کیا آپ ہندستانی ٹی وی دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندستانی حکومت ٹی وی کو مسلسل اور منظم طور پر بھارتی سنسکرتی اور ہندستان کی قدیم تہذیب کا پروپگنڈا کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ اس نے ٹی وی کو بھارت کی مشرکانہ اور ہندوانہ تہذیب کے پرچار کا ادارہ بنا دیا ہے۔

میں نے کہا کہ میں جانتا ہوں۔ مگر اس بظاہر عسر میں بھی یسر کا پہلو چھپا ہوا ہے۔ ٹی وی کا محکمہ اپنے خیال کے مطابق، ہندوانہ تہذیب کا پرچار کر رہا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہندوانہ تہذیب بےنقاب expose ہو رہی ہے۔ اس تہذیب میں جدید انسان کے لئے کوئی کشش نہیں۔ یقینی ہے کہ یہ برعکس نتیجہ پیدا کرنے والا (counter productive) ثابت ہوگا۔ گویا کہ جو کام اہل توحید کو کرنا تھا وہ خود اہل شرک کر رہے ہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے یہ "لاالٰہ" کا اعلان ہے۔ آپ کوشش کیجئے کہ آپ اس کی تکمیل کریں۔ اور اس کے بعد وہ دن آئے کہ آپ لوگوں کے سامنے الا اللہ کا اعلان کر سکیں۔

یکم فروری ۱۹۹۲

۱۹۵۵ میں مڈل ایسٹ کے تحفظ کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں ترکی، عراق، ایران، پاکستان شامل تھے۔ اسی کے ساتھ برطانیہ (گریٹ برٹین) کو بھی اس میں شریک کیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کا نام بغداد پیکٹ تھا۔ بعد کو وہ سنٹو کے نام سے مشہور ہوا۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی (۱۹۶۳ — ۱۸۹۳) سے کسی نے کہا کہ یہ تو شرق اوسط کے تحفظ کا معاہدہ ہے، پھر اس میں برطانیہ کو کیوں شریک کیا گیا ہے۔ سہروردی نے جواب دیا کہ برطانیہ کی شرکت ہی کی بنا پر تو اس معاہدہ کی قیمت ہے۔ ورنہ مسلم ملکوں کی حیثیت تو زیرو کی ہے۔ اور زیرو خواہ کتنے ہی ہوں، ان کا مجموعہ پھر بھی زیرو ہی رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ زیرو پلس زیرو پلس زیرو پلس زیرو از ایکول ٹو زیرو۔

۲ فروری ۱۹۹۲

تاجکستان سابق سوویت یونین کا حصہ تھا۔ پہلے وہاں صرف ۱۸ مسجدیں تھیں۔ پرسترائیکا

کا دور آیا تو ایک سال کے اندر وہاں مسجدوں کی تعداد ۲۵۰۰ ہوگئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۷۰ سالہ کیمونسٹ کا مخالف مذہب نظام بھی وہاں اسلام کو ختم نہ کرسکا۔ چنانچہ آزادی ملتے ہی فوراً اسلام از سر نو زندہ ہوگیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا تعلق فطرت سے ہے۔ وہ انسانی فطرت کی طلب ہے اور جو چیز فطرت انسانی میں شامل ہو اس کو کسی بھی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔

۳ فروری ۱۹۹۲

خلیج کی جنگ کے زمانہ میں کسی نے عراق کے صدر صدام حسین سے پوچھا کہ آپ کی ہار کا کتنا امکان ہے۔ صدام حسین نے جواب دیا: واحد فی ملیون (۱۰ لاکھ میں ایک) مگر جنگ کے نتیجہ نے بتایا کہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ لفظ بولنا کتنا آسان ہے اور حقیقت کو اپنے موافق بنانا کتنا زیادہ مشکل۔

۴ فروری ۱۹۹۲

ہندستان ٹائمس (۳۰ جنوری ۱۹۹۲) میں بتایا گیا ہے کہ سابق کیمونسٹ ایمپائر کی سب سے بڑی (most prestigious) لائبریری سے ولادیمیر لینن کا نام حذف کر دیا گیا ہے پہلے اس لائبریری کا نام لینن اسٹیٹ پبلک لائبریری تھا۔ اب اس کا نام صرف رشین اسٹیٹ لائبریری ہوگا۔ اس خبر کی سرخی یہ ہے:

Lenin's name deleted.

یہ دنیا کسی انسان کی عظمت کو قبول نہیں کرتی۔ اس کے باوجود اگلا شخص جو آتا ہے وہ پھر عظمت کا ایک مینار کھڑا کرکے اپنا نام اس پر لکھتا ہے، صرف اس لئے تاکہ دوبارہ مینار عظمت سے اس کا نام حذف کر دیا جائے۔

۵ فروری ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (یکم فروری ۱۹۹۲) کی ایک خبر کا عنوان ہے ——— ذہانت کا تعلق چھاتی کے دودھ سے:

I Q linked to breast milk

خبر میں بتایا گیا ہے کہ لندن میں ایک اسٹڈی کی گئی جس میں تین سو بچوں کو لیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن بچوں کو چھاتی کا دودھ پلایا گیا تھا وہ ذہانت میں نمایاں طور پر فائق تھے۔ ڈاکٹر الان لوکاس (Alan Lucas) نے کہا کہ یہ اسٹڈی اگرچہ قطعی ثبوت نہیں ہے۔ مگر وہ بہت مضبوط شہادت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چھاتی کے دودھ میں کوئی ایسا غیر معلوم جزء ہوتا ہے جو ذہن کی ترقی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۶ فروری ۱۹۹۲

آج صبح کو اشراق کے وقت دو رکعت نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے دوران اچانک یہ احساس ہوا کہ نماز عبادت کی آخری صورت ہے۔ اس سے آگے عبادت کی کوئی اور صورت تجویز نہیں کی جا سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائی ہیں وہ سب کی سب اپنے آخری نمونہ پر ہیں۔ شیر کا جو ماڈل ہے وہ اس کا آخری ماڈل ہے۔ اس سے آگے شیر کا کوئی اور ماڈل سوچا نہیں جا سکتا۔ چڑیا کا جو ماڈل ہے وہ اس کا آخری ماڈل ہے۔ کسی آرٹسٹ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ چڑیا کا اس سے بہتر کوئی اور ماڈل بنا سکے۔ حتی کہ گھاس کا جو ماڈل ہے وہ بھی اس کا آخری موزوں ترین ماڈل ہے۔ اس سے آگے گھاس کا کوئی اور ماڈل تصور میں نہیں آتا۔ یہی معاملہ دنیا کی ہر چیز کا ہے۔

اسی طرح نماز کی جو صورت تجویز کی گئی ہے وہ بھی اس کی آخری کامل صورت ہے۔ اس کے آگے عبادت کی کوئی اور صورت تصور میں نہیں آتی۔ یہ بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ نماز کی صورت خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ کوئی انسان ایسی کامل صورت تجویز کرنے پر قادر نہیں۔

۷ فروری ۱۹۹۲

اوکھلا (نئی دہلی) میں ایک مسجد چھپروالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کے سامنے ہیر کٹنگ کی ایک دکان ہے۔ دکاندار کا نام محمد یامین (۳۵ سال) ہے۔ وہ اس دکان میں بطور کرایہ دار ہیں۔ ایک سال پہلے ان کے مسلمان مالک مکان نے آکر کہا کہ آپ دکان خالی کر دیں۔ اس وقت محمد یامین صاحب کسی کا شیو بنا رہے تھے۔ انھوں نے مالک سے کوئی

بحث نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ "یہ شیو پورا کر دوں، اس کے بعد خالی کر دیتا ہوں"۔ مالک کھڑا رہا محمد یامین صاحب نے شیو بنانے کے بعد دکان کا سامان نکال کر باہر رکھنا شروع کیا۔ مالک نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ آپ دکان خالی کرکے کہاں جائیں گے۔ محمد یامین صاحب نے کہا: جہاں میرا اللہ لے جائے گا وہاں چلا جاؤں گا۔

اس کے بعد مالک نرم پڑ گیا۔ اور موافقت کی بات کرنے لگا۔ آخر یہ طے ہوا کہ محمد یامین صاحب آدھی دکان اپنے پاس رکھیں اور بقیہ آدھا حصہ خالی کر دیں۔ محمد یامین صاحب فوراً راضی ہو گئے۔ اس وقت سے وہ اس دکان کے نصف حصہ میں ہیں۔ البتہ کرایہ پہلے کی طرح پورا دے رہے ہیں۔ بقیہ نصف حصہ میں دوسرا کرایہ دار ہے۔ وہ بھی اتنا ہی کرایہ دے رہا ہے۔ اس طرح مالک کو دگنا کرایہ مل رہا ہے۔ اور یہی اس کا اصل مقصد تھا۔ (حسب روایت ڈاکٹر انور عباس، ذاکر نگر)

۸ فروری ۱۹۹۲

جاوید احمد (سمستی پور) نے تاریخ میں آنرس کیا ہے۔ اب وہ دہلی میں ایڈمیشن کے لئے آئے ہیں۔ ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں دو مسلمان (محی الدین اور سعید اختر) تین سال سے مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ اور دونوں کی معاشیات تباہ ہو رہی ہیں۔ اور ابھی تک مقدمہ بازی ختم ہونے کے آثار نہیں۔

دونوں مسلمانوں کا کھیت ملا ہوا ہے۔ محی الدین کے کھیت میں مینڈ کی طرف بانس اُگ آیا جو بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ بانس سعید اختر کے کھیت کی طرف نکل آئے۔ سعید اختر نے کہا کہ اپنا بانس کاٹو۔ محی الدین فوراً کاٹنے پر راضی نہ ہوئے۔ ایک روز سعید اختر اپنے لڑکے کو لے کر کھیت پر گئے اور خود بانس کاٹنا چاہا۔ محی الدین نے مزاحمت کی۔ دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ یہاں تک کہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو پریشان کرنے کے لئے نئے نئے مقدمات ایک دوسرے کے خلاف دائر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دونوں کے اوپر کئی کئی مقدمات ہو گئے۔

تین سال سے دونوں مقدمہ بازی میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ ہر

ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا رہتا ہے۔ تین سال کے عرصہ میں دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں پایا۔ البتہ دونوں کا گھر ویران ہوگیا۔

اس دنیا میں ہمیشہ چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو آدمی چھوٹے نقصان کو برداشت کرنے پر راضی نہ ہو اس کو لازماً بڑا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

۹ فروری ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (۳ فروری ۱۹۹۲) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ میں انڈیا کا حصہ ایک فیصد سے بھی کم (0.5 per cent) ہے۔ موجودہ انڈیا نہرو کی دین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جواہر لال نہرو انڈیا کو عالمی نقشہ پر لے آئے۔ مگر آخری نتیجہ بتاتا ہے کہ انڈیا کے اسٹیج کو استعمال کر کے وہ اپنی شخصیت کو عالمی نقشہ پر لائے نہ کہ خود انڈیا کو۔ ان کے زمانۂ حکومت میں ہر جگہ ان کی ذاتی دھوم رہی۔ مگر انڈیا کسی بھی اعتبار سے ترقی نہ کر سکا۔

یہی حال مسلم رہنماؤں کا بھی ہے۔ ہر مسلم رہنما کہہ رہا ہے کہ وہ اسلام کو عالمی سطح پر نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ مگر عملاً صرف اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلم رہنماؤں اور غیر مسلم رہنماؤں میں کوئی فرق نہیں۔

۱۰ فروری ۱۹۹۲

آدمی کو مختلف قسم کی لذتیں حاصل ہیں۔ ہر آدمی ان لذتوں سے محظوظ ہوتا ہے —— لذت فکر، لذت دید، لذت ذائقہ، لذت سامعہ، لذت شامہ، وغیرہ۔ مگر شاید ہی کوئی آدمی ہو جو سوچتا ہو کہ لذت اللہ تعالیٰ کی ایک انوکھی تخلیق ہے۔ اس کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو لذت کا احساس ملا ہوا ہے۔ انسان کے سوا وسیع کائنات میں کسی کو بھی لذت احساس حاصل نہیں۔

دورِ جدید کا ایک کارخانہ انسان کی صورت کی ایک مشین بنا سکتا ہے۔ یہ مشینی انسان بہت سے انسان جیسے کام بھی کر سکتا ہے۔ مگر کوئی کارخانہ کسی مشینی انسان کے اندر لذت احساس پیدا نہیں کر سکتا۔ آدمی اگر خدا کی دی ہوئی اس نعمت پر غور کرے تو وہ شکر کے سمندر میں غرق ہو جائے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا ہر روز اپنے اداریہ کے صفحہ پر ایک قول نقل کرتا ہے۔ آج کے شمارہ میں اس نے مشہور سائنس داں آئن اسٹائن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امن کبھی طاقت کے ذریعہ قائم نہیں کیا جاسکتا، امن صرف مفاہمت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے:

Peace cannot be kept by force. It can only be achieved by understanding.

یہ نہ صرف کامن سنس کی بات ہے بلکہ یہی دور جدید کے انسان کا ذہن ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ اسلام کا یہ تصور پیش کر رہے ہیں کہ اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ جنگ کر کے دنیا میں امن قائم کیا جائے وہ نہ صرف ایک احمقانہ بات کہتے ہیں بلکہ خود ساختہ طور پر اسلام کی ایسی تصویر بنا رہے ہیں جس سے دور جدید کا انسان متوحش ہو کر اسلام سے دور ہو جائے۔

۱۲ فروری ۱۹۹۲

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیویوں پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کا کئی نکاح کرنا اعتراض کی بات نہیں بلکہ بہت بڑے سبق کی بات ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی عمر کے ۵۳ سال تک صرف ایک بیوی پر قناعت کی۔ اوّلاً خدیجہ اور اس کے بعد سودہ۔ یہ صرف آخری دس سال ہیں جبکہ آپ نے کئی بیوہ خواتین سے نکاح کیا۔ یہ کئی نکاح سیاسی مصلحت کے تحت تھے نہ کہ جنسی مصلحت کے تحت۔

ابتدائی ۵۳ سال تک آپ کی حیثیت صرف ایک داعی کی تھی۔ آخری دس سال میں آپ حکمراں کی حیثیت سے دنیا میں رہے۔ انھیں دس سالوں میں آپ نے کئی نکاح فرمائے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بعد کے یہ نکاح کسی مصلحت کے تحت کئے گئے۔ بعد کے یہ نکاح دراصل قبائل عرب کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے کئے گئے تھے۔ جس قبیلہ کی عورت یا جس قبیلہ کے سردار کی بیٹی سے آپ نے نکاح کر لیا وہ قبیلہ اس کے بعد آپ کی مخالفت چھوڑ کر آپ کا حامی بن گیا۔

اسی تدبیر کو پندرھویں صدی عیسوی میں اسپین کے مسیحی حکمراں فرڈیننڈ دوم نے اختیار کیا۔

اس نے ملکہ ازابیلا سے نکاح کرکے اپنی سلطنت کا رقبہ بہت بڑا کرلیا۔ اور اس کے بعد اس کے لئے آسان ہوگیا کہ اسپین کی مسلم سلطنت کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کرسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوہ مسلم حکمرانوں کے لئے ایک نمونہ تھا۔ مگر بعد کے مسلم حکمراں اس سے نصیحت نہ لے سکے، اس لئے وہ اس حکیمانہ تدبیر کو اپنی زندگی میں اختیار بھی نہ کرسکے۔

۱۳ فروری ۱۹۹۲

ولیم بلیک (William Blake) ایک انگریز شاعر تھا۔ وہ لندن میں ۱۷۵۷ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۲۷ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول ہے کہ تم کبھی نہیں جانتے کہ کافی کیا ہے جب تک تم یہ جان لو کہ کافی سے زیادہ کیا ہے:

You never know what is enough, unless you know what is more than enough.

اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ آدمی قناعت کے مسلک پر اس وقت قائم ہوسکتا ہے جب کہ وہ ضرورت اور حرص کے فرق کو جان لے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے بقدر ضرورت کو حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن اپنے بقدر حرص کو حاصل کرنا اس دنیا میں کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں۔ کیوں کہ ضرورت کی حد ہے، مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

۱۴ فروری ۱۹۹۲

عبدالقادر بٹ ایم اے (۳۰ سال)، ڈوڈا کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ وہ وہاں ہائی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ ان کی فرمائش پر میں نے ان کی نوٹ بک پر حسب ذیل الفاظ لکھے:

اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) ——— اس کا ایک سیدھا مطلب ہے۔ اور اس کا ایک الٹا مطلب ہے۔ اگر آپ کہیں کہ "اللہ بڑا ہے، اس لئے میں بڑا نہیں ہوں" تو آپ نے اس کا سیدھا مطلب لیا۔ ایسا کلمہ آپ کو چھوٹا بنائے گا۔ اس سے آپ کے اندر عجز اور تواضع کا مزاج پیدا ہوگا جو کہ دین کی اصل روح ہے۔

اس کے برعکس اگر آپ کہیں کہ "اللہ بڑا ہے اس لئے تم بڑے نہیں ہو" تو یہ اس کا الٹا مطلب ہوگا۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ الٹا مطلب آجائے تو آپ کا حال یہ ہوگا کہ آپ خود اپنی

اصلاح سے غافل ہو جائیں گے۔ البتہ اللہ کے نام پر دوسروں کو چھوٹا کرنے کا جھنڈا اٹھائیں گے۔
اس کے بعد آپ کے اندر جو مزاج پیدا ہوگا وہ سرکشی اور ذاتی بڑائی کا مزاج ہوگا۔
"اللہ اکبر" کا سیدھا مطلب لینے والوں سے دنیا کو امن کا تحفہ ملتا ہے، اور اللہ اکبر کا الٹا مطلب لینے والوں سے صرف فساد کا۔

۱۵ فروری ۱۹۹۲

ایک مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے ایک بار ایک مسلم نوجوان کے سامنے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی بات کی۔ اور کہا کہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے بڑی بڑی ایجادات کی تھیں۔ یہ سن کر مسلم نوجوان نے تلخ لہجہ میں بجلی کے پنکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: جناب یہ پنکھا بھی مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا ہوگا۔ (دین مبین، بھوپال، فروری ۱۹۹۲)

یہ سطریں میں نے پڑھیں تو میں نے سوچا کہ مفتی صاحب قوم کی عظمت میں کھوئے ہوئے ہیں، اس لئے مذکورہ نوجوان کا جواب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اگر وہ اسلام کی عظمت کو جانتے تو وہ کہتے کہ بجلی کے پنکھے کو تو مسلمانوں نے ایجاد نہیں کیا۔ مگر اسلام نے ضرور اس کو ایجاد کیا ہے۔ پچھلے زمانوں میں شرک (فطرت پرستی) کا عقیدہ سائنسی ترقیوں کی راہ میں ایک ذہنی رکاوٹ mental block بنا ہوا تھا۔ اسلام نے مشرکانہ عقیدہ کو ختم کرکے توحید کا ذہن پیدا کیا۔ اس کے بعد ہی دنیا میں سائنسی ترقیات کا راستہ کھلا جس کا ایک نتیجہ بجلی کا پنکھا ہے۔

۱۶ فروری ۱۹۹۲

قرآن کی آیت شاکلہ (الاسراء ۸۴) پر غور کرنے سے اور اس نوعیت کے تجربات کو دیکھ کر میں اس رائے پر پہنچا ہوں کہ آدمی اسی بات کو سمجھ پاتا ہے جس سے اس کا شعور پہلے سے آشنا ہو۔ جو بات اس کے زندہ شعور میں موجود نہ ہو اس کو وہ سمجھ بھی نہیں پاتا۔

موجودہ مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ دور اول کا اسلام ان کے زندہ شعور سے خارج ہو چکا ہے۔ اسلام کے نام سے اب وہ صرف بعد کے دور کی اسلامی تاریخ کو جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی اسلام جب ان کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ اس کو پہچان نہیں پاتے۔ حدیث کی زبان میں ایسا اسلام انھیں غریب (اجنبی) صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ خدا ان کے زندہ شعور سے خارج ہے۔ اس کی جگہ اب ان کے اکابر نے لے لی ہے۔ اب وہ اسوہ والے رسول کے بجائے صرف فخر والے رسول کو جانتے ہیں۔ اب وہ تواضع والے دین کے بجائے عظمت والے دین سے باخبر ہیں۔ اب وہ صبر کی اصطلاح میں سوچنے کے بجائے صرف جہاد کی اصطلاح میں سوچنا جانتے ہیں۔ وہ دعوت سے بے خبر ہیں، البتہ امامت کا سبق انھوں نے مبالغہ کے ساتھ پڑھ رکھا ہے۔ وہ امت کی مسئولیت کو نہیں جانتے، البتہ امت کا خیر امت ہونا انھیں خوب معلوم ہے۔

ایسی حالت میں جب تک مسلمانوں کے شاکلہ کی تصحیح نہ کی جائے ان کی حقیقی اصلاح ہرگز ممکن نہیں۔

۱۷ فروری ۱۹۹۲

عرب کا قدیم دور شاعری کا دور تھا۔ اس زمانہ میں شعر گوئی کی بدولت آدمی شہرت، عزت اور سرداری حاصل کر لیتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک عرب شاعر نے کہا کہ جب میں ایک شعر کہتا ہوں تو سارا زمانہ میرے اس شعر کو پڑھنے لگتا ہے:

اذا قلتُ شعراً اصبح الدهر منشداً

موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اسی قدیم جاہلی دور میں جی رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ "شعر" کی زبان میں ایک بات کہہ دیں تو تمام دنیا کے لوگ اس پر سر دھننے لگیں گے۔ چنانچہ تمام اہل دانش شعر اور خطابت اور انشا پردازی کا دریا بہانے میں مشغول ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ موجودہ زمانہ میں شاعرانہ اسلوب متروک ہو چکا ہے۔ اب دنیا میں جس اسلوب کی اہمیت ہے وہ سائنٹفک اسلوب ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں چھپنے والی بے شمار کتابوں میں شاید ایک کتاب بھی نہیں جو سائنٹفک اسلوب میں لکھی گئی ہو۔

۱۸ فروری ۱۹۹۲

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خود نوشت سوانح عمری "کاروان زندگی" کا حصہ اول پڑھا۔ اس کو پڑھ کر جو تاثر ہوا وہ یہ تھا:

لوگ خدا کو بھول کر انسان کی عظمتوں میں گم ہیں۔ اور اس کو ایمان سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو جوش پیدا

ہوتا ہے تو "صمصام الاسلام" کی کہانیوں سے۔ ان کو تحریک ملتی ہے تو مفروضہ اکابر کی داستانوں سے۔ لوگ اقبال کے شاعرانہ الفاظ سے مسحور ہو رہے ہیں۔ مگر کائنات میں خدا کے کرشمے انھیں مسحور نہیں کرتے۔ لوگوں کے پاس انسانوں سے ملاقات کے تذکرے ہیں مگر خدا سے ملاقات کا ان کے یہاں کوئی تذکرہ نہیں۔

خدا اس انتظار میں ہے کہ اس کی حمد کی جائے۔ مگر کتاب کا باب کا باب ختم ہوتا چلا جاتا ہے اور قاری کو وہ صفحہ نہیں ملتا جہاں مصنف کا قلم خدا کی کبریائی بیان کرنے کے لئے وجد میں آگیا ہو۔ زندگی کا کارواں کہیں بھی خدا کی آلاء سے بھری ہوئی دنیا میں سفر کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اپنے اکابر کے تذکروں سے سفر شروع ہوتا ہے اور انھیں کے تذکرہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۲

فقہاء کے یہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ زمانہ اور حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں (تتغیر الاحکام بتغیر الزمان) ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین میں "فصل فی تغیر الفتویٰ بتغیر الزمان" کے الفاظ میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اس میں اس موضوع پر قیمتی بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قیمتی ذخیرہ حافظ ابن تیمیہ کے فتاویٰ (فتاویٰ ابن تیمیہ) ہیں جو ۳۵ جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ وہ مجموعی طور پر ۱۹ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ بیروت کے ڈاکٹر منجد نے فتاویٰ ابن تیمیہ میرے لئے بحری ڈاک سے بھیجی تھی۔ مگر معلوم نہیں کیا بات پیش آئی، وہ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔

۲۰ فروری ۱۹۹۲

مولانا محمد حمید اللہ صاحب ایک کشمیری ہیں۔ وہ اسلام آباد کے پاس کھانڈی پورہ میں ایک مدرسہ چلاتے ہیں۔ بقدر ضرورت انگریزی بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دو سال پہلے وہ سری نگر میں تھے۔ وہاں انھوں نے ایک مغربی نوجوان کو دیکھا۔ وہ ایک دکان سے بانسری خرید رہا تھا۔ اس سے انھوں نے قیاس کیا کہ اس کے اندر روحانی مزاج ہے۔ انھوں نے اس سے بات کی۔ اور پھر اس کو اپنے مدرسہ میں لے گئے۔

وہ کناڈا کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرا مزاج

بچپن سے عام لوگوں سے مختلف ہے۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی اور نہ کبھی زنا کے قریب گیا۔ وہ تین دن تک مدرسہ کے ماحول میں رہا۔ اس کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔

۲۱ فروری ۱۹۹۲

کہا جاتا ہے کہ نیوٹن نے ایک سیب کو درخت سے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ اس پر وہ سوچنے لگا کہ سیب نیچے کیوں گرا۔ یہاں تک کہ اس نے قوت کشش کا قانون دریافت کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک سائنس داں نے کہا کہ نیوٹن کو اس پر تعجب تھا کہ سیب نیچے کیسے آیا۔ مجھے اس پر تعجب ہے کہ سیب اوپر کیسے گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کائناتی واقعات کی مادی توجیہہ ممکن نہیں۔ بظاہر کچھ واقعات کو دیکھ کر نظر آئے گا کہ وہ مادی توجیہہ کو قبول کر رہا ہے۔ مگر زیادہ وسیع مطالعہ بتائے گا کہ واقعات کو سمجھنے کے لئے مادی توجیہہ سراسر ناکافی ہے۔

۲۲ فروری ۱۹۹۲

مولانا حسین احمد مدنی کا معمول تھا کہ جب وہ خط لکھتے تو آخر میں اپنے دستخط کے ساتھ "ننگ اسلاف" لکھا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ "دارالعلوم" کے شمارہ فروری ۱۹۹۲ میں مولانا موصوف کے ایک شاگرد محمد صفات اللہ قاسمی کا ایک مضمون فرقہ وارانہ فسادات کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں شاگرد موصوف نے جہاں اپنا نام لکھا ہے، اسی کے ساتھ "ننگ مدنی" کا لفظ بھی شامل کیا ہے۔

یہ طریقہ میرے نزدیک ایک بدعت ہے اور بدعت سے کبھی خیر ظاہر نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو "ننگ انبیاء" نہیں فرمایا۔ آپ کے بعد ابو بکر و عمر نے اپنے آپ کو ننگ صحابہ نہیں کہا۔ اس کے بعد عمر بن عبد العزیز آئے مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی ننگ خلفاء کا لفظ نہیں لکھا۔ دور اول میں جو طریقہ رائج نہ رہا ہو اس کو بعد کے دور میں اختیار کرنا اسی کا نام بدعت ہے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۲

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ابھی ان سے گفتگو شروع ہوئی تھی کہ اچانک رونے

لگے۔ وہ ابھی جوان ہیں۔ مگر میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ ایسے سوکھے اور دبلے لگ رہے تھے جیسے کہ وہ موت کے قریب پہنچ گئے ہوں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ہر مہینہ تھوڑی تھوڑی رقم بچا کر بینک میں جمع کی تھی۔ اب یہ رقم گیارہ ہزار روپے ہو گئی تھی۔ ایک شخص نے باتیں بنا کر انھیں متاثر کیا اور گیارہ ہزار روپے انھوں نے اس آدمی کو بطور قرض دے دیا۔ اس کے بعد وہ آدمی بھاگ گیا۔ دو مہینے گزر گئے اور اب تک اس کا کوئی پتہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے جینے کا حوصلہ کھو دیا ہے۔ حتی کہ خدا سے بھی میرے اندر شکایت پیدا ہو گئی ہے۔

میں نے انھیں سمجھایا، ڈھارس دلائی۔ آخر میں میں نے انھیں گیارہ روپیہ دیا اور کہا کہ جس بینک میں آپ کی رقم تھی وہاں اس کو جمع کر دیں۔ میں نے مزید کہا کہ آپ یہی گیارہ روپیہ اس کو بدلے بغیر جمع کریں۔ انشاء اللہ اس میں برکت ہو گی اور دوبارہ آپ کے بینک میں گیارہ ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔

یہ میں نے ایک نفسیاتی تدبیر کے طور پر کیا۔ بعد کو میں نے سوچا کہ بزرگوں کے بارہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات جو مشہور ہیں وہ حقیقۃً اسی طرح کی نفسیاتی نوعیت کے تھے۔ بعد کو لوگوں نے اس کو خوش عقیدگی کے تحت مقدس اور پراسرار بنا دیا۔

۲۴ فروری ۱۹۹۲

یہ ایک عام حقیقت ہے کہ قومیں زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ ایک قوم ابھرتی ہے وہ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ اس کے افراد جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تمام لوگ اس کو بطور تاریخی حقیقت کے مانتے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ عروج کے بعد زوال آنے کا سبب کیا ہے۔ سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ ان کے درمیان چیلنج کا ختم ہو جانا ہے۔ چیلنج ہی وہ چیز ہے جو فرد یا قوم کو اوپر اٹھاتا ہے اور جب چیلنج باقی نہ رہے تو اوپر اٹھنا بھی رک جاتا ہے۔

کوئی خاندان یا کوئی قوم جب ترقی کرتے کرتے سب کچھ حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بعد افراد کو زندگی کے ساز و سامان کسی خاص جد و جہد کے بغیر ملنے لگتے ہیں۔ بس یہیں سے ان کا تنزل

شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک عرصہ کے بعد تمام افراد جمود، بے عملی اور آرام طلبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی حالت کا نام زوال ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں امریکہ کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے یہاں نہایت سخت قسم کا کامپٹیشن قائم کر دیا۔ ان کا ماحول کرو یا مرو" کا ماحول ہے۔ اس لئے امریکہ کا ہر آدمی ہر لمحہ الرٹ رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے لیاقت نہیں دکھائی تو میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہاں ہر آدمی اپنی صلاحیت کے آخری حد پر عمل کرتا ہے۔ جبکہ ہندستان میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۹۲

مجھ کو حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے آج میں جامعہ ملیہ گیا۔ کہ وہاں کی لائبریری سے اس کو حاصل کروں۔ وہاں پہنچا تو تمام گیٹ بند تھے۔ سڑک پر بڑی تعداد میں طلبہ گھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ پولیس کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ کل ایک جھگڑا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے طلبہ کی یونین نے عام اسٹرائک کر دی۔

سڑک پر سیکڑوں کی تعداد میں مسلم نوجوان جوش میں گھوم رہے تھے۔ ایک مسلم نوجوان نے پرفخر انداز میں کہا: ہماری لڑائی اتھارٹی سے ہے۔ میں بند گیٹ کے باہر کھڑا ہی تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں کیمپس کے اندر سے ایک نوجوان طالب علم نکلا۔ وہ چہار دیواری پھاند کر میری طرف آیا۔ اور پوچھا کہ سر، آپ کہاں سے آئے ہیں اور آپ کو کیا کام ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک کتاب چاہئے۔ اس کے بعد اس نے کتاب کا نام اور میرا نام کاغذ پر لکھوایا اور دوبارہ اندر گیا۔ واپسی کے بعد اس نے بتایا کہ لائبریرین صاحب اپنے آفس میں موجود ہیں، ان کو میں نے کاغذ دکھایا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت میں اکیلا ہوں۔ یہاں کوئی بھی آدمی موجود نہیں۔ اس لئے کتاب دینا ممکن نہیں۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں یہ بات کہی۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا: راجہ رام۔ ہماری لڑائی اتھارٹی سے ہے، یہ کہنے والے بے شمار ہیں مگر ایسے انسانوں سے دنیا خالی ہے جو یہ کہہ سکیں کہ ہماری لڑائی خود اپنی خواہشات سے ہے۔

۲۷ فروری ۱۹۹۲

کشمیر کے کچھ جنگجو الرسالہ کے خلاف ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ الرسالہ میں ان کے نام نہاد جہاد پر تنقید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ الرسالہ کے خلاف سرینگر کے اخباروں میں لمبے لمبے مضامین اور بیانات چھاپ رہے ہیں۔ کچھ کشمیری نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کشمیری مخالفین کو آپ میرا یہ پیغام پہنچادیں کہ آپ لوگ الرسالہ کے خلاف جو مضامین لکھ رہے ہیں اس کو آپ بازار کی سیاہی سے لکھ رہے ہیں۔ مگر الرسالہ خون کی سیاہی کے ذریعہ لکھا جاتا ہے۔ اور جو چیز خون کی سیاہی سے لکھی جائے، اس کو بازار کی سیاہی نہیں مٹا سکتی۔

۲۸ فروری ۱۹۹۲

ایک دیوبندی عالم آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ انگریزوں کی کوئی چیز اچھی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انگریزوں کے کباب اچھے ہوتے ہیں۔ (یعنی ان کو قتل کر کے ان کو اپنی تحریک انقلاب کی خوراک بنانا۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں ہمارے علماء کے اندر کتنا غیر معتدل ذہن پیدا ہو گیا تھا۔ یہی بڑھی ہوئی بے اعتدالی تھی جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کی مثبت رہنمائی سے قاصر رہے۔

۲۹ فروری ۱۹۹۲

جامعہ دارالسلام عمر آباد کے ایک طالب علم نے بتایا کہ وہاں نومسلموں کی تعلیم کا خصوصی انتظام ہے۔ ان کے لئے ایک علاحدہ دارالاقامہ ہے۔ اس وقت اس میں تقریباً چالیس نومسلم رہتے ہیں جو زیادہ تر نوجوان ہیں۔ یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ جامعہ دارالسلام عمر آباد نے یہ بلاشبہ ایک نہایت مفید کام کیا ہے۔

یکم مارچ ۱۹۹۲

۲۹ فروری اور یکم مارچ کو میں ایک سیمینار کے تحت لکھنؤ میں تھا۔ اس سیمینار میں تقریباً سب کے سب جماعت اسلامی کے افراد تھے۔ کچھ رکن تھے اور کچھ ہمدرد اور متفق۔ میری

تقریر دعوت کے موضوع پر ہوئی۔ سب سے زیادہ ردعمل میری تقریر کے بعد پیش آیا۔ مسٹر یمین الاسلام صاحب کے الفاظ میں، لوگ اس طرح بول رہے تھے جیسے کہ وہ خار کھائے بیٹھے ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون کے افراد ہر ایک کے بارہ میں سنجیدہ رہتے ہیں۔ مگر میرے مقابلہ میں وہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسروں سے انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ مگر میری باتیں ان کو اپنی تردید نظر آتی ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۹۲

محمد حمید اللہ لون (پیدائش ۱۹۵۵)، ناظم دار العلوم سواء السبیل، کھانڈی پورہ، کشمیر (Pin 192232) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ تین سال پہلے ایک روز وہ سری نگر کی سڑک پر چل رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک مغربی نوجوان ایک دکان کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ آپ کو کیا چاہئے۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک بانسری کی ضرورت ہے۔ غالباً وہ میوزک کا طالب علم تھا۔ وہ ایک ٹور کمپنی کے ساتھ آیا تھا۔ اور خیموں میں ٹھہرا ہوا تھا۔

حمید اللہ صاحب کو جب معلوم ہوا کہ وہ نوجوان بانسری کی تلاش میں ہے تو انھوں نے قیاس کیا کہ یہ روحانی مزاج کا آدمی ہے۔ وہ اس سے قریب ہوئے اور کہا کہ میرے ساتھ چلئے۔ میں آپ کو بانسری سے اچھی چیز دوں گا۔ اس نے کہا کہ میں آج نہیں چل سکتا۔ آپ فلاں تاریخ کو آئیے۔ حمید اللہ صاحب مقرر تاریخ اور وقت پر دوبارہ اس نوجوان سے ملے پھر اس کو اپنے مدرسہ میں لے گئے۔ وہاں وہ نوجوان تین دن رہا۔ حمید اللہ صاحب نے اس کو نیا کپڑا پہنایا۔ اس کو عزت کے ساتھ رکھا۔ کچھ اہل علم سے اس کو ملایا۔ اس کو اسلامی کتابیں پڑھائیں۔ آخرکار وہ مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام ہاف مین (Mathew P. Hoffman) تھا (مسلم نام سجاد) وہ نیویارک سے تعلق رکھتا تھا۔

۳ مارچ ۱۹۹۲

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ایرانی سپہ سالار رستم جب مسلمانوں کو دیکھتا

کہ وہ نماز کے لئے جمع ہورہے ہیں تو کہتا کہ خلیفہ عمر میرا کلیجہ کھا گیا۔ وہ کتوں کو اداب سکھا رہا ہے
(کان رستم اذا رأی المسلمین یجتمعون للصلاۃ یقول : اکل عمر کبدی یعلم
الکلاب الآداب) صفحہ ۱۵۲

اجتماعی آداب کی بے حد اہمیت ہے۔ پانچ وقت کی نماز با جماعت مکمل معنوں میں اجتماعی آداب کی تربیت ہے۔ اگر فی الواقع مسلمانوں کے اندر یہ اجتماعی آداب آجائیں تو صرف یہی مسجد کا عمل ان کو بے پناہ بنا دینے کے لئے کافی ہوگا۔

۴ مارچ ۱۹۹۲

قریبی پارک میں صبح کے وقت ٹہلنے کے لئے گیا۔ ایک کیاری میں خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کو دیکھ کر اچانک زبان پر یہ الفاظ آگئے : دنیا کے پھول جب اتنے خوب صورت ہیں تو جنت کے پھول کتنے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔

۵ مارچ ۱۹۹۲

ونگ کمانڈر یوسف خاں صاحب وشنو دیوی کے مندر (جموں) گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں ہندو لوگ بے شمار پیسہ دیتے ہیں۔ مثلاً صرف ایک ہندو نے تیرہ لاکھ روپیہ کا نذرانہ دیوی جی کو پیش کیا۔ ہر روز وہاں یاتریوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ رواج کے مطابق اکثر لوگ وہاں اپنے بال کٹواتے ہیں۔ یہ کٹے ہوئے بال اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں کہ مندر کے ذمہ دار ان کو اکسپورٹ کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ مندر کو سالانہ تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی رقم حاصل ہوتی ہے۔

یہ برکتی مذہب کا کرشمہ ہے۔ جس طرح ہندوؤں میں اس مذہب کی دھوم ہے اسی طرح وہ مسلمانوں میں بھی زور وشور کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

۶ مارچ ۱۹۹۲

مسز اوشا مہاجن ایک نہایت سمجھ دار خاتون ہیں۔ ان کے پاس ماروتی کار ہے۔ کار اچھی حالت میں ہے۔ البتہ اس کا رنگ کسی وجہ سے ہلکا پڑ گیا ہے۔ ان کے بارہ سال کے بیٹے نے کہا کہ گاڑی پر فلاں رنگ کر والیجئے۔ خاتون نے اپنے بیٹے کی بات کو سختی کے ساتھ کاٹتے

ہوئے کہا: تم کو گاڑی کافی نہیں، تم کو رنگ بھی چاہئے۔

میری لڑکی فریدہ خانم مذکورہ خاتون سے ملنے کے لئے آج ان کے گھر گئی تھیں۔ واپس آکر انھوں نے یہ قصہ بتایا جو خود ان کے سامنے گزرا تھا۔ میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہا کہ اسی کا نام تربیت ہے۔ عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کوئی مذہبی کتاب بچہ کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں۔ یا کوئی مضمون پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بچہ کی تربیت کا حق ادا کر دیا۔ مگر یہ تربیت نہیں۔ اصل تربیت یہ ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں بچہ کو عملی سبق دیا جائے۔ بچہ کی تربیت کی واحد تدبیر یہ ہے کہ گھر کو عملی تربیت گاہ بنا دیا جائے۔ زبانی اپدیش سے کبھی بچہ کی تربیت نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ تربیت وہ مفید ہے جو بچہ کی فکری تصحیح کرے، جو بچہ کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائے۔

۷ مارچ ۱۹۹۲

ریاض (سعودی عرب) میں ایک سمینار ہونے والا ہے۔ اس کے لئے دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ میں "اثر العقیدة: فی تطبیق الشریعة" کے موضوع پر ایک مقالہ تیار کر رہا ہوں۔ اس موضوع پر سوچنے اور مطالعہ کرنے کے دوران کچھ نئے مضامین ذہن میں وارد ہوئے جو اس سے پہلے اس انداز میں میرے ذہن میں موجود نہ تھے۔

میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے تمام مضامین اور کتابیں مخصوص حالات کے دوران تیار ہوئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں جن میں تخلیقی افکار ذہن میں پیدا ہوں اور کوئی نیا مضمون یا نئی کتاب تیار ہو سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عجیب معاملہ ہے۔

۸ مارچ ۱۹۹۲

آج رمضان ۱۴۱۲ھ کا دوسرا روزہ ہے۔ رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد فرید الدین خان آئے ہیں۔ وہ آکر میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ نہایت روشن چہرہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس طرح ان کا

استقبال کروں۔ چنانچہ اظہار تعلق کے لئے میں ان کے پیروں پر گر پڑا۔ میں دیر تک ان کے پیروں پر اپنا سر رکھے رہا۔

یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے والد مرحوم کو خواب میں دیکھا۔ کچھ نہیں معلوم کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے۔

۹ مارچ ۱۹۹۲

روزہ کے بارہ میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا: اگر میں مذہبی آدمی نہ ہوتا تب بھی رمضان کے دنوں میں کھانا اور پینا میرے لئے سخت مشکل ہوتا۔ کیوں کہ کھانے اور پینے کی چیزوں کا خالق میں نہیں ہوں بلکہ خدا ہے۔ اور ان چیزوں کو پیدا کرنے والا کہہ رہا ہے کہ اس مہینہ میں لوگ کھانا اور پانی چھوڑ دیں۔ وہ رات کو کھائیں مگر دن کو نہ کھائیں۔ ایسی حالت میں مجھے شرم آتی کہ ان چیزوں کو کیسے کھاؤں جب کہ ان کا خالق اور مالک ان کو کھانے سے منع کر رہا ہے۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۲

آج ٹائمس آف انڈیا (۱۰ مارچ) کے صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم مناہم بیگن کا تل ابیب میں انتقال ہوگیا:

Menachem Begin is dead

اس کے بعد اخبار کا آخری صفحہ الٹا تو اس میں بیگن کی ہنستی ہوئی تصویر تھی جس میں وہ (۱۹۷۸ میں کیمپ ڈیوڈ اکارڈ کے وقت) امریکی صدر جمی کارٹر اور مصری صدر انور السادات سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ موت کی خبر کے فوراً بعد زندہ تصویر دیکھ کر اچانک ایسا محسوس ہوا گویا وہ "زندگی کے بعد موت" کے نظریہ کا ایک مظاہرہ ہے۔ گویا آدمی اس دنیا میں مر کر معاً بعد دوسری دنیا میں جی اٹھا ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۲

سوڈان کے جنوبی حصہ میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ یہ عیسائی منظم ہو کر آزاد مسیحی حکومت بنانے کی مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ جنوبی سوڈان کے اس حصہ میں ۱۹۸۲ سے سوڈان لبریشن

آرمی کے نام سے مسلح عیسائی گوریلے شمالی علاقہ کے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اس علاقہ میں تیل کی تلاش کا کام رک گیا ہے۔ نیز اس جنگ کی وجہ سے اب تک حکومت سوڈان کو تقریباً چھ بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ سوڈان کے فوجی حکمراں جنرل عمر بشیر نے ۱۹۸۹ میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد ہی یہ اعلان کیا تھا کہ جنوبی سوڈان کے مسیحی گوریلا اگر ہتھیار رکھ دیں تو ان کو معاف کر دیا جائے گا۔ اب تک وہ تین بار اس قسم کا اعلان کر چکے ہیں۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

یہی کام مسلمان زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں۔ جہاں کسی خطہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں وہ علیحدگی کی تحریک لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تحریک محض تباہی کی تحریک ہے خواہ اس کو مسلمان چلائیں یا غیر مسلم۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۲

صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر میں باب صلح الحدیبیہ کے تحت البراء بن عازب کی روایت میں ہے کہ "محمد رسول اللہ" کا لفظ لکھنے پر اہل مکہ نے اعتراض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا کہ اس کو مٹا دو۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کو نہیں مٹاؤں گا۔ اس کے بعد روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے ہاتھ سے مٹا دیا (فمحاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ)

روایت کے اس حصہ کو لے کر صحیح مسلم کے ایک شارح نے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا۔ آپ اگرچہ امی تھے۔ مگر آپ نے معجزہ کے طور پر اس کو جانا اور اس کو مٹا دیا۔ حالاں کہ اسی باب میں آگے دوسری روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ جب حضرت علی نے مٹانے سے انکار کیا تو آپ نے کہا کہ مجھ کو وہ جگہ دکھاؤ۔ انھوں نے وہ جگہ آپ کو دکھائی پھر آپ نے اس کو مٹا دیا۔ (فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارنی مکانہا فاراہ مکانہا فمحاہا)

دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ "رسول اللہ" کا لفظ مٹانے کا واقعہ ایک سادہ واقعہ تھا مگر غیر منطقی مطالعہ کی بنا پر اس کو معجزہ بنا دیا گیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۲

امام ابوحنیفہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف زید بن علی کے خروج کے حامی تھے۔ مگر یہ حمایت ان کی اصولی سے زیادہ جذباتی نظر آتی ہے۔ شیخ ابوزہرہ نے امام ابوحنیفہ کی بابت لکھا ہے کہ ان کے اندر شیعیت تھی۔ اس خروج کی بابت امام ابوحنیفہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: خروجه يضاهي خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر (زید بن علی کا خروج بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج کے مشابہ ہے)

شیخ ابوزہرہ نے لکھا ہے کہ ابوحنیفہ نے زید بن علی کی فوج کی مال سے مدد کی۔ مگر ان کو زید بن علی کے ساتھیوں پر بہت کم بھروسہ تھا۔ اور اسی لئے انھوں نے ان کے ساتھ تلوار اٹھانے سے معذرت کی (وامدّ جنده بالمال ولكنه كان ضعيف الثقة في انصاره ولذا اقال في الاعتذار عن حمل السيف معه۔ (ابوزهرة، ابوحنيفه: حياته وعصره، دار الفكر العربي قاهره، صفحة ۶۴)

۱۴ مارچ ۱۹۹۲

ایک عیسائی فادر نے کہا کہ عیسائیت میں محبت کی تعلیم ہے اور اسلام میں قتال کی تعلیم۔ میں نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی زندگی کی ضرورت ہیں۔ اور دونوں مذہبوں میں دونوں باتوں کی تعلیم ہے۔ مگر آپ نے یہ کیا کہ مسیحیت سے آیت محبت لی اور اسلام سے آیت قتال لے لیا۔ آپ کا یہ تقابل غیر منطقی ہے۔ اگر میں ایسا کروں کہ مسیحیت سے آیت قتال (متی ۱۰ : ۳۴ - ۳۵) لے لوں اور اسلام سے آیت محبت، تو تصویر بالکل مختلف نظر آئے گی ——— میرا تجربہ ہے کہ دنیا میں سب سے کم جو چیز نظر آتی ہے وہ وہ چیز ہے جس کو علمی اصطلاح میں منطقی طرز فکر اور اخلاقی اصطلاح میں منصفانہ طرز فکر کہا جاتا ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۲

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دور اول میں تصوف کا وجود نہ تھا۔ وہ بعد کو پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کی ذات لوگوں کی تربیت کا ذریعہ تھی۔ آپ کی وفات کے

بعد جب آپ کی ذات دنیا میں نہ رہی تو بزرگوں نے "شیخ" کا طریقہ اختیار کیا۔

میں نے کہا کہ اس طرح دین میں ایک نئے ادارہ کا اضافہ یقینی طور پر ایک انحراف تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت فرمایا تھا کہ میں تمہارے درمیان دو چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں ــــــ کتاب اللہ اور سنت رسول۔ تم جب تک اس کو پکڑے رہو گے، گمراہ نہ ہوگے۔ اس کے مطابق بزرگوں کو کہنا چاہئے تھا کہ رسول کے بعد اب قرآن و سنت ہمارے لئے ذریعہ ہدایت ہے۔ اس کو خوب پڑھو، اس میں تدبر کرو۔ اس میں پوری طرح مشغول ہو جاؤ۔ اس سے تم کو دینی غذا ملتی رہے گی۔ اس کے بجائے بزرگوں نے خود ساختہ طور پر رسول اللہ کا ایک اور بدل ایجاد کیا اور اس کو امت کے درمیان رائج کر دیا۔ حالانکہ انھیں اس کا کوئی حق نہ تھا۔

۱۶ مارچ ۱۹۹۲

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے انگریزی لٹریچر سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی زبان پڑھی۔ ان کو دونوں زبانوں پر اچھی قدرت حاصل ہے۔ وہ اقبال کے مداحوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کا ہندی زبان میں مکمل ترجمہ کیا ہے۔ اس کام میں انھوں نے کئی سال صرف کئے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ اقبال کی اس کتاب کا خلاصہ کیا ہے۔ مگر وہ اس کا کوئی خلاصہ نہ بتا سکے۔ اصل یہ ہے کہ زبان دانی الگ چیز ہے اور فہم اس سے الگ چیز۔ موجودہ زمانہ میں زبان داں تو بے شمار ہیں مگر صاحب فہم مشکل ہی سے کوئی ملتا ہے۔

۱۷ مارچ ۱۹۹۲

ایک صاحب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک مضمون کا ترجمہ کیا۔ اس میں ایک جگہ cutting corners لکھا ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ انھوں نے کر دیا: کونا کاٹنا۔ حالاں کہ یہ ایک محاورہ ہے اور اس کا مطلب کفایت شعاری ہے۔ اس سے مراد مالی کفایت شعاری نہیں ہے بلکہ کسی بھی نوعیت کی کفایت شعاری ہے۔ مثلاً to cut a corner کا

مطلب ہے مختصر راستہ اختیار کرنا۔

یہ بظاہر ایک مضحکہ خیز غلطی ہے۔ مگر اس سے بہت زیادہ مضحکہ خیز غلطی وہ ہے جو قرآن وسنت کے سمجھنے میں کی جاتی ہے۔ لوگ ایک آیت یا ایک حدیث کا اس طرح ایک غلط مطلب لے لیتے ہیں اور اس کو پریس کے ذریعہ ہر جگہ پھیلا دیتے ہیں۔ پہلی غلطی اگر صرف غلطی ہے تو دوسری غلطی تباہ کن غلطی۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۲

مجھے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ آخرت کا سب سے بڑا عذاب غالباً حسرت کا عذاب ہوگا۔ آدمی کی موجودہ عمر جب ختم ہو جائے گی اور وہ آخرت کی اگلی دنیا میں ابدی زندگی گزارنے کے لئے پہنچ جائے گا تو اس کو موجودہ دنیا کے کھوئے ہوئے لمحات ایک ایک کرکے یاد آئیں گے۔

وہ سوچے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے مواقع مجھے ملے تھے جب کہ ایک عمل کرکے میں خدا کی رضا جیسی قیمتی نعمت کو پا سکتا تھا۔ جب میں ایک ایمانی تقاضے کو پورا کرکے جنت جیسی ابدی راحت کو حاصل کر سکتا تھا۔ جب میں حق پرستانہ طریقہ اختیار کرکے آخرت کی لامحدود فضاؤں میں عزت کے مقام کا مستحق ہو سکتا تھا۔ مگر ان تمام مواقع کو میں نے کھو دیا۔ ناکردگی کی یہ حسرت ناقابل بیان ذلت اور غم بن کر اس کے اوپر چھا جائے گی اور کبھی اس سے جدا نہ ہوگی۔

۱۹ مارچ ۱۹۹۲

ہمارے یہاں کپڑے گھر میں دھلے جاتے ہیں۔ آج میرا کپڑا دھل کر آیا تو وہ مجھ کو معمول سے زیادہ صاف نظر آیا۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس سے پہلے ایک ملازم کپڑے دھویا کرتا تھا وہ اپنے وطن چلا گیا۔ آج گھر کے لوگوں نے کپڑا دھویا ہے۔ گھر کا آدمی زیادہ توجہ سے کام کرتا ہے اس لئے آج کا کپڑا زیادہ صاف تھا۔

اس واقعہ کے بعد میری سوچ انسانی دماغ کی طرف چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ آج کا کپڑا میری نظروں کے سامنے تھا۔ جب کہ ملازم کے دھلے ہوئے کپڑے صرف بطور تصور ذہن میں تھے۔ گویا ایک موجود تھا اور دوسرا غیر موجود۔ مگر دماغ نے دونوں کو ملا کر دیکھ لیا۔ دماغ نے

یہاں تصویر علینی اور تصویر ذہنی کے درمیان مقابلہ کیا۔ بظاہر یہ سادہ سا عام واقعہ ہے۔ مگر یہ ایک بے حد پیچیدہ واقعہ ہے۔ اس قسم کے ایک تقابل کے لئے دماغ میں کیا کیا انتظامات ہوں گے ان کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۲

ڈاکٹر کلیم صدیقی نے برطانی مسلمانوں کی ایک مشاورتی مجلس بنائی ہے اور اس کا نام مسلم پارلیمنٹ رکھا ہے۔ اس کی توجیہہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نام ہم نے اس لئے رکھا ہے تاکہ یہاں مسلمانوں کے لئے ہائی پروفائل پولٹیکل پرزنس (high-profile political presence) کا اظہار ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی کوششوں کے بے نتیجہ ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ وہ عملاً لو پروفائل کے مقام پر ہیں۔ مگر وہ ہائی پروفائل کے مقام سے اپنے کام کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اس غیر فطری طریقہ نے ان کی کوششوں کو بے نتیجہ بنا دیا ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۲

قدیم مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مخالف دو تھے —— ابوجہل اور ابولہب۔ قرآن میں ابوجہل کا تذکرہ نام کے ساتھ نہیں۔ مگر ابولہب کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ (سورہ نمبر ۱۱۱) اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ابوجہل کا کیس سرکشی کا کیس تھا اور ابولہب کا کیس کمینہ پن کا کیس۔ اور سرکشی کے مقابلہ میں کمینہ پن (دنائت) زیادہ بڑا جرم ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں آپ کی مخالفت کا آغاز ابولہب نے کیا۔ آپ جہاں بھی دعوت کے لئے جاتے، ابولہب بھی وہاں پہنچ کر ذلیل انداز میں آپ کی مخالفت کرتا۔ وہ لوگوں سے آپ کے بارہ میں کہتا کہ یہ کذاب ہے، اس کی بات نہ سنو۔ صفا کے خطاب کے بعد اس نے کہا: تباً لك سائر اليوم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ایک معزز اور محترم شخص تھے۔ عام لوگوں کو آپ کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ابولہب آپ کا چچا تھا۔ اس بنا پر اس کے لئے آپ کے خلاف بولنا آسان تھا۔ قریبی ہونے کی بنا پر اس کو

آپ کے خلاف بولنے میں وہ تکلف نہیں ہو سکتا تھا جو دوسروں کو تھا۔ ابولہب کی مخالفت کے بعد دوسروں کو جرأت ہوئی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دوسرے لوگ بھی آپ کی مخالفت کے لئے جری ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت ابولہب نے پیدا کی۔ آپ کے خلاف عملی ایذارسانی کی جرأت لوگوں کو ابوطالب کی وفات کے بعد ہوئی جبکہ آپ کوئی سرپرست نہ رہا۔ ابوطالب کے بعد خاندان کا رئیس ابولہب کو بنا دیا گیا۔ مگر اس نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا۔

۲۲ مارچ ۱۹۹۲

ایک قدیم عربی مثل ہے کہ بہادر آدمی بقا کے مقابلہ میں خوش نامی کو ترجیح دیتا ہے اور بزدل آدمی خوش نامی کے مقابلہ میں بقا کو پسند کرتا ہے (الشجاع یختار حسن الذکر علی البقاء، والجبان یختار البقاء علی حسن الذکر۔)

یہ تقسیم ایک جاہلانہ تقسیم ہے۔ اصل اہمیت نہ ذاتی بقا کی ہے اور نہ ذاتی خوش نامی کی۔ اصل اہمیت مقصد کی ہے۔ مقصد کی تکمیل کے لئے اگر زندہ رہنے کی ضرورت ہو تو آدمی کو ہلاکت سے بچ کر زندہ رہنا چاہئے۔ اور اگر مقصد قربانی کا تقاضا کرتا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ قربانی دے کر اپنے مقصد کو حاصل کرے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۲

ایک انسان جو اپنی فطرت پر قائم ہو، اس کے لئے سب سے زیادہ محبوب چیز یہ ہے کہ اس کو حقائق کی دنیا میں سانس لینے کا موقع ملے۔ موجودہ دنیا میں قول زور اور عمل زور کا طوفان برپا ہے۔ آخرت کی دنیا میں قول صدق اور عمل صدق کا ماحول ہوگا۔ اور بلاشبہ قول صدق اور عمل صدق کے ماحول میں جینے سے زیادہ لذیذ اور کوئی چیز ایک سچے انسان کے لئے نہیں۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۲

ایک صاحب نے کہا ——— "آپ نے اقبال کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ آپ اقبال پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ آپ اقبال کشی کی مہم چلا رہے ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ سب وشتم کی زبان بول رہے ہیں۔ آپ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے الرسالہ سے کوئی مثال دیجئے۔

اور اس مثال کا تجزیہ کر کے بتائیے۔ مگر وہ کوئی مثال نہ دے سکے۔

میرا احساس ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں حقیقی علمی تنقید کا کوئی وجود نہیں۔ وہ عیب جوئی اور الزام تراشی کو تنقید سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ تنقید نام ہے تجزیہ کا۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۲

انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور دنیا کے غیر معمولی مواقع پر سوچتے ہوئے میری زبان پر یہ الفاظ آگئے ——— انسان امکاناتِ خداوندی کا تعارف ہے اور دنیا امکاناتِ جنت کا تعارف۔ انسان کی صورت میں خدا کے وجود کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اور دنیا کی صورت میں جنت کی موجودگی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

۲۶ مارچ ۱۹۹۲

جمعہ کے دن ہر جگہ مسجدوں میں بھیڑ ہوتی ہے۔ امریکہ کی مسجدوں میں میں نے دیکھا کہ وہاں نمازی آتے ہیں تو آتے ہی صف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جب جماعت کا وقت ہوتا ہے تو ہر ایک اپنی جگہ پر کھڑا ہوجاتا ہے اور فوراً ہی صفیں قائم ہوجاتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان میں یہ حال ہے کہ لوگ منتشر طور پر اِدھر اُدھر بیٹھتے ہیں۔ جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو اقامت کے ساتھ "آگے آجائیے، آگے آجائیے" کا شور مچتا ہے۔ تکبیر ہونے تک یہ شور جاری رہتا ہے۔ کافی دیر بعد صف بندی ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے نمازی ۹۹ فیصد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اور ہندستان کے نمازی ۹۹ فیصد معمولی تعلیم یافتہ۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کو صحیح طور پر زندہ کرنے کے لئے امت کے شعور کو بھی اونچا اٹھانا پڑے گا۔ امت اگر کمتر شعور کی سطح پر ہو تو اس کے درمیان جو دین زندہ ہوگا وہ بھی کمتر سطح کا دین ہوگا۔

۲۷ مارچ ۱۹۹۲

ایک خوبصورت پھول کو دیکھ کر میرے اندر عجیب اہتزاز کی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں نے کہا: شاید یہ خوبصورت پھول اس لئے بنائے گئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی یہ سوچے کہ جب امپرفکٹ دنیا اتنی حسین ہے تو پرفکٹ دنیا کتنی زیادہ حسین ہوگی۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۲

انریکو ایمانویلی کا قول ہے کہ کچھ لکھنے والے یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ عوام میں جانے جائیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں میں جانے جائیں۔ اور کچھ لکھنے والے وہ ہیں جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے آپ کو جانیں:

Some writers try to be known to the public, others try to be known to their colleagues and yet others try to be known to themselves. (Enrico Emanuelli)

اس قول کا آخری حصہ میرے حسب حال ہے۔ غالباً ۱۹۶۰ میں جب کہ میں رامپور میں تھا۔ مولانا جلال الدین انصر عمری سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی دوسرے کے لئے نہیں لکھتا، میں اپنے آپ کے لئے لکھتا ہوں۔ میں خود اپنی تحریروں کا مخاطب ہوں جب میں اپنے کسی خیال کو لکھتا ہوں تو اس کے بعد مجھے یہ فکر نہیں ہوتی کہ لوگ اس کو پڑھیں گے یا نہیں۔ اپنے خیال کو کاغذ پر منتقل کر لینے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام ہو گیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۹۲

پروفیسر عرفان حبیب (علی گڑھ) مشہور سیکولر مورخ ہیں۔ ان کا ایک بیان اخبار قومی آواز (۲۹ مارچ) میں چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

"اگر اجودھیا میں مندر گرا کر مسجد تعمیر کرائی گئی ہوتی تو اس کا ذکر شری رام چرت مانس میں ضرور ہوتا۔ شری رام چرت مانس بابر کے ہندستان آنے کے بعد لکھی گئی ہے۔ اگر اس معاملہ میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو تلسی داس اپنے اس گرنتھ میں اس کا لازمی ذکر کرتے۔ چنانچہ انڈیا کے محکمۂ آثار قدیمہ نے بھی متنازعہ جگہ کے بارے میں مندر ہونے کا تذکرہ نہیں کیا ہے"

۳۰ مارچ ۱۹۹۲

ہمیشہ سے میری یہ کیفیت ہے کہ رمضان کے آخری روزے میرے لئے بہت سخت ہو جاتے ہیں۔ آج رمضان کے مہینہ کی ۲۴ تاریخ ہے۔ آج کا روزہ میرے اوپر بہت سخت گزرا۔ اس تجربہ کے بعد مجھے خیال آیا کہ شاید ماہ رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں تاکہ آدمی کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ کھانے اور پینے سے وقتی محرومی نے میرا یہ حال کیا ہے،

آخرت میں اگر کھانے پینے سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جائے تو میرا کیا حال ہوگا۔ شاید روزہ کا تجربہ انا بت پیدا کرنے کے لئے کرایا جاتا ہے۔ یعنی آدمی دنیا کی سختی کو دیکھ کر آخرت کی سختی کو یاد کرے۔ وہ یوم الحساب سے ڈر کر اس سے بچنے کے لئے فکر مند ہو جائے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۲

اس دنیا میں وہ تمام لذتیں موجود ہیں جن کے بارہ میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ جنت میں موجود ہوں گی۔ مگر آج کی دنیا میں یہ لذتیں امپرفکٹ حالت میں ہیں۔ یہی لذتیں پرفکٹ صورت میں جنت میں اہل جنت کو دے دی جائیں گی۔

یہ صرف بے دلیل عقیدہ نہیں بلکہ عین عقلی مسلمہ ہے۔ کیوں کہ جہاں امپرفکٹ ممکن ہو وہاں پرفکٹ بھی ضرور ممکن ہوگا۔ امپرفکٹ کی موجودگی پرفکٹ کے امکانی موجودگی کا ثبوت ہے۔

یکم اپریل ۱۹۹۲

ایک صاحب نے پرجوش تقریر کی اور مسلح جدوجہد کے ذریعہ ساری دنیا میں اسلام قائم کرنے کو امت مسلمہ کا نصب العین بتایا۔ میں نے کہا کہ آپ جنگ کے ذریعہ دنیا کو زیر کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۹۱ کے آخر میں جب سوویت یونین ٹوٹا تو اس وقت سوویت یونین کے پاس تیس ہزار ایٹمی ہتھیار تھے۔ ان میں سے ۱۲ ہزار دور مار ایٹمی میزائل تھے۔ اور ۱۸ ہزار نزدیکی فاصلہ کے میزائل۔ یہ تمام کے تمام سوویت یونین کے مختلف مقامات پر بالکل تیار حالت میں نصب تھے۔ گوربا چوف کو صرف بٹن دبانا تھا۔ اور امریکہ اور مغربی یورپ پر ایٹمی ہتھیاروں کی بارش ہونے لگتی۔ مگر اس نے 'بلیک باکس' خاموشی سے یلتسن کے حوالے کر دیا اور بٹن دبانے کی جرأت نہیں کی۔ دوسری طرف آپ کے پاس کوئی طاقت نہیں اور آپ ساری دنیا سے لڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ سوویت یونین اقتصادی اعتبار سے بدحال ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ہتھیاروں کو استعمال نہ کر سکا۔ میں نے کہا کہ جنگ کا بٹن دبانے کے لئے معاشی خوش حالی کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے دور اول میں جو غزوات پیش آئے وہ سب معاشی تنگی کے حالات میں پیش آئے۔

۲ اپریل ۱۹۹۲

دنیا میں حسن بھی ہے اور لذت بھی۔ مگر یہ حسن اور لذت دراصل جنت کی ایک ابتلائی جھلک تھی جو موجودہ دنیا میں صرف اس لئے رکھی گئی تھی کہ آدمی یہ جان سکے کہ اگر اس نے خدا پرستی کی زندگی اختیار کی تو موت کے بعد کیسی پرکیف قیام گاہ اس کو ملےگی۔ مگر انسان اسی دنیا کی چیزوں میں محو ہو کر رہ گیا۔ دنیا کی جنت کو چھوڑنا تھا، اس کے بعد آخرت کی جنت کو پانا تھا۔ مگر انسان نے چھوڑنے والی چیز کو نہیں چھوڑا۔ اس لئے وہ پانے والی چیز کو بھی نہ پاسکا۔

۳ اپریل ۱۹۹۲

میں مذہبی لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے سطحی نظر آتے ہیں۔ غیر مذہبی لوگوں کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھے سرکش نظر آتے ہیں۔ ظاہر کے اعتبار سے ایک مذہبی اور دوسرا غیر مذہبی۔ لیکن اندر کے اعتبار سے شاید دونوں یکساں ہیں۔ کیوں کہ سرکشی اور سطحیت میں کوئی کوئی فرق نہیں۔

۴ اپریل ۱۹۹۲

میں جب اپنی پچھلی تحریروں کو دیکھتا ہوں اور اس کا مقابلہ موجودہ تحریروں سے کرتا ہوں تو مجھے دونوں میں ایک فرق نظر آتا ہے۔ میری پچھلی تحریروں میں روانی زیادہ تھی، اور موجودہ تحریروں میں روانی مقابلةً کم ہے۔ اس فرق کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پچھلے دور میں میرے اوپر ادبی انداز کا غلبہ تھا۔ اور بعد کے دور میں منطقی انداز غالب آگیا۔ جب منطقیت کم تھی تو روانی زیادہ تھی، اور جب منطقیت بڑھی تو روانی کم ہوگئی۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۲

کل رمضان کا مہینہ ختم ہوگیا۔ آج عید الفطر کا دن تھا۔ میں نے عرب سرائے کی مسجد میں عید کی نماز پڑھی۔ جب میں چل کر مسجد کے دروازہ پر پہنچا تو دل بھر آیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ میں نے کہا کہ خدایا، اپنی کمزوری کی بنا پر میرے اندر روزہ رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ مگر مجھے اس سے غیرت آئی کہ جس خدا نے رزق دیا ہے، جب وہ کھانے سے منع کر رہا ہے تو میں کس طرح اسے کھاؤں۔ جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب میں آپ کے پاس حاضر کیا جاؤں گا۔ آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ عاجز بندہ ہوں۔ کاش آپ یہ کہہ دیں کہ

جس بندہ کو میں نے اتنا زیادہ عاجز پیدا کیا۔ اب مجھے غیرت آتی ہے کہ میں اس کو جہنم کی آگ میں ڈالوں۔ فرشتو، اس کو جنت میں لے جاؤ، کیوں کہ میں نے اسے بخش دیا۔

۶ اپریل ۱۹۹۲

ایک صاحب نے کہا کہ قرآن کے مطابق، مسلمان خیر امت ہیں۔ وہ تمام امتوں سے افضل ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کی آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: کنتم خیر امّة اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰) نحاس نے کہا کہ جملہ کی تقدیر اس طرح ہے کہ تم لوگوں کے واسطے بہتر امت ہو (قال النحاس، والتقدیر علیٰ ھٰذا کنتم للناس خیر امّة (الجامع لاحکام القرآن ۴/۱۷۱)

گویا یہ لفظ کسی انسانی مجموعہ کا لقب نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی اِس صفت کا بیان ہے کہ وہ لوگوں کے لئے خیر کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے اپنے آپ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "خیر امت" کا اطلاق اس پر اس وقت ہوگا جب کہ وہ لوگوں کے لئے خیر کا سبب بنے۔ اگر وہ لوگوں کے لئے خیر کا سبب نہ بنے تو اس کے بعد وہ اس کا مصداق بھی نہ رہے گی۔

صحابہ کرام نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ پورے معنی میں لوگوں کے لئے خیر ہیں۔ اس لئے وہ اللہ کی نظر میں خیر امت قرار پائے۔ بعد کے لوگ اس کا مصداق اس وقت ٹھہریں گے جب کہ وہ صحابہ کی مانند عمل کریں۔ اسی لئے حضرت عمر نے فرمایا: من فعل فعلھم کان مثلھم (۴/۱۷۰)

۷ اپریل ۱۹۹۲

"خدا موجود ہے"۔ یہ جملہ جتنا حیرت ناک ہے۔ اتنا ہی یہ جملہ بھی حیرت ناک ہے کہ "میں موجود ہوں"۔ اپنی موجودگی کو آدمی روز اول سے دیکھتا ہے اس لیے وہ اس کو بدیہی چیز سمجھ لیتا ہے۔ مگر وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ اس لئے وہ اس کو بدیہی نہیں سمجھتا۔ آدمی اگر اس راز کو جان لے تو خدا پر یقین کرنا اس کے لئے ایسا ہی بن جائے جیسے اپنے آپ پر یقین کرنا۔

۸ اپریل ۱۹۹۲

گجرات کے دو مسلمان آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ ہندوؤں سے

حسن اخلاق کا طریقہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ حالاں کہ ہندو ہمارے خلاف سازش میں مصروف ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ہے کہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی (وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً)۔ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اصل مسئلہ سازش کی موجودگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ صبر اور تقویٰ کی غیر موجودگی ہے۔

۹ اپریل ۱۹۹۲

مسجد میں ایک اہل حدیث بزرگ تھے۔ نماز کے لئے کھڑا ہوا تو وہ صف میں میرے پاس تھے۔ حسب معمول میرے دونوں پاؤں قریب قریب تھے۔ انھوں نے اپنا پاؤں پھیلانا شروع کیا، یہاں تک کہ میرے پاؤں سے ملا دیا۔ ہر بار وہ قیام میں ایسا ہی کرتے رہے۔

نماز کے بعد انھوں نے کسی قدر تلخ لہجہ میں کہا کہ آپ لوگوں کی نماز درست نہیں ہوتی۔ حدیث میں قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہونے کا حکم ہے اور آپ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ قدم سے قدم ملانا ایک علامتی حکم ہے۔ اصل مقصد تو دل سے دل ملانا ہے۔ آپ نے قدم سے قدم ملانے کا مسئلہ تو جانا مگر دل سے دل ملانے کا مسئلہ آپ نہ جان سکے۔

۱۰ اپریل ۱۹۹۲

انگریز نومسلم مسٹر جان محمد بٹ سے ایک بار میں نے کہا کہ قلم میری محبوب چیز ہے مگر آج تک میری پسند کے مطابق کوئی قلم مجھے نہیں ملا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن لندن گئے تو واپسی میں وہ میرے لئے ایک قلم لائے۔ اس کو دیتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا: کافی تلاش کے بعد میں نے یہ قلم آپ کے لئے حاصل کیا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ بھی آپ کو پسند نہیں آئے گا۔ کیوں کہ آپ پرفکشنسٹ (perfectionist) ہیں۔ اور اس دنیا میں کسی پرفکٹ چیز کا ملنا ممکن نہیں۔

میرا حال بڑا عجیب ہے۔ ایک طرف میرا ذوق انتہائی حد تک نازک اور لطیف ہے۔ اور اس بنا پر دنیا کی کسی بھی چیز سے میں محظوظ نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف علمی اعتبار سے اپنے کو دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو میں آخری حد تک ناقص پاتا ہوں۔ اس دو طرفہ احساس کے

تحت میری زبان سے نکلا —— آہ وہ انسان جو دنیا کے حسن سے اس لئے enjoy نہ کرسکا کہ وہ امپرفکٹ تھا اور آخرت کے حسن سے وہ اس لئے محروم رہے گا کہ وہ خود امپرفکٹ ٹھہرا کر اس سے دور کر دیا جائے گا۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۲

مارچ ۱۹۹۲ میں کرنل بشیر حسین زیدی کا انتقال ہوگیا۔ وہ اس سے پہلے ایسوسی ایٹڈ جرنلس لیمیٹڈ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین تھے۔ اردو روزنامہ قومی آواز کا تعلق اسی ادارہ سے ہے۔ قومی آواز کے اڈیٹر عشرت علی صدیقی کا ایک مضمون زیدی صاحب کی یاد میں قومی آواز (۲ اپریل ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

(کانگرس حکومت کے خاتمہ کے بعد جب قومی آواز کی اشاعت عارضی طور پر بند ہوگئی تھی) اسی زمانہ میں زیدی صاحب نے مجھے لکھا کہ مولانا علی میاں نے ایک گفتگو کے دوران ان سے اخبار بند ہو جانے کا شکوہ کیا اور کہا کہ انھوں نے، یعنی مولانا علی میاں نے، اخبار پڑھنا اس وقت تک کے لئے بند کر دیا ہے جب تک قومی آواز کی اشاعت پھر شروع نہ ہو جائے۔

یہی معاملہ عام طور پر ہمارے علماء کا ہے۔ عالمی خبروں کو جاننے کے لئے ان کا سارا انحصار اردو اخباروں پر ہوتا ہے۔ اور اردو اخبارات کے متعلق میری رائے ہے کہ وہ اتنے ناقص ہوتے ہیں کہ صرف اردو اخبارات کو پڑھنے والا آدمی کبھی صحیح طور پر خبروں کی دنیا سے واقف نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں ان علماء کا سیاسی اور اجتماعی معاملات میں داخل ہونا صرف ایک غیر سنجیدہ فعل ہے

۱۲ اپریل ۱۹۹۲

صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، مقدمہ سمیت، چودہ جلدوں میں ہے۔ کہا جاتا ہے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کشمیری نے فتح الباری کو تیرہ بار حرفاً حرفاً پڑھا تھا۔

مگر حدیث کے فہم کے لئے یہ کافی نہیں۔ حتی کہ اگر کوئی شخص فتح الباری کو ۱۳ بار پڑھ ڈالے تب بھی یہ ضروری نہیں کہ حدیث کو سمجھنے میں اسے بصیرت کا درجہ حاصل ہو جائے۔ قرآن یا حدیث کو سمجھنے کے لئے اصل اہمیت توفیق خداوندی کی ہے۔ اور توفیق خداوندی اس شخص کو ملتی

ہے جو مکمل طور پر خالی الذہن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھے۔ موجودہ علما کا حال یہ ہے کہ کوئی حنفی مسلک کا ذہن لے کر قرآن و حدیث کو پڑھتا ہے اور کوئی غیر حنفی مسلک کا ذہن لے کر۔ اور اس قسم کا متاثر ذہن قرآن و حدیث کو سمجھنے میں رکاوٹ ہے نہ کہ ان کو سمجھنے میں مددگار۔

مزید یہ کہ خود فتح الباری، اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود، حدیث کی تشریح زیادہ تر فنّی پہلوؤں کے اعتبار سے کرتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کا مطالعہ بجائے خود فہم حدیث کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۲

ایک عالمی جائزہ (ہندستان ٹائمس ۱۳ اپریل) کے مطابق، اس وقت زیر ترقی ممالک میں دنیا کی آبادی کا ۷۵ فیصد حصہ آباد ہے۔ مگر ان کو دنیا کی آمدنی کا صرف ۱۴ فیصد حصہ ملتا ہے:

today, the developing world has 75 percent of the world population and 14 percent of the world income.

اس فرق کو ایشیائی اور افریقی مبصرین مغرب کی "سازش" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مگر میں اس کو قانون قدرت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ سازش بھی، اگر بالفرض اس کو مان لیا جائے تو وہ مغربی قوموں کی صلاحیت کے خانہ میں جاتی ہے۔ کسی سازش کی کامیابی کے لئے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ سازش کرنے والے کی کامیاب منصوبہ بندی، اور سازش سے متاثر ہونے والے کا اس کے توڑ میں ناکام ثابت ہونا۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۲

الطاف حسین حالی (۱۹۱۴ — ۱۸۳۷) نے اپنی مسدس میں کہا تھا:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں   ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں.

یہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ لوگوں کے اندر سیاسی جوش پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ حالی کی اس بات کا مذاق اڑایا گیا۔ اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۵) نے کہا:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت   ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

۱۵ اپریل ۱۹۹۲

مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) اور ان کے استاد مولانا محمود حسن صاحب ریشمی رومال تحریک کے تحت مدینہ میں تھے۔ انگریز اس منصوبہ سے باخبر ہو گئے۔ ان کی ہدایت پر شریف مکہ نے ان دونوں کو گرفتار کرکے دسمبر ۱۹۱۶ میں مصر بھیج دیا۔ وہاں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے بعد دونوں کو ۲۱ فروری ۱۹۱۷ کو مالٹا پہنچا کر وہاں ایک قدیم قلعہ کے اندر قید کر دیا گیا۔ یہاں تین ہزار قیدی پہلے سے موجود تھے۔ یہ لوگ ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ تک مالٹا میں رہے۔ اس کے بعد بحری جہاز کے ذریعہ انھیں لاکر ۵ جون ۱۹۲۰ کو بمبئی میں رہا کر دیا گیا۔ مالٹا میں وہ مجموعی طور پر تین سال سات مہینے رہے۔

ترک موالات کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی تحریک پر مسلم طلبہ نے کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کا بائیکاٹ کیا تو مولانا آزاد نے ان کے لئے کلکتہ کی مسجد ناخدا میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی یہاں مدرس مقرر کئے گئے۔ وہ دسمبر ۱۹۲۰ سے جون ۱۹۲۱ تک سات مہینے اس مدرسہ سے وابستہ رہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۷۲ کو مسجد عبدالنبی میں میری ملاقات مولانا حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولانا اسعد مدنی سے ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (مولانا حسین احمد مدنی) سے یہ سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد ناخدا میں تقسیم سے پہلے ہر روز تقریباً ایک سو آدمی آکر اسلام قبول کرتے تھے۔ اور یہی کیفیت اس وقت سارے ملک میں تھی۔ مگر تقسیم کی منافرت کی سیاست کے نتیجہ میں یہ سب ختم ہو گیا (الجمعیۃ ویکلی ۲۴ مارچ ۱۹۷۲، صفحہ ۳)

۱۶ اپریل ۱۹۹۲

محمد ادریس صاحب بھوپالی سے ملاقات ہوئی۔ وہ سعودی عرب جاتے ہوئے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بھوپال میں عید کی رات (۴ اور ۵ اپریل ۱۹۹۲ کی درمیانی شب میں) فرقہ پرست ہندو تقریباً ساری رات سڑکوں پر ہنگامہ کرتے رہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں نے جمع ہو کر جلوس نکالا اور مسلم محلوں کی سڑکوں سے گزرے۔ ان کی ایک تعداد پیدل چل رہی تھی اور ایک تعداد ٹرکوں پر سوار تھی۔ مسلم محلوں میں گھومتے ہوئے انھوں نے برابر

اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ مگر مسلمانوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ہر ایک عید کی تیاری میں مشغول رہا۔ صبح کو بھوپال کی عیدگاہ میں پونے آٹھ بجے عید کی نماز تھی۔ امام صاحب ٹھیک وقت پر کھڑے ہو گئے۔ معمول کے خلاف نہ شروع میں کوئی تقریر کی اور نہ آخر میں لمبی دعا۔ بہت کم وقت میں لوگ عیدگاہ سے لوٹ کر اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔

انھوں نے بتایا کہ فرقہ پرست ہندو اسی لئے اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کریں۔ اس کے بعد ان کے خلاف فساد شروع کر دیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے یک طرفہ تحمل اور اعراض نے ان کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۲

ایک صاحب ہیں، وہ اپنے آپ کو پریکٹیکل انسان سمجھتے ہیں اور مجھ کو آئیڈیلسٹ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں عملی تقاضوں کو دیکھ کر چلتا ہوں۔ چنانچہ میں ہر میدان میں کامیاب ہوں۔ اس کے برعکس تمہارا یہ حال ہے کہ تم ہمیشہ اپنے آئیڈیلزم کی وجہ سے نہایت قیمتی مواقع کو کھو دیتے ہو۔

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔ آخر میں میں نے ان کو حدیث سنائی۔ (من احب دنیاہ اضر بآخرتہ ومن احب آخرتہ اضر بدنیاہ۔ فآثروا ما یبقی علی ما یفنی) اور کہا کہ ایسا مت کہئے۔ کیا معلوم قیامت کے دن آپ کی کامیابی کو من احب دنیاہ اضر بآخرتہ کے خانہ میں لکھ دیا جائے۔ اور میری ناکامی کو من احب آخرتہ اضر بدنیاہ کے خانہ میں۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۲

مسجد میں امام نے سلام پھیرا تو فوراً صف سے ایک آدمی اٹھا اور کھڑا ہو کر چندہ کی اپیل کرنے لگا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ان لوگوں نے مسجد کو چندہ مانگنے کا اڈہ بنا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برے وہ لوگ ہیں جو مسجد کو سیاست کا اڈہ بنائے ہوئے ہیں۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۲

جواہر لال نہرو یونیورسٹی (دہلی) کے کچھ مسلم طلبہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ

اس یونیورسٹی میں مسلم طلبہ کی تعداد دس فیصد سے زیادہ ہے۔ سالہا سال سے یہاں ہندو اور طلبہ اور مسلم طلبہ بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ ان کے درمیان فرقہ وارانہ فیلنگ بالکل نہیں تھی۔ اب وہاں کچھ جماعت اسلامی کے ذہن کے طلبہ آگئے۔ انھوں نے مسلم طلبہ کے درمیان یہ تحریک چلائی کہ ان کا علیحدہ اتحاد قائم کیا جائے۔ طلبہ نے کہا کہ مسلمانوں میں تو اتحاد کا مزاج نہیں۔ چنانچہ مسلم طلبہ متحد نہ ہو سکے۔ البتہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندو طلبہ متحد ہو گئے۔ اور غیر ضروری طور پر یونیورسٹی کیمپس میں ہندو مسلم فیلنگ پیدا ہو گئی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام پسند لوگ ہر جگہ یہی نادانی کر رہے ہیں۔ وہ حالات کے خلاف غیر دانشمندانہ طور پر اسلام کا جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں خود مسلمان تو متحد نہیں ہو پاتے۔ مگر غیر مسلم عناصر متحد ہو کر زیادہ بڑا مسئلہ بن جاتے ہیں۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۲

جامعہ ملیہ (دہلی) کے ایک ریسرچ اسکالر آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک مقالہ تیار کر رہا ہوں جس میں یہ دکھایا جائے گا کہ سائنس کی تمام باتیں خود ہمارے قرآن میں موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس نظریہ سے اتفاق نہیں۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امور انسانی کی دو تقسیم کی ہے۔ امور آخرت اور امور دنیا۔ آپ نے امور آخرت کا ماخذ قرآن و سنت کو قرار دیا۔ اور امور دنیا کی بابت یہ ہدایت دی کہ وہ سائنٹفک ریسرچ سے تعلق رکھتی ہیں۔ تمہاری تحقیق اور تجربہ سے جو بات ٹھیک ثابت ہو، اس کو مان لو۔ یہی تقسیم اسلام اور عقل کے مطابق ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۲

رحمان نیر صاحب (نظام الدین) اپنا پچھلا مکان گرا کر نیا مکان بنا رہے ہیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ نئے مکان کی تعمیر میں ایک سال کا وقت لگے گا۔ ان کے پڑوسی کے ایک مسلم وکیل نے انھیں اپنا ایک مکان دیا کہ یہاں آپ ایک سال تک بلا کرایہ رہیں۔ ایک سال پر خالی کر کے مجھے لوٹا دیں۔ ابھی سات مہینے گزر رہے تھے کہ وکیل صاحب نے ان سے مطالبہ کیا کہ آپ میرا مکان خالی کر دیجئے۔ رحمان نیر صاحب نے کہا کہ آپ نے تو مجھے ایک سال کے لئے دیا تھا۔ پھر آپ قبل از وقت کیوں

خالی کروا رہے ہیں۔ وکیل صاحب نے کہا کہ میرے رشتہ دار پاکستان سے آرہے ہیں۔ ان کو ٹھہرانا ہے۔ رحمان نیر صاحب نے کہا کہ آپ انھیں ہوٹل میں ٹھہرا دیں۔ اس کا پورا بل میں ادا کروں گا۔ مگر وکیل صاحب راضی نہیں ہوئے

رحمٰن نیر صاحب کی بیوی وغیرہ اس بات پر بہت خفا ہیں۔ مگر رحمان نیر صاحب نے انھیں سمجھایا کہ یہ خفگی شکر کی نفسیات کے خلاف ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہم کو سات مہینہ تک بلا کرایہ کا ایک گھر ملا دیا۔ اگر ہم اس پر شکر کریں گے تو جس طرح اللہ نے پہلے ہمارا انتظام کیا، وہ آئندہ بھی ہمارا انتظام کرے گا۔ میں نے کہا کہ یہی سوچ دینی سوچ ہے۔ ملے ہوئے کو یاد کرنے سے شکر گزاری پیدا ہوتی ہے اور ملے ہوئے کو بھول جانے سے ناشکری۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۲

کلیم اللہ صدیقی (گورکھپور) نے فرمائش کی کہ مجھے کوئی پیغام لکھ کر دیدیجئے۔ میں نے انھیں حسب ذیل الفاظ لکھ کر دئے: زندگی ایک امتحان ہے۔ جو آدمی جتنا زیادہ باشعور ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہوگا۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۲

النسائی (کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء) میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتیں اور خوشبو میری پسند بنا دی گئی ہیں۔ اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔ (عن انس، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. حُبّبَ الیّ النساء و الطیب وجعلت قرۃ عینی فی الصلاۃ

"میں" کا لفظ یہاں ذاتی معنوں میں نہیں ہے۔ وہ دراصل ایک تربیتی اسلوب کے طور پر ہے۔ اس سے مقصد یہ بتانا ہے کہ ایک صحیح الفطرت اور ایک حق پرست آدمی کی محبوبات کی فہرست کیا ہونا چاہئے۔

یہاں "تین" کا لفظ بھی بطور عنوان ہے نہ کہ بطور حصر۔ عورت گویا انسانی خواہش کی جائز تکمیل کی علامت ہے۔ خوشبو گویا فطرت سے لطف اندوز ہونے کی بے ضرر صورت ہے۔ نماز یا عبادت الٰہی وہ چیز ہے جو آدمی کی روح کی حقیقی تسکین کا سرچشمہ ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۹۲

ایک ضرورت کے تحت میں دہلی کے ایک نرسنگ ہوم میں گیا۔ یہ پرائیویٹ نرسنگ ہوم ہے۔ ہر چیز نہایت باقاعدہ اور منظم تھی۔ ڈاکٹر حضرات اور عملہ کے دوسرے افراد معیاری انداز میں اپنے کام میں مصروف تھے۔ یہ سب کے سب ہندو لوگ تھے۔

ان کو دیکھ کر خیال آیا کہ خدا کے کتنے بندے ہیں جو ابھی حق کو نہیں جانتے۔ کتنا زیادہ ضروری ہے کہ ان کو حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ میں نے سوچا کہ اگلی ملاقات میں انشاءاللہ میں یہاں کے ڈاکٹر کو الرسالہ انگریزی کی کچھ کاپیاں پیش کروں گا۔

ان بندگان خدا کو دعوت پیش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے اسلامی حکومت کے محاسن بیان کئے جائیں۔ ان کے لئے دعوت کا اصل کام یہ ہے کہ ان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے باخبر کیا جائے۔ انسانوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے باخبر کرنا ہی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔

۲۵ اپریل ۱۹۹۲

بنگلور کے ایک صاحب جو عالم ہیں اور تبلیغی جماعت کے چلہ میں نکلے تھے۔ چلہ پورا کرنے کے بعد مجھ سے ملے۔ میں نے اس سلسلہ میں ان کے تاثرات پوچھے تو انھوں نے بتایا کہ چلہ کے بعد دل میں بڑا سکون محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ سکون تو غفلت کی علامت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے نمونہ ہیں۔ آپ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ کان متوالی الاحزان دائم الفکرۃ۔ اس کے مطابق، ایمان کا نتیجہ درد ہونا چاہئے نہ کہ سکون۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۲

رڑکی کے ایک نوجوان آئے۔ انھوں نے انجنیرنگ کا کورس کیا ہے۔ ان کے والدین نے ان کا نکاح کر دیا تھا۔ مگر دو سال ساتھ رہنے کے بعد دونوں میں ان بن ہوگئی۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ پوچھا کہ کیا میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ میں نے کہا کہ طلاق کا معاملہ ایک انتہائی نجی معاملہ ہے۔ اس کا فیصلہ آدمی خود ہی کر سکتا ہے۔ تاہم میں ایک اصولی بات کہوں گا۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں آئیڈیل بیوی ملنا ممکن نہیں ہے۔ آپ اگر شادی شدہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہر حال میں آئیڈیل سے کم پر راضی ہونا پڑے گا۔ آپ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن

میں رکھ لیں، اس کے بعد جو اقدام چاہیں کریں۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۲

مولانا نیر ربانی (بنگلور) الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے مشن سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ تنقید کے طریقہ سے آپ کو احتراز کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں ہمارے لئے تنقید اور بے تنقید میں انتخاب نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں انتخاب ہے۔ اگر آپ تنقید کا عمل بند کر دیں تو اس کے بعد جو صورت حال قائم ہوگی وہ سادہ طور پر بے تنقید حالت میں نہیں ہے بلکہ ذہنی جمود کی حالت ہے۔ اور ذہنی جمود کسی قوم کے لئے موت ہے۔

تبلیغی جماعت کے ایک عالم سے میں نے کہا کہ آپ لوگ جب بیعت لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کی یہ بیعت براہ راست مولانا الیاس صاحب سے ہو رہی ہے۔ حالاں کہ شرعی اعتبار سے یہ ایک بے اصل بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو سلسلہ کا معاملہ ہے، اور سلسلۂ اسناد تو حدیث کی روایت میں بھی پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اسناد میں خارجی سلسلہ ہوتا ہے۔ اس پر باطنی سلسلہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور تبلیغی عالم نے کہا کہ سوویت یونین امریکہ کی اسلام دشمنی کے خلاف چیک کا کام کرتا تھا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد یہ روک ختم ہو گیا۔ یہ صورت حال عالم اسلام کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ مسجد کی تقریروں میں کہتے ہیں کہ چیزوں سے نہیں ہوتا، خدا سے ہوتا ہے اور مسجد کے باہر یہ فرماتے ہیں کہ خدا سے نہیں ہوتا روس سے ہوتا ہے۔

اس قسم کی تمام باتیں ذہنی جمود کی پیداوار ہیں۔

۲۸ اپریل ۱۹۹۲

کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ محض فکری تحریک چلا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی فکر کے تحت کوئی عملی ڈھانچہ نہیں بنایا۔ ایسی حالت میں یہ مشن آپ کے بعد بالکل ختم ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ خود فکر کی بنیاد پر عملی ڈھانچہ بنانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ کیوں کہ ابھی ضروری تعداد میں فکری انقلاب والے افراد حاصل نہیں ہوئے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں نظر آتا ہے۔ مگر وہ مطلوب نہیں۔

ایک ہے، خود اپنی فکر کی بنیاد پر عملی ڈھانچہ کی تشکیل۔ دوسرا ہے، مروجہ ذوق سے موافقت کر کے ڈھانچہ بنانا۔ موجودہ زمانہ میں جن تحریکوں کا یہاں آپ ڈھانچہ دیکھ رہے ہیں وہ سب دوسری نوعیت کی مثال ہیں۔ مثلاً ندوۃ العلماء کی حیثیت ابتداءً تحریک کی تھی مگر آج وہ صرف ندوۃ المدارس کی سطح پر قائم ہے۔ تبلیغی جماعت نے خانقاہی نظام سے مصالحت کر کے ایک ڈھانچہ بنایا ہے، جس کو آپ متحرک خانقاہ کہہ سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی کا موجودہ ڈھانچہ صرف جماعت قومی کی سطح پر قائم ہے۔ اس کی قدیم فکری حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ وغیرہ۔

۲۹ اپریل ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے شمار اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں۔ مگر نتیجہ صفر ہے۔ مزید یہ کہ ساری دنیا میں مسلمان ہی سب سے زیادہ قوموں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں آخر اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ پر میں نے بھی کافی سوچا ہے۔ آخر کار جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جوہر انسانیت کھو دیا ہے۔ ہر قوم پر بالآخر زوال آتا ہے۔ اور زوال کی آخری علامت یہ ہے کہ اس کے افراد میں انسانی اوصاف باقی نہ رہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا کیس میرے نزدیک یہی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے تمام مصلحین کی مشترک غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اس حالت زوال کو نہیں سمجھا۔ ہر شخص اٹھ کر مسلمانوں کے درمیان "حدی خوانی" کرنے لگا۔ اس وقت زیادہ ضرورت یہ تھی کہ غیر مسلموں میں کام کر کے مسلمانوں کے پرانے خون میں نیا خون شامل کیا جائے۔ مگر اس راز کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ کسی نے اس پر عمل کیا۔

مولانا الیاس صاحب اور ان کی تبلیغی جماعت کی ساری کوشش یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کی جائے اور پھر ان کے ذریعہ سے غیر مسلموں میں دین پہنچایا جائے۔ حالانکہ زیادہ صحیح ترتیب یہ تھی کہ غیر مسلموں میں کام کر کے ان کی ایک تعداد کو مسلمانوں میں شامل کیا جائے۔ تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر ہم مسلسل یہ منظر دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں بہت بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں مگر مثبت معنوں میں وہ کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہیں۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۲

جدہ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے مصنف ہیں۔ دونوں زبانوں میں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ وہ اسلامی فنون سے متعلق مختلف کتابوں اور ریسرچ کی تفصیلات بتاتے رہے۔ اس کو سن کر میرے اندر سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ میں نے کہا: کسی کی پہنچ فنی موضوعات تک ہے، کسی کی پہنچ علمی موضوعات تک اور کسی کی پہنچ قومی موضوعات تک۔ مگر کوئی نہیں جس کی پہنچ ربانی موضوعات تک ہو۔

یکم مئی ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا زبردست چرچا ہے۔ بے شمار مجلات مختلف زبانوں میں نکل رہے ہیں۔ ان گنت کتابیں لکھی اور چھاپی جارہی ہیں۔ ہر طرف جلسوں اور کانفرنسوں کا ہنگامہ نظر آتا ہے۔ مدرسوں اور مسجدوں کی رونق میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ وغیرہ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قومی ظاہرہ (phenomenon) ہے نہ کہ فی الواقع کوئی دینی ظاہرہ۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان سرگرمیوں میں قومی جذبات تو خوب پائے جاتے ہیں مگر حقیقی دینی جذبات کا کوئی وجود نہیں۔ ان میں قومی فخر، قومی شکایت، قومی مطالبات، قومی مفادات، قومی رسوم، قومی تشخص، قومی مسائل، قومی تہذیب جیسی چیزیں تو نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں وہی چیز حذف ہے جو دین کا اصل مغز اور خلاصہ ہے، یعنی خوف خدا اور فکر آخرت۔ یہی دین کی اصل ہے مگر اسی کا ان سرگرمیوں میں کہیں وجود نہیں، اور اگر کہیں ہے تو محض ضمنی اور رسمی طور پر، جس کا ہونا بھی ویسا ہی ہے جیسا اس کا نہ ہونا۔

۲ مئی ۱۹۹۲

آجکل مسلم پریس میں امریکہ کے "نیو ورلڈ آرڈر" کا بہت چرچا ہے۔ تمام مسلم دانشور اس کے خلاف برہم ہیں۔ اس کو صلیبی ورلڈ آڈر اور صہیونی ورلڈ آڈر کا نام دیا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے، اور یہ سب کچھ وہ اسی اسلام دشمنی میں کر رہا ہے۔

مگر یہ سب نہایت سطحی باتیں ہیں۔ امریکہ کے سامنے اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ خود اپنا مسئلہ ہے۔ جس طرح تمام قوموں اور حکومتوں کے سامنے اپنا مسئلہ ہوتا ہے۔ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک نہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امریکہ اپنے مفادات کا دوست نمبر ایک ہے۔

۳ مئی ۱۹۹۲

ایک صاحب جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہندوؤں کے معاملہ میں صبر و اعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ہندو مشرک ہیں۔ اور مشرکوں سے قرآن میں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ توبہ میں فرمایا: قاتلوا المشرکین (التوبہ ۳۶)

میں نے کہا کہ یہ آیت مدنی دور میں اتری۔ اس سے پہلے مکی دور میں بھی مشرکین تھے مگر اس وقت ان کی ظلم و زیادتی کے باوجود ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ مسلسل صبر کی تلقین کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے مکی دور کے مشرکوں کا حکم کچھ اور تھا اور ہجرت کے بعد مدنی دور کے مشرکوں کا حکم کچھ اور۔ ایسی حالت میں یہ متعین کرنا ہوگا کہ موجودہ ہندوؤں کی شرعی حیثیت مکی دور کے مشرکین جیسی ہے یا مدنی دور کے مشرکین جیسی۔

میرے نزدیک یہاں کے ہندوؤں کی حیثیت مکی دور کے مشرکین جیسی ہے۔ ان سے وہ سلوک کرنا ہے جو دعوت کے مرحلہ میں مدعو قوم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی یک طرفہ صبر کرتے ہوئے انھیں دعوت پہنچانا۔

۴ مئی ۱۹۹۲

قرآن میں ہے کہ ان واقعات میں متوسمین کے لئے نشانیاں ہیں۔ (الحجر ۷۵) متوسمین سے مراد معتبرین ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو عبرت کی نگاہ رکھتے ہوں۔ اور ظاہری علامتوں کو دیکھ کر باطنی سبق اخذ کرسکیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو لوگوں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیتے ہیں (إنّ للّٰه عزوجل عباداً یعرفون الناس بالتوسم) عبداللہ ابن عباس رض کا قول ہے کہ جب بھی کوئی شخص مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اس کے سوال سے پہچان لیتا ہوں کہ وہ صاحب تفقہ ہے یا تفقہ کی صلاحیت سے خالی (ما سألنی احد عن شئ الا عرفت أفقیه هو او غیر فقیه) الجامع لاحکام القرآن ۱۰/ ۴۵ - ۴۶

ایک صاحب نے الرسالہ کی تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کیا چیز آپ کو پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا سبق نکالا جاتا ہے۔ میں نے انھیں سورہ الحجر کی مذکورہ آیت بتائی۔ اور کہا کہ الرسالہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ کوئی ادبی کرتب نہیں ہے۔ وہ آپ کے اندر توسم کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔

۵ مئی ۱۹۹۲

مراد آباد کے دو صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ندیم رائی صاحب، منصور احمد صاحب۔ انھوں نے بتایا کہ مراد آباد کا ایک محلہ اصالت پورہ ہے۔ یہاں زیادہ تر انصاری مسلمان رہتے ہیں۔ ایک عرصہ سے قریشی برادری کے کچھ لوگ یہاں ٹھیلہ پر پھل بیچتے تھے۔ بے روزگاری کی وجہ سے اس رمضان میں کچھ مقامی انصاریوں نے بھی ٹھیلہ لے کر پھل بیچنا شروع کیا۔

یہ چیز قریشی ٹھیلہ والوں کو ناگوار ہوئی۔ انھوں نے انصاری ٹھیلہ والوں سے روک ٹوک کی۔ جمعۃ الوداع (۳ اپریل ۱۹۹۲) کو ایک انصاری ٹھیلہ والا ایک قریشی ٹھیلہ والے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ قریشی نے ہٹانے کے لئے کہا۔ اس نے نہیں ہٹایا۔ اس پر تکرار ہوئی یہاں تک کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ پہلے دو شخص کی لڑائی تھی۔ اس کے بعد وہ انصاری اور قریش کی لڑائی بن گئی۔ پتھر نہیں ملے تو پھلوں سے مارنا شروع کیا۔ ساری سڑک پھلوں سے پٹ گئی۔ کم از کم پچاس ہزار روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس دوران محلہ کے کچھ لوگوں نے اپنے گھروں سے فائرنگ بھی کی۔ اب تک اس کا ٹننشن باقی ہے۔

مسلم اور غیر مسلم جھگڑوں میں مسلم رہنماؤں نے برداشت کا اصول نہیں بتایا۔ بلکہ ٹکراؤ کا طریقہ بتایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدم تحمل مسلمانوں کا عام مزاج بن گیا۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ:

واحیاناً علی بکر اخینا   اذا مالم نجد الا اخانا

۶ مئی ۱۹۹۲

امریکہ کے موجودہ صدر جارج بش نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ کو اپنی ایک تقریر میں "نیو ورلڈ

آرڈر" کا لفظ استعمال کیا۔ ان کی تقریر کا انداز یہ بتا رہا تھا گویا کہ وہ اعلان کر رہے ہوں کہ آج ہم دنیا کے سپر پاور ہیں اور ہم امریکی تصور کے مطابق، دنیا کا نیا نقشہ بنائیں گے۔ اس کے بعد خاص طور پر مسلم دنیا میں اس کے خلاف زبردست ردعمل شروع ہوا۔ ہمیں پاکستان سے ایک کتاب موصول ہوئی ہے جس کا نام "نیا عالمی نظام اور پاکستان" ہے۔ ۳۵۱ صفحہ کی پوری کتاب گویا اس کے خلاف احتجاج ہے۔

میرا ذہن اس سے مختلف ہے۔ لوگ جارج بش کی تقریر پر غصہ ہو رہے ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں ابراہام لنکن کا قول یاد دلایا۔ لنکن امریکہ کا سولہواں پریسیڈنٹ (۶۵ - ۱۸۶۱) تھا۔ امریکہ کی تاریخ میں لنکن کو قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے واقعات کو کنٹرول کیا، بلکہ میں کھلے طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ واقعات نے مجھے کنٹرول کیا ہے:

I claim not to have controlled events, but confess plainly that events have controlled me. (Abraham Lincoln)

میں نے کہا کہ اس دنیا میں ہمیشہ تاریخی عوامل فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ بہت جلد آپ دیکھیں گے کہ جارج بش کے الفاظ واقعہ نہیں بنے۔ بلکہ یہ دراصل تاریخی حقائق تھے جنھوں نے دنیا کی صورت گری کی۔

۷ مئی ۱۹۹۲

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے تھے (ما خیّر بین امرین الا اختار ایسرھما)

آجکل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ معاملات میں ہمیشہ آدمی کے سامنے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک مشکل صورت اور دوسری آسان صورت۔ پیغمبر خدا کا طریقہ یہ ہے کہ مشکل انتخاب (Hard option) کو چھوڑ دیا جائے، اور ہمیشہ آسان انتخاب (soft option) کو اختیار کیا جائے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں ہر ملک میں ایک میدان کا روہ ہے جس میں سرگرم ہونے سے حکومتوں سے

یا تشدد پسند جماعتوں سے ٹکراؤ شروع ہوجاتا ہے۔ دوسرا میدان کا رد وہ ہے جس میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ پرامن جدوجہد جاری رکھی جاسکے۔ اب پیغمبرانہ سنت یہ ہوگی کہ پہلی قسم کے میدان میں زور آزمائی سے بچا جائے، اور دوسری قسم کے میدان میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جائے۔

۸ مئی ۱۹۹۲

سلمان رشدی کی کتاب (The Satanic Verses) کے خلاف مسلمانوں کا شور وغل اور مصنف کے قتل کے فتوی کے بعد اس کی بابت بے شمار مضامین نیز کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے جو لندن سے چھپی ہے:

Muhammad: A Western Attempt to Understand Islam by Karem Armstrong, Victor Gollanez, London

خاتون مصنف نے لکھا ہے کہ مغرب میں سٹینک ورسز کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ یہ کتاب محمد اور اسلام کے بارہ میں مغرب کے مخصوص تصور سے نہایت مطابقت رکھتی ہے:

The Satanic Verses fits neatly into the Western Stereotype of Muhammad and Islam.

یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ مگر حق پسندی کے بجائے ذوق پسندی کا یہ مزاج جس طرح مغرب میں ہے ٹھیک اسی طرح وہ مشرق میں اور خود مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر راقم الحروف کے خلاف جو مضامین اور کتابیں پچھلے چند برسوں میں چھپی ہیں ان کو راقم الحروف کے مخالف حلقوں، مثلاً ندوہ، جماعت اسلامی، وغیرہ میں زبردست پذیرائی ملی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ تنقیدیں صحیح ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان مخالفین نے ضد اور انانیت کی بنا پر راقم الحروف کی جو خود ساختہ تصویر بنائی ہے، یہ مطبوعات انھیں اپنی اس تصویر کے عین مطابق نظر آتی ہیں۔

۹ مئی ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (۸ مئی ۱۹۹۲) کے آخری صفحہ پر ایک رنگین اشتہار ہے۔ ایک آدمی نئی شاندار کار پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے چہرہ اور اس کے انداز سے

فخر اور مسرت کے جذبات جھلک رہے ہیں۔ یہ کار اس آدمی کو انعام میں ملی ہے۔

دبئی ایئرپورٹ کی ڈیوٹی فری شاپ نے اپنے بزنس کو بڑھانے کے لئے ایک انعامی اسکیم نکالی ہے جس کو وہ فائنسٹ سرپرائز (finest Surprise) کہتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت پانچ پانچ سو درہم کے ٹکٹ جاری کئے گئے ہیں۔ جن کو وہ لوگ خریدتے ہیں جو دبئی ایئرپورٹ سے گزرتے ہیں۔ اس کے بعد قرعہ نکالا جاتا ہے۔ جس آدمی کے نام قرعہ نکلتا ہے اس کو ایک عمدہ جدید ترین کار دی جاتی ہے۔ اور امیریٹ ایئرلائن (Emirates Airline) کے ذریعہ عالمی (round-the-world) سفر کے دو فرسٹ کلاس ایئر ٹکٹ دے جاتے ہیں۔

تصویر میں جس انعام یافتہ شخص کو دکھایا گیا ہے اس کا نام وحید المعتز بحرینی درج ہے۔ نام کی اس مشابہت کو دیکھ کر میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے:

یا اللہ، ایک وحید کو دینے والوں نے دنیا کا فائنسٹ سرپرائز
دیا ہے، دوسرے وحید کو آپ آخرت کا فائنسٹ سرپرائز دے دیجئے۔

۱۰ مئی ۱۹۹۲

کراچی سے ایک پندرہ روزہ یقین انٹرنیشنل کے نام سے نکلتا ہے۔ وہ انگریزی اور عربی زبان میں ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۹۲ میں یہ خبر ہے کہ لندن میں اسلامک ہریٹج سنٹر (Islamic Heritage Centre) کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس میں اسلامی کتابوں کے مخطوطات جمع کئے جا رہے ہیں۔ اس کے ذمہ داروں کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگالی اور دوسری زبانوں میں جو اسلامی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد دو ملین سے زیادہ ہے۔

۱۱ مئی ۱۹۹۲

سورہ الحجرات میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص کی آبرو دوسرے شخص کے اوپر حرام ہے (واعراضکم علیکم حرام) مجلہ الازہر (اپریل ۱۹۹۲) میں اس سلسلہ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض علماء نے یہ کہا کہ غیبت ایک ظلم ہے اور اس کا کفارہ اس

شخص کے حق میں استغفار ہے جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ (وقال بعض العلماء: ان الغیبة مظلمة، وکفارتها الاستغفار لصاحبها الذی اغتبتہ) غیبت ہمیشہ نفرت اور بدخواہی کے جذبہ سے نکلتی ہے۔ غیبت کے بعد اگر واقعۃً آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ کھلے طور پر اس کا اعتراف کرے تو یہ محض ایک سادہ بات نہیں ہوتی۔ ایسا اعتراف دراصل پوری نفسیات میں تبدیلی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کے خلاف پہلے آپ کے دل میں نفرت اور بدخواہی تھی، اس کے لئے اب محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ غیبت کرنے والے کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہوجائے تو اس وقت دوسرے شخص کے حق میں اس کی زبان سے جو دعا نکلے گی وہ محض کچھ الفاظ نہ ہوں گے بلکہ ایک ایسا عمل ہوگا جو ہر غلطی کو محو کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۹۲

راشٹریہ سہارا کے نام سے دہلی سے ایک ہندی روزنامہ نکلتا ہے۔ اس کے نمائندہ نے انٹرویو لیا۔ اس سلسلہ میں اس نے پوچھا کہ سلمان رشدی کی کتاب (سیٹنک ورسیز) پر مسلمانوں نے جو تشدد دانہ ردعمل ظاہر کیا ہے اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک بات کا جواب بات ہے، بات کا جواب گولی نہیں ہے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۲

حضرت امیر معاویہ کے زمانہ میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ عرب اگرچہ جہاز راں نہ تھے۔ مگر انھوں نے بڑی بڑی کشتیاں بنائیں اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ مگر جس چیز نے اس محاصرہ کو ناکام بنا دیا وہ گریک فائر تھی۔ قسطنطنیہ کی رومی فوج نے قلعہ کے اندر سے گریک فائر پھینکی جس سے مسلمانوں کا کافی نقصان ہوا اور انھیں واپس ہونا پڑا۔

(19/576) (IV/708)

مگر اس نقصان کے بعد انھوں نے شکایت اور احتجاج کا دفتر نہیں کھولا بلکہ اس پراسرار فوجی ہتھیار کو معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر کار انھوں نے اس کو دریافت کر لیا اور پانچویں صلیبی جنگ میں اس کو استعمال کرکے دشمن کو زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی نقصان پہنچایا جو

قسطنطنیہ کے محاصرہ میں انہیں پہنچایا تھا۔

۱۴ مئی ۱۹۹۲

ایشیاویک (Asiaweek) ٹائم گروپ کا ایک ہفتہ وار انگریزی میگزین ہے۔ اس کے سینئر کرسپانڈنٹ روی ویلور (Ravi Velloor) آج انٹرویو کے لئے آئے۔ انٹرویو کے بعد انھوں نے کہا کہ اسلام پر انگریزی زبان میں تعارفی کتاب ہو تو اس کو میں خریدنا چاہتا ہوں تاکہ یہ جانوں کہ اسلام کیا ہے۔ ان کو اسلامی مرکز کی کچھ مطبوعات دی گئیں۔

مجھے بار بار اس طرح کا تجربہ ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ انسان ہر چیز کے بارہ میں براہ راست معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اسلام کے بارہ میں بھی جاننا چاہتا ہے۔ مگر اصل کمی یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام پر تعارف کے لئے جدید اسلوب میں لٹریچر تیار نہیں کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۹۲

امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین کو کچھ لوگ اپنے موضوع پر سب سے اعلیٰ کتاب سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ نے فرمایا کہ جس شخص نے احیاء العلوم کو نہیں پڑھا وہ زندہ لوگوں میں سے نہیں (من لم یقرأ الإحیاء لیس من الأحیاء) دوسری طرف کچھ لوگ (مثلاً ابن تیمیہ) اس کے سخت ناقد ہیں۔ اس کتاب میں تصوف اور فلسفہ کا جو عنصر ہے اس کو وہ ضلالت سے کم نہیں سمجھتے۔ اس کتاب پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھری ہوئی ہیں۔

۱۶ مئی ۱۹۹۲

اسلام میں علم کی اہمیت ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فاطمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور عائشہ آپ کی بیوی۔ عام ذوق کے مطابق، اولاد کا درجہ بیوی سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر علماء اسلام نے لکھا ہے کہ عائشہ کو فاطمہ پر فضیلت حاصل ہے۔ کیوں کہ عائشہ علم میں فاطمہ سے بڑھی ہوئی تھیں (قیل ان عائشة افضل من فاطمه لأنّ لعائشة شرف العلم (ابن عابدین، فتاویٰ شامیہ (رد المحتار) ۲/۲۵۰

۱۷ مئی ۱۹۹۲

غزالی نے احیاء علوم الدین میں صوفیاء کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روحانی علم (یا علم مکاشفہ) اپنی تکمیل کے لئے علم شریعت کا محتاج نہیں۔ اس کے حصول کا ذریعہ خلوت کی ریاضتیں ہیں۔ اس خلوت کے لئے صرف تاریک حجرہ ہی موزوں ہے۔ اور اگر تاریک جگہ نہ ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنا سر گریبان میں ڈال کر اوپر سے چادر اوڑھ لے۔ یہی وہ حالت ہے جس میں آوازِ حق سنی جاسکتی ہے۔ اور جلالِ الٰہی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ (احیاء العلوم ۳/ ۶۶)

یہی تمام صوفیاء کا نظریہ ہے۔ مگر وہ سراسر لغو ہے۔ اللہ کی معرفت اللہ کی تخلیقات میں غور کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کا ذریعہ آثارِ کائنات کو دیکھنا اور اس میں آلاء اللہ کی جھلکیوں کو پانا ہے۔ بند حجروں میں بیٹھنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۹۲

۱۸۵۷ کے بعد علماء ہند عام طور پر انگریزوں کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ وہ ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ انگریزوں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ان سے کسی بھی قسم کا تعلق قائم کرنا حرام سمجھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان عام طور پر امریکہ کے بارے میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ امریکہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ امریکہ اسلام کو مٹاڈالنا چاہتا ہے۔ وغیرہ۔

میں اس طرزِ فکر کو سراسر غلط سمجھتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ماضی کے مسلمانوں اور حال کے مسلمانوں میں ایک فرق ہے۔ ماضی کے مسلمان اپنے اس احمقانہ نظریہ میں مخلص تھے اس لئے وہ انگریزوں سے کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف خوب سب وشتم کریں گے مگر پہلا موقع ملتے ہی خود بھی فخر کے ساتھ امریکہ پہنچیں گے اور اپنے بیٹے اور داماد کے لئے بھی چاہیں گے کہ انھیں امریکہ میں کوئی کام مل جائے۔ پچھلے لوگوں کی روش اگر اجتہادی غلطی تھی تو موجودہ لوگوں کی روش کھلی ہوئی منافقت۔

۱۹ مئی ۱۹۹۲

اقبال نے شاہ بوعلی قلندر کا قصہ نظم کیا ہے۔ ان کا ایک مرید بازار گیا۔ اس وقت شہر کے عامل کی سواری آ رہی تھی۔ درویش مرید استغراق میں تھا۔ راستہ سے ہٹ نہ سکا۔ عامل کے چوبدار نے آواز دے کر ہٹانا چاہا، مگر وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا اسی طرح راستہ کے درمیان چلتا رہا۔ چوبدار نے مرید کے سر پر اپنا ڈنڈا مارا۔ مرید چوٹ کھانے کے بعد واپس آیا اور اپنے شیخ بوعلی قلندر سے فریاد کی۔ شیخ نے ناراض ہو کر بادشاہ کو خط لکھوایا کہ تمہارے عامل نے میرے مرید کو مارا ہے۔ اس کو فوراً معزول کر دو، ورنہ میں تمہارا ملک کسی اور کو دے دوں گا:

بازگیر ایں عامل بدگو ہرے ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

یہ بات واضح طور پر قرآن کے بیان کے خلاف ہے۔ کیوں کہ قرآن کہتا ہے کہ "ملک" کو دینا یا چھیننا مکمل طور پر صرف خدا کے اختیار میں ہے (آل عمران ۲۶) صوفیا اور شعراء کا کلام اس قسم کی لغو باتوں سے بھرا ہوا ہے، اس کے باوجود صوفیا اور شعراء کی ہر طرف پرستش ہو رہی ہے۔ یہی ہے ——— رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (الفرقان)

۲۰ مئی ۱۹۹۲

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کے ذیل میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ بلیٰ ولٰکن لیطمئن قلبی (البقرہ ۲۶۰) اس کی تفسیر میں ایک شخص نے کہا کہ "قلبی" دراصل حضرت ابراہیم کے ایک جگری دوست کا نام تھا۔ اور انھوں نے اپنے اسی دوست کے لئے وہ بات کہی تھی۔ (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی) اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر سنجیدہ نہ ہو تو وہ کسی بھی کلام کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ قرآن کو بھی نہیں۔ غیر سنجیدہ آدمی کے لئے ہر کلام ناقابل فہم ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۹۲

ہندستان ٹائمس (۲۱ مئی ۱۹۹۲) کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں تقریباً ۴۴ لاکھ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جب کہ قابل تعلیم نوجوانوں

کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ہے:

There were about 40 lakh students studying in all the universities in the country, out of a population of about 10 crore in the young age-group eligible for higher education.

۲۲ مئی ۱۹۹۲

انیسویں صدی میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کو انگریزوں سے انتہائی نفرت ہو گئی۔ اس نفرت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوا۔ بعض صورتیں نہایت عجیب تھیں۔ مثلاً ہندستان کے ایک فارسی لغت نویس نے "فرنگی" کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے: فرنگی بچے از حیوانات بحراست کہ گاہ گاہ بساحل نظر می آید (فرنگی سمندری جانوروں میں سے ایک جانور ہے جو کبھی کبھی ساحل پر دکھائی دیتا ہے) ایک انقلابی شاعر نے نظم لکھی۔ اس میں انگریزوں کو "اے بندرو" کے لفظ سے خطاب کیا گیا تھا۔

اس قسم کے طرز فکر کا نقصان فریق ثانی کو ہو یا نہ ہو مگر خود اس طرز فکر کے حاملین کو یقینی طور پر اس کا نقصان پہنچتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق ثانی کی حیثیت و طاقت کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ اس کو خشکی یا تری کے جانور کی مانند سمجھ لیتا ہے، خواہ باعتبار حقیقت ان کی حیثیت زیادہ علم یا زیادہ طاقت والے انسان کی کیوں نہ ہو گئی ہو۔

۲۳ مئی ۱۹۹۲

الرسالہ جون ۱۹۹۱ میں "زیادہ صحیح اصول" کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا۔ یہ سلطان ٹیپو کے بارہ میں تھا۔ آخری مرحلہ میں انگریز سے ان کا مقابلہ انتہائی غیر متناسب تھا۔ اس میں سلطان ٹیپو کی شکست یقینی تھی۔ مگر وہ یہ کہہ کر انگریزوں سے لڑ گئے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

یہ جملہ برصغیر ہند کے مسلمان پچھلے دو سو سال سے نہایت فخر کے ساتھ دہراتے رہے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ الرسالہ میں میری تنقید چھپی تو ہندستان سے پاکستان تک بہت سے مسلمان سخت برہم ہو گئے۔ اس برہمی کا سبب صرف یہ تھا کہ موجودہ مسلمانوں میں سوچنے کا مادہ نہیں۔

میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔ مگر شیر کے مناظر سے بہت دلچسپی ہے۔ امریکہ کے ایک ادارہ نے نہایت اہتمام کے ساتھ افریقہ کے جنگلوں اور ہندستان کے جنگلوں کی تصویرکشی کرکے شیر کی زندگی پر (اور دوسرے حیوانات پر) فلم تیار کی ہے۔ وہ اکثر ٹی وی پر آتی ہے۔ میں نے اس فلم کو دیکھا۔ یہ فلم جو مکمل طور پر حقیقی واقعات پر مبنی ہے، نہایت سبق آموز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر ہمیشہ لڑائی کو اوائڈ کرتا ہے۔ فلم میں بار بار میں نے دیکھا کہ ایک طرف شیر جارہا ہے دوسری طرف سے ہاتھی، بھینسا، جنگلی کتا وغیرہ آرہے ہیں تو شیر ان سے بچ کر نکل جاتا ہے حتی کہ ہرن اور چیتل وغیرہ جو شیر کی مرغوب غذا ہیں، وہ بھی اگر غول کی صورت میں ہوں تو شیر ان پر حملہ نہیں کرتا۔

شیر کا طریقہ یہ ہے کہ طاقت ہو تب بھی نہ لڑو۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے شیر کے نام پر خود ساختہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ طاقت نہ ہو تب بھی لڑ بھاؤ۔

۲۴ مئی ۱۹۹۲

حیدرآباد کے ایک انجینئر سید عارف الدین قادری سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مزاج یا روح عصر (spirit of the age) کو بتانا ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج کے انسان کا مزاج یا اسپرٹ آف دی ایج، ایک لفظ میں، 'انکوائری' ہے۔ موجودہ زمانہ کا انسان ہر چیز کی تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر چیز کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔

'انکوائری' کا یہ مزاج ابتداً سائنسی شعبوں کے بارہ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ پھیلتے پھیلتے مذہب تک پہنچ گیا۔ اس جذبہ کے تحت انسان نے مذہب کی بھی تحقیق شروع کردی۔ چنانچہ آج کی دنیا میں بےشمار لوگ ہیں جو مذہب کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال نے ہمارے لئے دعوت کے نئے مواقع کھول دئے ہیں۔

۲۵ مئی ۱۹۹۲

آج رات تقریباً دو بجے میری نیند کھل گئی۔ حسب معمول میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں سویا ہوا تھا۔ اس کے بعد اٹھ کر لائٹ جلائی اور ایک مضمون لکھنا شروع کیا جو اس وقت میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا

روح معاشرہ۔

چار بجے فجر کی اذان کی آواز آئی تو تین صفحہ کا یہ مضمون تیار ہو چکا تھا۔ اس کو لکھ کر میں نے سوچا کہ تین صفحہ کا یہ مضمون تیس سال میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ۲۰ سال کا مطالعہ اور تجربہ شامل ہے۔ مگر شاید ہی کوئی ہو جو اس پر یقین کرے اور اس انسان کا تو شاید وجود ہی نہیں جو یہ سمجھے کہ اس چھوٹے سے مضمون کو لکھنے میں ۲۰ سال کیوں لگ گئے۔

۲۶ مئی ۱۹۹۲

رتلام کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں خدا کے وجود کے بارہ میں شک میں پڑ گیا ہوں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔

میں نے کہا کہ یہ سوال علمی طور پر بالکل بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ ہمارے لئے انتخاب (option) باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات میں ہے۔ چوں کہ ہم غیر موجود کائنات کا نقطۂ نظر اختیار نہیں کر سکتے، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ باخدا کائنات کے نظریہ کو تسلیم کریں۔

۲۷ مئی ۱۹۹۲

اخبارات کا مطالعہ میرے لئے ایک وحشت خیز تجربہ بن گیا ہے۔ آجکل اخبارات ظلم و فساد کی داستانوں سے اس طرح بھرے ہوتے ہیں کہ ان کو خبر نامہ کے بجائے جرائم نامہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

اخبار پڑھتے ہوئے مجھ کو یہ خیال آیا کہ یہ صورت حال شاید ایک نئے دور کے آغاز کی علامت ہے۔ زمین کو بنانے اور سنوارنے کے بعد پہلے اس پر جنات کو بسایا گیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ جنوں نے باہم قتل و غارتگری کی اور زمین پر فساد برپا کیا۔ اس کے بعد ان کو بے دخل کر کے یہاں انسان کو بسنے کا موقع دیا گیا (تفسیر ابن کثیر ۱/۷۰)

اب انسان نے بھی فساد اور خوں ریزی سے زمین کو بھر دیا ہے۔ اس طرح انسان نے زمین پر بسنے کا استحقاق کھو دیا ہے۔ شاید وہ وقت قریب آگیا ہے کہ دوبارہ انسان کو بحیثیت جنس

کے زمین سے بے دخل کر دیا جائے اور یہاں پر صرف منتخب صالحین کو بسنے کا موقع دیا جائے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ قیامت میں اہل جنت کہیں گے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو زمین کا تنہا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں (الزمر ۷۴)

۲۸ مئی ۱۹۹۲

نیشنل جغرافی سوسائٹی (National Geographic Society) امریکہ میں ۱۸۸۸ میں بنی۔ اس کی بہت سی سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جنگلوں کا ویڈیو فلم تیار کرتی ہے۔ آج میں نے افریقہ کے جنگل کا ایک مکمل ویڈیو فلم دیکھا۔

اس میں سب سے زیادہ شیر کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ ایک گھنٹہ کی فلم میں میں نے دیکھا کہ شیر طاقتور ترین جانور ہونے کے باوجود ٹکراؤ کو آخری حد تک اوائڈ کرتا ہے۔ جنگل میں جب وہ ہاتھیوں کو یا بھینسوں وغیرہ کو دیکھتا ہے تو فوراً اپنا راستہ بدل دیتا ہے۔ حتی کہ ایک بھوکا شیر کبھی ہرن یا چیتل کے غول پر حملہ نہیں کرتا۔ کسی ہرن یا چیتل پر وہ صرف اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ وہ اس کو تنہا پائے۔ ایک منظر یہ تھا کہ ایک شیر کے علاقہ میں دوسرا شیر آ گیا۔ پہلا شیر اپنی آواز میں گرجا۔ دوسرا شیر اس سے لڑنے کے بجائے خاموشی سے بھاگ کر پانچ میل دور چلا گیا۔

ٹیپو سلطان کے اس لفظ کو مسلمان دو سو سال سے دہرا رہے ہیں کہ 'شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے'۔ مذکورہ فلم کو دیکھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ مسلمان دو سو سال سے صرف خود ساختہ الفاظ پر جی رہا ہے۔ کیوں کہ شیر کی وہ صفت ہے ہی نہیں جو ٹیپو نے بیان کی تھی۔ شیر کی سب سے بڑی صفت لڑائی نہ کرنا ہے اور مسلمان شیر کے نام پر بے فائدہ لڑائیوں میں مشغول ہیں۔

۲۹ مئی ۱۹۹۲

میرا ارادہ ہے کہ الرسالہ کا ایک نمبر 'مدارس ڈائری' کے نام سے شائع کیا جائے۔ چند نمائندہ مدارس میں ایک ایک ہفتہ قیام کر کے اس کا جائزہ لیا جائے اور ہر دن ایک تاثر نوٹ کیا جائے۔ اس طرح خلیج ڈائری (الرسالہ مئی ۱۹۹۱) کی طرح مدارس ڈائری مرتب کر کے

اسے بطور نمبر شائع کیا جائے۔

۳۰ مئی ۱۹۹۲

ڈائری کے کچھ حصہ کی کتابت ہو چکی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے مولانا انیس لقمان ندوی کو دیا گیا تھا۔ آج میں نے ان سے پوچھا کہ "ڈائری" کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ تربیت کے نقطۂ نظر سے میں اس کو بہت مفید سمجھتا ہوں۔ اس میں تربیتی عنصر طاقت ور شکل میں پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ ڈائری الرسالہ مشن کے لئے کتاب تصوف کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔

۳۱ مئی ۱۹۹۲

مولانا رفیق کانپوری (پیدائش ۱۹۳۰) سعودی عرب (الخبر) میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ الدعوۃ والارشاد کے شعبہ میں ہیں۔ آج ان سے ملاقات ہوئی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں ہر ایک کو دین بقدر محنت ملتا ہے۔ اور دنیا بقدر مقدر۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے مکمل اتفاق ہے۔

یکم جون ۱۹۹۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر نبوت کے ابتدائی مرحلہ میں "حدیث" کو لکھنے سے منع فرمادیا تھا (لا تکتبوا عنی غیر القرآن) مگر آخر زمانہ میں آپ نے لوگوں کو اس کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ (قیدوا العلم بالکتابۃ) اس فرق کا راز کیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ قرآن کا متن اور حدیث کے کلمات مختلط ہو جائیں گے۔ بعد کو جب قرآن کا متن علاحدہ طور پر پوری طرح ممیز ہو گیا اور کثرت سے اس کے حفاظ پیدا ہو گئے تو یہ اندیشہ باقی نہ رہا۔ اس لئے بعد کو آپ نے کتابت حدیث کی اجازت دے دی۔

یہی حکمت میں نے الرسالہ مشن میں اختیار کی ہے۔ الرسالہ مشن کے ابتدائی دور میں کسی بھی قسم کا اختلاط گوارا نہیں کیا گیا۔ مثلاً الرسالہ میں اشتہارات شامل نہیں کئے گئے۔ مکتبہ الرسالہ میں دوسری کتابیں نہیں رکھی گئیں۔ تعلیمی مدارس نہیں کھولے گئے، وغیرہ۔ مگر اب اللہ کے فضل سے پندرہ سالہ محنت کے نتیجہ میں الرسالہ کا فکر پوری طرح ممیز ہو گیا ہے، اس لئے

اب پالیسی میں تبدیلی کی گئی ہے۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۹۲ کو "الرسالہ بک سنٹر" کے نام سے ادارہ کھولا گیا ہے جس میں اپنی کتابوں کے ساتھ دوسروں کی کتابیں بھی فیاضی کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ اب میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو ان شاء اللہ ایک درس گاہ بھی کھولی جائے گی۔

۲ جون ۱۹۹۲

سید قطب کی عربی تفسیر "فی ظلال القرآن" اولاً قاہرہ سے چھپی تھی۔ ہندستان میں اس کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ اس ترجمہ کی پہلی جلد ۱۹۸۸ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اردو ترجمہ کے آغاز میں "انتساب" کے عنوان سے ایک صفحہ شامل ہے۔ اس میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں:

"ان سعید نفوس کے نام جو قرآن کو سمجھ کر اس کا حق ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں"

یہ انتساب اگرچہ اصل عربی تفسیر میں موجود نہیں۔ مگر وہ اس کی روح کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ فی ظلال القرآن کو پڑھ کر قاری پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ قرآن کوئی ایسی چیز ہے جس کو لے کر آدمی اٹھ کھڑا ہو۔

قرآن اس لئے ہے کہ اس کو پڑھ کر آدمی کے اندر ذکر و فکر کی صلاحیت ابھرے۔ اس کے اندر خوف خدا اور فکر آخرت کا مزاج پیدا ہو۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگنے کا حریص بن جائے۔ قرآن کو پڑھ کر یہ ہونا چاہئے کہ آدمی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔ اور اس کے جسم پر تھرتھری پیدا ہو جائے۔ مگر مذکورہ الفاظ سے مطالعہ قرآن کا یہ تصور آدمی کے ذہن میں نہیں ابھرتا۔

۳ جون ۱۹۹۲

ایک صاحب (مسٹر نسیم) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ غالب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری Vehicle of truth ہے اور اس کی بہترین مثال غالب کی شاعری ہے۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے غالب کا یہ شعر پڑھا:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

میں نے کہا کہ غالب کا یہ شعر آپ کی بات کی تصدیق نہیں کرتا۔ کسی آدمی کو اگر آگاہی حاصل نہ

ہو تو اس کے بعد اس کے لئے دوسرا بدل آگاہی کی تلاش ہے نہ کہ اپنے آپ کو غفلت میں ڈال لینا۔ پھر میں نے کہا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ شاعری Vehicle of truth ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں۔ کیوں کہ شاعری Vehicle of expression ہے نہ کہ vehicle of truth ۔
یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی تجزیاتی انداز میں سوچنا نہیں جانتے۔

۴ جون ۱۹۹۲

آخرت کو یاد کرتے ہوئے یہ الفاظ زبان سے نکلے۔ یا اللہ، لوگ جہنم کو دیکھ کر جہنم سے ڈریں گے، آپ کا یہ عاجز بندہ جہنم کو دیکھے بغیر جہنم سے ڈرا۔ لوگ جنت کو دیکھ کر جنت کے مشتاق ہوں گے، آپ کا یہ عاجز بندہ جنت کو دیکھے بغیر جنت کا مشتاق ہوا۔

۵ جون ۱۹۹۲

آج جمعہ کا دن تھا۔ میں نے کالی مسجد (نظام الدین) میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ گرمی سے جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد باہر آنے لگا تو عین مسجد کے دروازہ پر دو آدمیوں کے درمیان حسب ذیل گفتگو سنائی دی:

"بڑی سخت گرمی ہے۔ پھر جہنم کی گرمی کیسی ہوگی۔"

"جہنم میں نبھ جائے گی۔ یہاں تو آپ گرمی کا مقابلہ کولر اور ایئر کنڈیشنڈ سے کرتے ہیں۔ وہاں تو گرمی ہی گرمی ہو گی۔ اس لئے مقابلہ کا سوال نہیں ہوگا۔ پھر اتنا محسوس بھی نہیں ہوگا۔"

لہجہ کا انداز بتا رہا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی سنجیدہ نہیں۔ پہلے آدمی نے صرف مضمون بندی کے طور پر ایک بات کہہ دی، اور دوسرے آدمی نے بھی صرف مضمون بندی کے طور پر ایک برجستہ جواب دے دیا۔ اور پھر دونوں مسکرا دئے۔

آجکل ہر مسجد میں نمازیوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ میں اس کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز کا تعلق مسلمانوں کے قومی تشخص کے جذبہ سے ہے نہ کہ حقیقۃً احساس آخرت سے۔

۶ جون ۱۹۹۲

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان وہ ہے جو مثل صحابہ ایمان ہو۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر

وہ اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو البتہ انھوں نے ہدایت پائی (فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا)

اصحاب رسول کو معرفت کے درجہ میں ایمان ملا تھا۔ آدمی کو جب معرفت کے درجہ میں ایمان ملے تو اس کے بعد اس پر ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جس شخص کو درجہ معرفت میں ایمان نہ ملے وہ کبھی دین کی باتوں کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ دین کی ناقص تشریح یا غلط ترجمانی جو آج کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کے یہاں عام طور پر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو ایمان تقلید کے طور پر ملا۔ وہ ان کو معرفت کے طور پر نہیں ملا۔

۷ جون ۱۹۹۲

ایک صاحب کو اپنی زندگی کے کچھ واقعات بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ میری زندگی اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس میں اتنے زیادہ متنوع قسم کے واقعات ہیں کہ اگر ان کو صحیح طور پر لکھ دیا جائے تو ناول سے بھی زیادہ دلچسپ ایک کتاب تیار ہو جائے مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی کتاب نہ لکھ سکوں گا۔ تاہم اگر کوئی شخص میری زندگی کی کتاب میرے بعد لکھنا چاہے گا تو وہ ڈائری، خبرنامہ، سفرنامہ، خطوط کے جوابات، اور ٹیپ کی مدد سے کافی حد تک پیغام دے سکتا ہے۔

۸ جون ۱۹۹۲

لیوس ٹامس (Lewis Thomas) ایک امریکی سائنس داں اور فلسفی ہے۔ اس نے زمین کی بابت ایک بار کہا کہ وہ خلا میں لٹکا ہوا اور بظاہر زندہ (hanging there in space and obviously alive) ایک کرہ ہے۔ یہ زمین کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ زمین ایک اتھاہ خلا میں مسلسل گردش کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ زمین کے جو احوال ہیں وہ انتہائی استثنائی طور پر ایک زندہ کرہ کے احوال ہیں۔ یہ چیزیں اتنی حیرت ناک ہیں کہ اگر ان کو سوچا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جائے (ٹائم ۸ جون ۱۹۹۲، صفحہ ۵۲) زمین میں اور بقیہ کائنات میں اتنی زیادہ نشانیاں ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو یہ کائنات اس کے لئے خدا کے جلال و جمال کا آئینہ بن جائے۔

۹ جون ۱۹۹۲

امام سرخسی شرح سیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ روایت میں کہا گیا ہے کہ جب یزید بن معاویہ کو والی بنایا گیا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر وہ خیر ہو تو ہم شکر ادا کریں گے۔ اور اگر وہ مصیبت ہو تو ہم صبر کریں گے (وقد روی ان لما ولی یزید بن معاویۃ قال ابن عمر۔ ان لم یکن خیراً شکرنا و ان یکن بلاء صبرنا)

اس طرح کے معاملات میں یہی صحیح ترین مسلک ہے۔ حضرت حسین نے اس مسلک کے خلاف عمل کیا۔ انھوں نے "صبر" کے بجائے "خروج" کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ بلاشبہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں صحابہ موجود تھے۔ مگر کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ حسین کی یہ اجتہادی غلطی تھی کہ انھوں نے صبر کے معاملہ کو اقدام کا معاملہ سمجھ لیا۔

۱۰ جون ۱۹۹۲

ایک خاتون نے شکایت کی کہ ان کے سسرال والے ان کو ستاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا حل یہ ہے کہ ان کے ستانے پر آپ اپنے دل میں شکایت کا جذبہ نہ آنے دیں بلکہ اس پر صبر کریں۔ انھوں نے کہا کہ صبر سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ صبر سے جنت ملتی ہے۔ اور جس عمل سے جنت ملے اس سے بقیہ چیزیں اپنے آپ مل جائیں گی۔

قرآن میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو ان کے صبر کے بدلے جنت عطا کی جائے گی (الدہر ۱۲) اگر آپ پر تکلیف کے لمحات نہ آئیں تو آپ کو صبر کی ضرورت بھی نہ ہو گی۔ تکلیف والے لمحات آپ کو یہ موقع دیتے ہیں کہ آپ صبر کا ثبوت دے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی سسرال والے آپ کو صبر کا موقع دے کر آپ کو جنت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ وہ آپ کو دھکا دے کر جنت میں پہنچا رہے ہیں۔

۱۱ جون ۱۹۹۲

سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو ضیاء الحق کی حکومت نے ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو پھانسی دے دی تھی۔ پرانی دہلی کے مسلم نوجوان بھٹو کو مسلم عظمت کا نشان سمجھتے تھے۔

وہ اس واقعہ پر سخت برہم ہو گئے۔ اس کے بعد ۶ اپریل کو جمعہ کا دن تھا۔ نوجوانوں نے ضیاء الحق کا پتلا بنا کر جامع مسجد کے باہر کھڑا کیا۔ اور اعلان کیا کہ نماز جمعہ کے بعد اس کو جلایا جائے گا۔

اس روز میں نے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں پڑھی تھی۔ نماز سے پہلے خطبہ کی تقریر میں امام عبداللہ بخاری نے بار بار نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ "اے میرے نوجوانو، میں تم سے کہتا ہوں کہ تم پتلا مت جلاؤ، تمہاری قوتوں کو محفوظ رکھ کر اس کو ہم کسی اور بہتر کام میں لگانا چاہتے ہیں"۔ مگر جیسے ہی نماز ختم ہوئی تمام نوجوان، سنت پڑھے بغیر، تیزی سے باہر نکلے۔ چند منٹ بعد مسجد میں پٹاخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دیکھا تو نوجوان پتلے میں آگ لگا کر اس کے کنارے کھڑے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔

ماہنامہ جامعہ (مئی ۱۹۹۲) میں اقبال کے بارہ میں ایک مضمون ہے۔ بتایا گیا ہے کہ جولائی ۱۹۲۷ میں لاہور کے مسلمانوں میں زبردست شورش تھی۔ "رنگیلا رسول" کے سوال پر مسلمان دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنا چاہتے تھے۔ لاہور کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ڈاکٹر اقبال نے تقریر کی اور کہا کہ آپ لوگ قانون اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ مقدمہ عدالت میں ہے۔ اس کے فیصلہ تک دو تین مہینے صبر کریں۔ مگر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے چلا چلا کر کہا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور ایسے مشوروں کو سننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اقبال نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ ان کی تقریر کو ذرا خاموشی اور سکون سے سن لیں۔ لیکن مسجد میں ہر طرف شور و شغب بلند ہو گیا جس سے مکدر ہو کر اقبال نے تقریر ختم کر دی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

۱۲ جون ۱۹۹۲

جگدیش سنگھ کالرا ایڈوکیٹ (۸۰ سال) تقسیم ۱۹۴۷ کے بعد لاہور سے دہلی آ گئے۔ یہاں وہ نظام الدین ویسٹ میں رہتے ہیں۔ ان سے اکثر پارک میں صبح کو ٹہلتے ہوئے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اچھی اردو جانتے ہیں اور بالکل غیر متعصب آدمی ہیں۔

صبح انھوں نے اقبال کی نظم "شکوہ" کے کچھ اشعار سنائے۔ اور کہا کہ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اقبال نے شکوہ میں کھلے طور پر خدا کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ مگر مسلمان اقبال سے غصہ نہیں ہوتے۔ رشدی نے محمد صاحب کے خلاف گستاخی کی تو تمام مسلمان بھڑک اٹھے۔

اور کہنے لگے کہ اس کو قتل کر دو۔ پھر انھوں نے بتایا کہ یہاں جی۔ ۲۵ میں ایک مسٹر کپور رہتے ہیں۔ انھوں نے مختلف مسلم ملکوں کا سفر کیا ہے۔ اور مسلمانوں سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ خدا کو چاہے کتنا ہی برا کہو مگر مسلمان نہیں بگڑے گا۔ لیکن اگر محمد کو کچھ کہہ دیا تو مسلمان فوراً بھڑک اٹھے گا اور ایسے آدمی کو مار ڈالنے کے درپے ہو جائے گا (یہی بات شہاب نامہ ۱۷۔ ۱۶۔ ۱۲ میں درج ہے)

میں نے مسٹر کالرا سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس فرق کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ محمد تو ایک تاریخی شخص ہیں۔ ان کا وجود معلوم اور مسلّم ہے۔ مگر خدا کے بارہ میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ ہے بھی یا نہیں۔

مسٹر کالرا خدا کے وجود میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کی زبان سے یہ بات سن کر میں نے سوچا کہ مسلمان اپنے موجودہ رویہ سے مسٹر کالرا جیسے لوگوں کے خیال کی تصدیق کر رہے ہیں۔ وہ گویا خدا کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ مسلمان زبان حال سے کہہ رہے ہیں —— محمد کی شخصیت ایک حقیقی شخصیت ہے اور خدا کی شخصیت محض ایک فرضی شخصیت۔

۱۳ جون ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ صحیح نیت کے ساتھ کار پر بیٹھنا بھی ثواب ہے، اور غلط نیت کے ساتھ پیدل چلنا بھی جرم ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ صحیح نیت کیا ہے اور غلط نیت کیا۔ صحیح نیت کا مطلب ہے صحیح ذہن، اور غلط نیت کا مطلب ہے غلط ذہن۔

۱۴ جون ۱۹۹۲

عید الاضحیٰ کی نماز عرب سرائے کی مسجد میں پڑھی۔ امام صاحب نے نماز میں سورہ یوسف کی تلاوت کی۔ اس کو سن کر میں نے سوچا کہ یوسف ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے بھائیوں نے ان کو کنویں میں پھینک دیا۔ تاجروں نے ان کو غلاموں کے زمرہ میں داخل کر دیا۔ عزیز مصر نے ان کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کے ساتھی نے ان کو ایک ناقابل ذکر چیز سمجھا۔ ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت دی اور ان کے قصہ کو اپنی رحمت سے

احسن القصص بنا دیا۔

یہ سوچتے ہوئے جی بھر آیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، میرا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ اصاغر اور اکابر کی پوری فوج میرے خلاف سرگرم ہے۔ لوگ متحد ہو گئے ہیں کہ میرے کو قصہ بنا دیں۔ آپ دوبارہ اپنی رحمت سے میرے قصہ کو احسن القصص میں تبدیل کر دیجئے۔ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔

۱۵ جون ۱۹۹۲

سڑک پر ایک شخص ٹھیلہ کھینچتا ہوا جا رہا تھا۔ ٹھیلہ کے اوپر لوہے تھے۔ ٹھیلہ والے کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت مشکل کے ساتھ یہ کام کر رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ اس ٹھیلہ والے کی غربت اور بدحالی کو دیکھئے۔ اس دنیا میں ایک طرف دولت اور عیش والے لوگ ہیں اور دوسری طرف غریب اور مصیبت زدہ لوگ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا اگر ہے تو اس نے اس قسم کی دنیا کیوں بنائی۔

میں نے کہا کہ یہ دراصل آزادی کی قیمت ہے۔ اگر ہم آزاد دنیا چاہتے ہیں تو لازماً اس دنیا میں اس قسم کے فرق بھی پائے جائیں گے۔ یہاں ہمارے لئے انتخاب آزاد انسان اور محکوم انسان کے درمیان ہے نہ کہ آزاد انسان اور بے نقص انسان کے درمیان۔

۱۶ جون ۱۹۹۲

۱۵ جون کو میں قصاب پورہ کی مسجد گھنٹہ والی میں تھا۔ ایک مقامی تاجر دوست محمد صاحب مسجد میں آئے۔ ایک تبلیغی بزرگ محمد عارف صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک رسالہ نکالتے ہیں"۔

میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "تبلیغ والے جاہل مسلمانوں کو کلمہ نماز سکھاتے ہیں" تو محمد عارف صاحب تبلیغ کے اس تعارف کو تبلیغ کی تصغیر سمجھیں گے۔ وہ پسند کریں گے کہ تبلیغ کے تعارف میں یہ کہا جائے کہ تبلیغ دین کو زندہ کرنے کی عالمی محنت ہے۔

مگر تبلیغ کے بارہ میں مذکورہ تعارفی کلمہ جس طرح تبلیغ کے مشن کی تصغیر ہے اسی طرح یہ بھی ہمارے مشن کی تصغیر ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ "ایک رسالہ نکالتے ہیں"۔ کیوں کہ الرسالہ مشن

صرف ایک رسالہ نکالنے کا نام نہیں بلکہ وہ احیاء اسلام کی ایک عالمی مہم ہے۔

اصل یہ ہے کہ تبلیغ کا پیٹرن قدیم روایتی پیٹرن ہے، اس لئے اس کی اہمیت فوراً لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں الرسالہ کا پیٹرن مکمل طور پر جدید ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ "قدیم" کو وہ اہم سمجھ لیتا ہے، اور "جدید" کی اہمیت کو سمجھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

۱۷ جون ۱۹۹۲

"تبلیغ" کے تحت مسلمانوں کی جماعتیں نکالی جاتی ہیں۔ میں پہلی بار تین دن (۱۳-۱۶ جون) کے لئے بیس آدمیوں کی ایک جماعت میں نکلا۔ یہ جماعت ۱۳ جون کی دوپہر کو نظام الدین سے روانہ ہو کر قصاب پورہ پہنچی۔ وہاں تین مسجدوں میں وقت لگا کر ۱۶ جون کی صبح کو واپس آئی۔ تبلیغ کے نظام میں رات اور دن کے درمیان ۲۴ گھنٹہ کا ایک روٹین ہوتا ہے۔ اس روٹین کو وہ دینی محنت کہتے ہیں۔ یہی روٹین تین دن کی جماعت میں بھی ہوتا ہے، ۱۰ دن کی جماعت میں بھی اور ۴۰ دن کی جماعت میں بھی۔

تین روزہ "دینی محنت" کا کورس مکمل کرنے کے بعد جب میں ۱۶ جون کی صبح کو گھر واپس آیا تو ایک صاحب نے میرا تأثر پوچھا۔ میں نے کہا کہ میں تبلیغی جماعت کی افادیت کا پہلے بھی قائل تھا اور اب بھی قائل ہوں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ تبلیغ لوگوں کو صرف نچلی فکری سطح (lower intellectual plane) پر دین دار بناتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں الرسالہ مشن کا نشانہ یہ ہے کہ لوگوں کو بلند فکری سطح (higher intellectual plane) پر دیندار بنایا جائے۔

تبلیغ کے بارے میں پہلے بھی میری رائے یہی تھی۔ اب عملی تجربہ کے بعد وہ مزید پختہ ہو گئی۔

اسلام کے احیاء کے لئے دونوں قسم کی تحریکوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہر زمانہ میں دونوں قسم کے لوگ سماج میں موجود رہتے ہیں۔ سادہ فکر رکھنے والے لوگ بھی اور گہری فکر رکھنے والے لوگ بھی۔

۱۸ جون ۱۹۹۲

غالباً ۱۹۵۰ میں میری ملاقات جماعت اسلامی کے ایک رکن سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا

کہ سب سے پہلے میں نے رسالہ ترجمان القرآن کا شمارہ ستمبر ۱۹۳۴ پڑھا۔ اتفاق سے اس وقت میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ایک مضمون میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سیاسی اقتدار کی اہمیت کو بتانے کے لئے ٹرین کی مثال دی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو اس کا انجن چلا رہا ہے۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتا ہے۔ جو لوگ اس میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے۔ خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ جانا چاہیں۔ اگر گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس رخ پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رخ آگے کے بجائے پیچھے پھیر دے۔ مگر نشست کا رخ بدلنے سے وہ اپنے سفر کا رخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رخ بدلنے کی صورت میں اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن کے ڈرائیور کو ہٹا کر انجن پر قبضہ کیا جائے۔

مذکورہ بزرگ کو یہ مثال اتنی پسند آئی کہ وہ جماعت میں شامل ہو گئے۔ حالاں کہ اگر ان کے اندر سبق کا ذہن ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ اگلا ہی اسٹیشن اس مثال کی تردید کر رہا ہے۔ اگلے اسٹیشن پر اتر کر مذکورہ بزرگ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے جب کہ ٹرین کے ڈبے بدستور انجن میں بندھ کر اس کی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ موصوف کا خود اپنا تجربہ بتا رہا تھا کہ انسان کا معاملہ ٹرین کے ڈبوں سے مختلف ہے۔ مگر وہ اس کو سمجھ نہ سکے۔ کیوں کہ ان کے اندر یہ صلاحیت نہ تھی کہ پہلے واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ساتھ ملا کر کوئی سبق نکال سکیں۔

۱۹ جون ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں جو انقلابات آئے، ان کا ایک عظیم فائدہ یہ ہوا کہ دعوت کے راستہ کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ موقع دے دیا کہ وہ بے روک ٹوک تمام قوموں اور تمام ملکوں میں توحید کی دعوت پہنچا سکیں۔ مگر عین اسی وقت مسلم رہنماؤں نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جنھوں نے تمام مواقع کو برباد کر دیا۔

مثلاً آزادی تحریک، دو قومی تحریک، اینٹی استعمار تحریک، اینٹی رشدی تحریک، نفاذ اسلام تحریک، اور دوسری تقریباً تمام تحریکیں نفرت اور تشدد کی فضا پیدا کر کے دعوت کے

مواقع کو برباد کرتی رہیں۔ مزید یہ کہ ان دعوت کش تحریکوں کا سلسلہ بدستور ہر جگہ جاری ہے۔ شاید یہ سب سے بڑا جرم ہے جس کا ارتکاب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کیا ہے۔

۲۰ جون ۱۹۹۲

جب ہم ہاتھی کو دیکھتے ہیں تو ہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھی کا تصور پیشگی طور پر ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ جب کوئی ہاتھی سامنے آتا ہے تو ہم سامنے کے منظر کو اپنے ذہنی تصور سے corelate کرتے ہیں۔ اس طرح ہم جان لیتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہے۔ اگر ہم نے کبھی ہاتھی کو نہ دیکھا ہو اور نہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں موجود ہو تو ہم ہاتھی کو دیکھ کر سمجھ نہ سکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔

یہی معاملہ معنوی حقیقتوں کا بھی ہے۔ کوئی بیان کرنے والا جب ایک معنوی حقیقت کو (مثلاً تعبد اللہ کا نکث تراہ) کے تجربہ کو بیان کرے تو میرے ذہن میں اس کا تصور ہونا چاہئے جس سے corelate کرکے میں اس کو جان سکوں کہ تعبد اللہ کا نک تراہ کیا ہے۔ اگر میرے ذہن میں پہلے سے اس کا خاکہ موجود نہ ہو تو بیان کرنے والا بیان کرے گا اور میں اس کو سمجھنے سے قاصر رہوں گا۔

۲۱ جون ۱۹۹۲

اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا معاملہ اور معاویہ بن ابی سفیان کا معاملہ ایک ہے۔ سعد کو یہ شکایت ہوئی کہ خلافت مہاجرین کے لئے کیوں، انصار کے لئے کیوں نہیں۔ معاویہ کو یہ شکایت ہوئی کہ خلافت بنوہاشم کے لئے کیوں، بنوامیہ کے لئے کیوں نہیں۔ سعد اپنی شکایت کو اپنے سینہ میں لے کر خاموش بیٹھ گئے۔ اس کے برعکس معاویہ نے جنگ کی۔

عبد اللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بھی خلافت کی بیعت ہوئی اور حسن بن علی کے ہاتھ پر بھی خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس کے بعد دونوں کے لئے حالات خلاف ہو گئے۔ عبد اللہ بن زبیر حالات سے لڑ گئے اور حسن بن علی حالات کا اعتراف کرتے ہوئے خلافت سے دستبردار ہو گئے۔

عبد اللہ بن عمر نے بھی یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور حسین بن علی نے بھی یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ یزید اگر صالح ہے تو ہم شکر کریں گے۔ اگر وہ

غیر صالح ہے تو ہم صبر کریں گے۔ مگر حسین بن علی نے یزید کے خلاف خروج کیا اور اس سے لڑ گئے۔

اب محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان میں سے ہر کیس میں ایک کا رویہ اجتہاد صبر پر مبنی تھا اور دوسرے کا اجتہادی خطا پر۔ کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ دونوں کے رویہ کو یکساں طور پر صحیح قرار دیا جائے۔

۲۲ جون ۱۹۹۲

موجودہ مسلمانوں کی اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا عظمت پسندی کا جھوٹا مزاج ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں صرف وہ افراد مقبول ہوتے ہیں جو ہائی پروفائل میں کلام کریں۔ مگر ہائی پروفائل میں بولنے والے لوگ قوموں کو صرف ہلاکت کی خندق میں لے جاتے ہیں۔ سچے رہنما وہ ہیں جو حقیقت پسندی کی زبان میں کلام کریں۔ اور حقیقت پسندی کی زبان ہمیشہ لو پروفائل کی زبان ہوتی ہے۔

۲۳ جون ۱۹۹۲

محمد ضیاء الحق صاحب (اڈیٹر نیشن ویکلی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ندوہ گئے۔ وہاں لوگوں نے زور وشور سے یہ مشورہ دیا کہ "فکر کی غلطی" پڑھئے۔ اس میں وحید الدین خاں کے افکار کو بالکل باطل ثابت کر دیا گیا ہے۔ ان کے اصرار پر ضیاء الحق صاحب نے کتاب کا ایک نسخہ ۴۰ روپے میں خریدا اور پوری کتاب پڑھی۔

"فکر کی غلطی" کے آغاز میں الرسالہ دسمبر ۱۹۸۶ (صفحہ ۲۶) کی یہ عبارت نمایاں طور پر نقل کی گئی ہے اور اس کو نعوذ باللہ میری گمراہی کے یقینی ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

"خدا میرے لئے ایک رسمی عقیدہ نہیں ہے، خدا میری دریافت ہے۔ خدا کو میں نے دیکھا ہے۔ خدا کو میں نے چھوا ہے۔ بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی سی ہے جس پر خدا اترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دئے۔"

ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ مجھے اس پر تعجب نہیں کہ آپ پر یہ واردات گزری۔ مجھے تعجب اس پر ہے کہ "فکر کی غلطی" کے مصنف کو اس واردات کا تجربہ کیوں نہیں گزرا۔ انھوں نے مزید

کہاکہ مجھے یہ پوری کتاب محض بے دلیل باتوں کا مجموعہ نظر آئی۔

۲۴ جون ۱۹۹۲

دارالعلوم دیوبند کے دو صاحبان آئے۔ انھوں نے تقلید ائمہ کی بات کی۔ میں نے کہا کہ تقلید ائمہ نہیں بلکہ تقلید صحابہ۔ انھوں نے کہاکہ صحابہ کا مسلک عام لوگوں کو کیسے معلوم ہوگا۔ میں نے کہاکہ اسی طرح جس طرح ان کو ائمہ کا مسلک معلوم ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے کہاکہ "تقلید صحابہ" تو ایک نیا لفظ ہے۔ یہ ہم نے اب تک نہیں سنا تھا۔ میں نے کہاکہ حدیث میں ہے کہ اسلام بعد کے زمانہ میں غریب (اجنبی) ہو جائے گا۔ یہی مطلب ہے اسلام کے اجنبی ہو جانے کا کہ آپ تقلید ائمہ کے لفظ سے آشنا ہیں مگر آپ تقلید صحابہ کے لفظ سے آشنا نہیں۔

حالاں کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی تقلید ائمہ کا حکم موجود نہیں۔ جب کہ تقلید صحابہ کا حکم صراحۃً موجود ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا کہ فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت پر وہ ہے جس کا ایمان مثل ایمان صحابہ ہو۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے لوگوں کو صحابہ کی اقتدار کرنا ہے۔ اس سے ان کو ہدایت ملے گی۔

۲۵ جون ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہاکہ علماء ظاہر غیر انبیاء کے لئے الہام کی ہر صورت (مثلاً خواب، مکاشفہ، انسپریشن) کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ چیزیں اگر غیر انبیاء کے لئے تسلیم کرلی جائیں تو اس سے وحی کا صرف نبی کے لئے ہونا مشتبہ ہو جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ خلاف واقعہ بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر انبیاء کے لئے اس قسم کے تجربہ کا ممکن ہونا انبیاء کی صداقت کو مزید ثابت کرتا ہے۔ ایک عام آدمی اگر جزئی انداز میں الہام کا تجربہ کرے تو اپنے اس ذاتی تجربہ کی روشنی میں اس کے لئے یہ عقیدہ قابل فہم ہو جائے گا کہ یہی تجربہ نبی کو کلی اور معیاری صورت میں حاصل ہوا۔ اکثر فکری غلطیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ آدمی ایک پہلو کو لیتا ہے اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

۲۶ جون ۱۹۹۲

یورپ کے سفر میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ ماہنامہ الرسالہ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے بارہ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے کہا: " مجھ کو جنت کا ٹکٹ چاہیے"۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ آپ نے پوری بات نہیں کہی۔ آپ الرسالہ پڑھتے ہیں۔ الرسالہ میں ہم یہی تو بتاتے ہیں کہ جنت کا ٹکٹ کیا ہے۔ مگر الرسالہ کے پیغام نے آپ کو زیادہ اپیل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو دراصل جنت کا سستا ٹکٹ چاہئے۔ اور الرسالہ میں جنت کے جس ٹکٹ کی نشاندہی کی جارہی ہے وہ آپ کو مہنگا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ ہاں، بات تو یہی ہے۔

میں نے کہا کہ پھر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ سستا ٹکٹ ہمیشہ جعلی ٹکٹ ہوتا ہے۔ اور جعلی ٹکٹ آدمی کو ہمیشہ جیل خانہ میں لے جاتا ہے، سستا ٹکٹ کسی کو منزل تک نہیں پہنچاتا۔

۲۷ جون ۱۹۹۲

عزیز الحق خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ واپی (گجرات) میں ان کا پلاسٹک کا کارخانہ (Pack Plast India) ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں، محنت۔ پھر انھوں نے کہا کہ کسی بھی کام کو کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگنا ہے۔ اگر آپ کام کے پیچھے لگے رہیں، لگے رہیں تو کامیابی یقینی ہے۔

یہ بات سادہ سی ہے، مگر بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے مقصد میں اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ وہ اس کے پیچھے نہیں لگتے۔

۲۸ جون ۱۹۹۲

حیدرآباد کے ایک صاحب (محمد محمود علی قطبی) نے تصوف پر انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰ صفحہ پر مشتمل ہے اور اس کا نام ہے:

(Fragrance of Sufism)

مصنف کے ایک تعلیم یافتہ دوست نے یہ کتاب مجھے ہدیۃً دی۔ وہ خود بھی تصوف سے

دلچسپی رکھتے ہیں اور تصوف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تصوف کا خلاصہ کیا ہے۔ انھوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ تقرب الی اللہ۔ میں نے کہا کہ تقرب الی اللہ تو نتیجۂ تصوف ہو سکتا ہے۔ نہ کہ خلاصۂ تصوف۔ ایک بزرگ جو آپ کے خیال سے تقرب کے درجہ کو پہنچے ہوں ان کے بارہ میں آپ یہ نہیں کہیں گے کہ ان کو درجۂ تصوف حاصل ہوا، بلکہ یہ کہیں گے کہ ان کو درجۂ تقرب حاصل ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف ایک طریقۂ کار ہے۔ تصوف کا لفظ ایک میتھڈالوجی کو بتاتا ہے نہ کہ رزلٹ کو۔ اس لئے میرے سوال کے جواب میں آپ کو یہ بتانا چاہئے کہ باعتبار میتھڈ اس کا خلاصہ کیا ہے۔ وہ مزید کچھ نہ بتا سکے۔

۲۹ جون ۱۹۹۲

ابوعبیدہ بن جراح ؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا کوئی ہم سے بہتر ہے۔ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے ساتھ جہاد کیا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ ایک گروہ جو مجھ پر ایمان لائے گا حالانکہ اس نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ (جامع الاصول فی احادیث الرسول ۹/۲۰۶)

اس سے مراد سادہ طور پر محض کلمہ پڑھنا نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کو اپنے لئے دریافت نو (rediscovery) بنائیں گے۔ جو ان نازک امور کو خود دریافت کریں گے جو صحابہ نے رسول کے بتانے سے جانا۔ مثلاً مکہ میں لڑنے کے بجائے ہجرت کرنا۔ حدیبیہ میں بظاہر پسپائی پر راضی ہو جانا، فتح مکہ کے بعد انتقام نہ لینا۔ حنین کی فتح کے بعد تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دینا۔ خلافت کے مسئلہ میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کا دستبردار ہو جانا۔ وغیرہ۔

حدیث سے ثابت ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلام اجنبی ہو جائے گا۔ جب اسلام اجنبی ہوگا تو یقینی طور پر رسول بھی (اپنے حقیقی معنی میں) اجنبی ہو جائے گا۔ اس لئے بعد کے زمانہ میں رسول پر ایمان درحقیقت از سرِ نو رسول کو دریافت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بُعد زمانی کے باوجود مثل صحابہ ایمان کے حامل ہوں گے۔

۳۰ جون ۱۹۹۲

ایک صاحب سے ان کے کچھ مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے شکایت کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ آدمی نے دوسرے شخص سے ایسی امیدیں قائم کرلیں جو امید اس سے قائم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں بیشتر لوگ اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ اور ہم ان سے اس رویہ کی امید قائم کر لیتے ہیں جو صرف اعلیٰ درجہ کے انسان سے ممکن ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو جان لیں تو آپ کے بہت سے شکوے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یکم جولائی ۱۹۹۲

کیرلا کے کچھ مسلمانوں نے راشٹریہ سوم سیوک سنگھ RSS کے جواب میں اسلامی سیوک سنگھ RSS بنایا ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آئی ایس ایس بنانا مسئلہ کا حل نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آر ایس ایس والے مسلمانوں کو مارتے ہیں تو پھر کیا کیا جائے۔ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ مار کر مریں۔ میں نے کہا کہ یہ مار کر مرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ فریق ثانی کو اکسانا ہے کہ اور زیادہ ہمیں مارو۔

میں یہ مانتا ہوں کہ آر ایس ایس والے اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ مثلاً وہ نعرہ لگاتے ہیں کہ جس کو ہونا پاکستان، اس کو بھیجو قبرستان۔ مگر محض اس قسم کی لفظی اشتعال انگیزی کبھی فساد نہیں بن سکتی۔ عملی فساد ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی مزید کارروائی کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کے جلوس پر پتھر پھینکنا۔ اگر مسلمان صرف اتنا کریں کہ وہ اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں تو کبھی بھی عملی فساد کی صورت پیش نہ آئے۔

۲ جولائی ۱۹۹۲

رحمٰن نیر صاحب نے نظام الدین میں ایک مکان بنایا ہے۔ اس کی تعمیر میں ان کو دو سال (۹۲-۱۹۹۱) لگے۔ اس دوران کے کئی قصے انھوں نے بتائے۔ ایک روز انھیں ایک نئے آدمی کو عوض قاضی بھیجنا تھا۔ وہاں سے بلڈنگ میٹریل کا کوئی سامان لے آنا تھا۔ آدمی

نیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ حوض قاضی کہاں ہے۔

اب ایک شکل یہ تھی کہ رحمٰن نیر صاحب مذکورہ آدمی کو بس یا اسکوٹر پر بٹھا دیتے اور کسی سے کہتے کہ انھیں حوض قاضی پر اتار دینا۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ حوض قاضی کہاں ہے۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ دہلی میں کہیں ہے۔ تم باہر نکلو اور ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچو۔

سواری پر بٹھانے میں مطلوبہ سامان تو آ جاتا مگر آدمی کی شخصیت کی تعمیر نہ ہوتی۔ جب آدمی باہر نکلا اور لوگوں سے پوچھ کر اور ڈھونڈ کر وہاں پہنچا تو اس کا ذہن بیدار ہوا۔ اس نے ایک نئی چیز دریافت کی۔ اس کو یہ حوصلہ ملا کہ وہ حالات میں کود کر اپنا کام کر سکتا ہے۔ پہلی صورت میں صرف حصول سامان کا فائدہ تھا اور دوسری صورت میں اس کے ساتھ احیاء شخصیت کا فائدہ۔

۳ جولائی ۱۹۹۲

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۷ جون ۱۹۹۲) میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی نظریہ کو قرآن کی اس آیت سے نکالا ہے: وربك فكبر (المدثر) اس کا مطلب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کو بڑا بنا، اللہ کی بڑائی کو نافذ کر۔ یعنی سیاسی انقلاب برپا کر کے اللہ کی بڑائی کو زمین پر قائم اور نافذ کرو۔

یہ تفسیر اشتعال انگیز حد تک غلط ہے۔ اللہ کی بڑائی کوئی ہمارے قائم کرنے کی چیز نہیں۔ وہ ازل سے ابد تک خود اپنے زور پر قائم ہے۔ انسان اللہ کی قائم شدہ بڑائی کا اعتراف کرتا ہے نہ کہ وہ اس کی غیر قائم شدہ بڑائی کو قائم کرتا ہے۔

مذکورہ آیت میں تکبیر رب کا محل حقیقۃً کوئی زمینی جغرافیہ نہیں بلکہ ایک انسان کی اپنی شخصیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی کا اعتراف کر، تمھاری زبان اس کی بڑائی کا کلمہ بولے، تمھارا دل اس کی بڑائی کے آگے جھک جائے۔ اس کا یہی مطلب تمام مفسرین نے بیان کیا ہے۔ تفسیر مظہری کے الفاظ میں: صفة باوصاف الكمال مالا يتصف به غيره (اللہ کو ان اعلیٰ کمالات کے ساتھ متصف کرو جیسے اوصاف کمال سے اس کے سوا کوئی اور متصف نہیں)

۴ جولائی ۱۹۹۲

ندوہ (لکھنؤ) سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام البعث الاسلامی ہے۔ اس کے ٹائٹل پر یہ جملہ لکھا رہتا ہے: شعارنا التوحید، الی الاسلام من جدید۔ اسی طرح بنارس کے ایک بڑے مسلم ادارہ سے ایک عربی ماہنامہ صوت الامۃ کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے ٹائٹل پر ہمیشہ یہ فقرہ درج کیا جاتا ہے ـــــ دعوتنا: عودۃ بالامۃ الی الکتاب والسنۃ۔

ہر مسلم جریدہ، ہر مسلم جماعت اور ہر مسلم ادارہ اسی طرح اسلام کی طرف واپسی کا نعرہ دے رہا ہے۔ ہر ایک کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس نے لاکھوں مسلمانوں کو متاثر کیا ہے۔ حتی کہ ان کی مجموعی تعداد ایک کروڑ سے کم نہیں۔ مگر اس کے باوجود اب تک امت میں نہ تو اسلام زندہ ہوا۔ اور نہ امت کو سربلندی حاصل ہوئی۔ کوششوں کا اس طرح بے نتیجہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ امت اس وقت حبط اعمال کے قانون کی زد میں ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بے حد سنگین بات ہوگی۔

۵ جولائی ۱۹۹۲

ادب میں ایک صنعت ہے جس کو صنعت معری عن النقط یا صنعت غیر منقوط کہتے ہیں۔ یعنی بے نقطہ والے الفاظ میں لکھنا۔ ابوالقاسم الحریری کی مقامات الحریری کی کچھ عبارتیں اس صنعت میں ہیں۔ اسی طرح اردو شعراء میں میر انیس اور میر دبیر وغیرہ نے غیر منقوط الفاظ میں اشعار کہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور کتاب فیضی کی عربی تفسیر سواطع الالہام ہے۔ یہ پوری کتاب غیر منقوط الفاظ میں ہے۔ مگر اس کی عبارتوں میں اتنا زیادہ اغلاق اور ابہام ہے کہ اکثر اوقات اس کو پڑھ کر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً یہود اور بنی اسرائیل اور اہل کتاب، سب میں منقوط الفاظ ہیں۔ اس لئے ان تینوں کو چھوڑ کر ان کو اہل ہود لکھا ہے۔ حالانکہ حضرت ہود سے بنی اسرائیل کا کوئی تعلق نہیں۔

اس غیر ضروری تکلف کی وجہ سے سواطع الالہام ایک مبہم کتاب بن گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غیر منقوط تفسیر کی ایک منقوط شرح لکھنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۶ جولائی ۱۹۹۲

بجلی سے چلنے والی ایک بھاری مشین کو چلتے دیکھ کر عجیب دہشت انگیز تاثر ہوا۔ میں نے کہا: یہ بھی لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ میں شامل ہے۔ صنعتی انقلاب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کیسی عجیب طاقتیں انسان کو دے دی ہیں۔ وہ طاقت جو ایک شہر کو لے کر سمندر میں تیرتی ہے۔ جو ایک پوری آبادی کو لیکر لوہے کی پٹری پر دوڑتی ہے۔ جو ایک پورے مکان کو لے کر ہوا میں اڑتی ہے۔

۷ جولائی ۱۹۹۲

پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر عبد الستار پچھلے چھ سال سے ہندستان میں پاکستان کے سفارتی نمائندہ تھے۔ اب وہ اپنے ملک واپس جارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ۶ جولائی کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں دہلی کے کچھ ہندو صاحبان کی طرف سے ایک فیرویل تقریب ہوئی۔ پانیر (۷ جولائی) کی رپورٹ کے مطابق، مسٹر عبد الستار نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ باوجود ان مسائل کے جن کا سامنا ایک ڈپلومیٹ کو پڑوسی ملک میں کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر جب کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوں، یہ اس کا فرض ہے کہ باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے تخلیقی انداز اختیار کرے:

> despite the problems a diplomat faces in a neighbouring country especially when relations are sour, it is incumbent on him to adopt a creative approach to improve bi-lateral relations. (p. 3)

پچھلے چھ سال کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسٹر عبد الستار کا تخلیقی انداز دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں کچھ بھی کار آمد نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دو طرفہ بنیاد پر تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر اس طرح کے نزاعات کبھی دو طرفہ بنیاد پر حل نہیں ہوتے۔ ایسے حالات میں تخلیقی انداز یہ ہے کہ حالات سے اوپر اٹھ کر سوچا جائے اور یک طرفہ بنیاد پر نزاع کو ختم کر دیا جائے۔

۸ جولائی ۱۹۹۲

موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں ایک چیز مشاہدہ میں آئی۔ اس کو دیکھ کر خیال ہوا کہ

موجودہ زمانہ میں کام کے بہت سے نئے مواقع پیدا ہوئے۔ ان مواقع کے ذریعہ دین کا کام مزید اضافہ کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس معاملہ میں مجرمانہ حد تک غفلت کا ثبوت دیا ہے۔

نئے اقتصادی مواقع اس لئے تھے کہ دین کے شعبوں کو مزید مالی تقویت پہنچائی جائے۔ مگر مسلمانوں نے نئے اقتصادی مواقع کو صرف اپنی معاشی حیثیت کو بلند کرنے کے لئے استعمال کیا۔ جدید میڈیا اس لئے تھا کہ اشاعت دین کی مہم کو تیز تر کیا جائے۔ مگر جدید میڈیا کو انھوں نے ذاتی ناموری کے لئے استعمال کیا۔ قوت کے نئے ذرائع اس لئے تھے کہ اسلام کو مزید مستحکم کیا جائے مگر انھوں نے قوت کے نئے ذرائع کو صرف اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا۔

۹ جولائی ۱۹۹۲

فتح الباری (شرح صحیح البخاری) پڑھتے ہوئے وہ حدیث سامنے آئی جس میں اشراط الساعۃ کا ذکر ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ غالباً ان مظاہر کا بیان ہے جو صنعتی دور میں پیش آنے والے تھے۔ مثلاً اس کا ایک جزء بخاری کی روایت میں یہ ہے کہ اذا ولدت الامۃ ربتھا۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: اذا رأیتَ المرأۃ تلدُ ربّھا (فتح الباری ۱/۱۴۹)

یہی بات دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ: بَرَّ صدیقہ وجفا اباہ۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے دور میں بیٹے اپنے والدین کے فرماں بردار نہ رہیں گے۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قدیم زرعی دور میں معاشیات کا انحصار زیادہ تر زمین پر ہوتا تھا۔ زمین آخر عمر تک باپ کی ہوتی تھی اور صرف اس کے مرنے کے بعد بیٹے کو ملتی تھی۔ اس بنا پر بیٹا اپنے آپ کو باپ پر منحصر سمجھتا تھا۔ یہ احساس اس کو اپنے باپ کا وفادار بنائے رکھتا تھا۔ موجودہ صنعتی دور میں بے شمار قسم کے نئے ذرائع معاش پیدا ہوگئے۔ اب ہر نوجوان کو نظر آنے لگا کہ اس کی معاشیات کا انحصار باپ کی زمین پر نہیں۔ وہ کہیں بھی اپنے لئے کمائی کے اسباب پا سکتا ہے۔ اس احساس نے بیٹے کے اندر باپ کے لئے وفاداری اور فرماں برداری کا مزاج ختم کر دیا۔

۱۰ جولائی ۱۹۹۲

ایک صاحب سے میں نے ایک بات کہی۔ میرا انداز کسی قدر سخت تھا۔ وہ غصہ ہو گئے اور غصہ ہو کر چلے گئے۔ چند روز کے بعد میں ان سے ملا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میں نے کچھ کہا تھا تو اس کے جواب میں آپ بھی کچھ کہہ دیتے۔ کہنے کا جواب کہنا ہے، اس کا جواب غصہ نہیں۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به (النحل ۱۲۶)

۱۱ جولائی ۱۹۹۲

ہمدرد نگر (نئی دہلی) کی مسجد میں تبلیغی جماعت کا ایک اجتماع تھا۔ ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ بتایا گیا کہ یہ سعودی عرب میں ڈاکٹر ہیں۔ چالیس دن کے لئے نکلے ہیں اور آذر بائیجان جا رہے ہیں۔ ان کو ساڑھے چھ ہزار ریال تنخواہ ملتی ہے۔ انھوں نے بلا تنخواہ رخصت لے کر یہ چلہ دیا ہے۔

انھوں نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر پر بول رہے تھے۔ حاضرین میں بمشکل پچاس آدمی ہوں گے۔ ایک نیا آدمی تھا۔ وہ مجمع سے تقریباً ایک ہزار میٹر کے فاصلہ پر تھا۔ مقرر نے اس سے کہا کہ قریب آجائیے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مقرر نے کئی بار قریب آنے کے لئے کہا تو وہ بولا کہ آپ کی آواز آرہی ہے۔ اس پر مقرر صاحب بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا: کیا میں لاؤڈ اسپیکر ہٹا دوں۔ اس کے بعد وہ آدمی مزید کچھ نہیں بولا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ پیسہ کی قربانی دینا آسان ہے مگر نفس کی قربانی دینا مشکل۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۲

سوامی رام تیرتھ (۱۹۰۶-۱۸۷۳) اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو گرو تھے۔ وہ غالباً ۱۹۰۳ میں امریکہ گئے۔ ہفت روزہ آرگنائزر (۱۲ جولائی ۱۹۹۲) کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ وہاں ایک امریکی ڈاکٹر نے انھیں کھانے پر بلایا۔ یہ امریکی ڈاکٹر خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے باہر ایک پلے کارڈ پر یہ جملہ لکھ کر رکھ دیا کہ گاڈ از نو وھیر۔ رام تیرتھ جب اس کے دروازہ پر پہنچے اور مذکورہ پلے کارڈ دیکھا تو انھوں نے خاموشی سے ڈبلیو کو مٹایا اور اس کو معمولی

فرق کے ساتھ دائیں کے بجائے بائیں لکھ دیا۔ اب وہ عبارت گاڈ از نو وھیر کے بجائے گاڈ از ناؤ ہیر بن گئی۔ یعنی حسب ذیل طریقہ پر :

God is no where
God is now here

کھانے کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو ایک ناستک ہوں اور میں نے اپنا عقیدہ لکھ کر باہر لگا بھی دیا ہے۔ پھر آپ نے میرے یہاں کھانا کیوں قبول کیا۔ رام تیرتھ نے ڈاکٹر سے کہا کہ میرے ساتھ آئیے۔ پھر وہ ڈاکٹر کو لے کر باہر گئے اور پہلے کارڈ پر لکھا ہوا نیا جملہ دکھایا۔ ڈاکٹر پر اس بات کا بے حد اثر ہوا اور وہ رام تیرتھ کا عاشق (Mr. Oyamada) بن گیا۔

اس غیر معمولی ذہانت کے باوجود رام تیرتھ کا انجام یہ ہوا کہ ابھی وہ ۳۳ سال کے ہوئے تھے کہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ کو دریائے گنگا میں ڈوب کر مر گئے۔

۱۳ جولائی ۱۹۹۲

۱۲ - ۱۳ جولائی کو میں ہمدرد نگر میں تھا۔ وہاں میری چند تقریریں ہوئیں۔ ایک مجلس میں ہمدرد نگر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے۔ میں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہندستان میں پچھلے سو سال کے درمیان بہت سے مصلحین اٹھے۔ انھوں نے ملت کے اندر حرکت اور بیداری پیدا کرنا چاہا۔ مثلاً مولانا محمود حسن صاحب، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ۔ مگر کوئی بھی ملت کے اندر عمومی حرکت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ تبلیغی جماعت نے ستر سال پہلے ملت کو اٹھانے کا کام شروع کیا۔ اور آج ہر ایک اعتراف کرتا ہے کہ اس نے ملت کے اندر عمومی حرکت پیدا کر دی۔ میں نے کہا کہ اس ظاہرہ میں ہمارے لئے کئی سبق ہیں۔ اس کے بعد میں نے چند سبق کے پہلو بیان کئے۔

میری گفتگو ختم ہوئی تو ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ مجھے آپ سے سخت اختلاف ہے۔ تبلیغی جماعت کو اگر پھیلاؤ حاصل ہوا تو یہ اس کی صداقت کا ثبوت کیسے ہو سکتا ہے۔ سینٹ پال کی تحریک کو حضرت مسیح کی تحریک سے بھی زیادہ پھیلاؤ ملا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سینٹ پال کی تحریک زیادہ صحیح تھی۔

میں نے کہا کہ میں نے پھیلاؤ کو سچائی کا کرائیٹیرین نہیں بنایا ہے۔ میں نے اس کو صرف بطور واقعہ ذکر کیا ہے اور اس سے کچھ سبق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے میری بات کو صحیح رخ سے نہیں لیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں یحرفون الکلم عن مواضعہ (النساء، ۴۶) کہا گیا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۹۲

ابوالبقا صاحب، بمبئی (فون نمبر 4090230) چمڑے کا ایک آئٹم جاپان اکسپورٹ کرتے ہیں۔ ۱۹۷۹ میں وہ ٹوکیو گئے۔ ان کی پارٹی اوبوشی کمپنی لیمٹڈ (Aoboshi Company) نے ٹوکیو کے ایک ہوٹل ڈائچی گنزا (Dichi Ginza) میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ کمپنی کے نمائندہ اویاماڈ Mr. Oyamade شام کو ان سے کہہ گئے کہ کل صبح سات بجکر ۴۵ منٹ پر ہم یہاں آئیں گے اور آپ کو اپنے کارخانہ میں لے جائیں گے۔ آپ وقت پر ہوٹل کے گیٹ پر آجائیں۔

ابوالبقا صاحب نے ہندستانی مزاج کے مطابق یہ کیا کہ اطمینان سے ٹہلتے ہوئے ہوٹل کے گیٹ پر پہنچے تو سات بجکر پچاس منٹ کا وقت ہو چکا تھا۔ یعنی پانچ منٹ زیادہ۔ وہاں گیٹ پر مسٹر اویاماڈا گاڑی لئے ہوئے کھڑے تھے۔ انھوں نے ابوالبقا صاحب سے کہا کہ آج تو ہم نے آپ کا لحاظ کیا۔ لیکن کل کے دن اگر آپ لیٹ ہوئے تو ہم ایک منٹ بھی انتظار نہیں کریں گے۔ سات بج کر ۴۵ منٹ پر گاڑی آپ کو لئے بغیر واپس چلی جائے گی۔

۱۵ جولائی ۱۹۹۲

آج میں لودی گارڈن گیا۔ یہ ٹہلنے کے لئے اچھی جگہ ہے۔ اکثر اونچے طبقے کے لوگ یہاں چہل قدمی کے لئے آتے ہیں۔ ایک خوش پوش آدمی کو دیکھا۔ وہ اپنے بچہ کے ساتھ آیا تھا۔ بچہ کی عمر تقریباً ۸ سال ہوگی۔ بچہ نہایت تندرست تھا اور طرح طرح کے کھیل کود کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا باپ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہونے والے بے شمار ہیں۔ مگر بیٹے کے خالق کو سوچ کر اس کا شکر کرنے والا کوئی نہیں۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۲

مولانا عبداللہ طارق سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ شریعت میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کرنے والا صحیح اجتہاد بھی کرتا ہے اور غلط اجتہاد بھی (المجتہد یخطئ و یصیب) اگر آدمی کی نیت میں اخلاص ہو تو صحیح اجتہاد پر دو ثواب ہے اور غلط اجتہاد پر ایک ثواب۔

میں نے کہا کہ اگر اس تقسیم کو نفسیاتی اعتبار سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک اجتہاد وہ ہے جو متاثر ذہن کے تحت کیا جائے اور دوسرا اجتہاد وہ ہے جو غیر متاثر ذہن کے تحت کیا جائے۔ اجتہاد میں غلطی اس وقت ہوتی ہے جب کہ محدود معلومات یا متاثر ذہن کے تحت اجتہاد کیا گیا ہو۔ صحیح اجتہاد کے قابل آدمی اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ مکمل معلومات رکھتا ہو۔ اور غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ کر رائے قائم کر سکے۔

۱۷ جولائی ۱۹۹۲

ایک صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تبلیغی جماعت مبنی بر مسجد (Masjid-based) تحریک ہے۔ اس کے مقابلہ میں جماعتِ اسلامی ایک مبنی بر پارلیمنٹ (Parliament-based) تحریک ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ تبلیغ کو فوراً ہی اپنا میدان کار مل جاتا ہے۔ کیوں کہ صرف ہندستان میں اس وقت تین لاکھ مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں آڈینس (audience) بھی موجود ہے۔ جب کہ جماعت اسلامی کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ اس کا میدان عمل ابھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کے نزدیک اصل میدان عمل، پارلیمنٹ ہے۔ اور پارلیمنٹ ابھی تک دوسروں کے قبضہ میں ہے۔

اس فرق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ تبلیغ میں مثبت ذہن بنتا ہے اور جماعت اسلامی میں احتجاجی ذہن۔ تبلیغی جماعت کا آدمی "پائے ہوئے" ذہن کے ساتھ جیتا ہے اور جماعت اسلامی کا آدمی "کھوئے ہوئے" ذہن کے تحت۔ تبلیغی آدمی کے لئے ساری دنیا کے لوگ اپنے نظر آتے ہیں اور جماعتی آدمی کو ساری دنیا کے لوگ رقیب اور غیر دکھائی دیتے ہیں۔

۱۸ جولائی ۱۹۹۲

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من استوی یوماہ فھو

مغبون (جس آدمی کے دو دن یکساں گزریں وہ دھوکا کھایا ہوا آدمی ہے)

یہ وہی بات ہے جس کے لئے قرآن میں ازدیاد ایمان کا لفظ آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایمان آدمی کی شخصیت کو جگاکر اس کو ایک ترقی پذیر شخصیت بنا دیتا ہے۔ وہ جمود کی حالت سے نکل کر ارتقاء کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مومن کو ہر دن کوئی نئی چیز ملتی ہے۔ اس کا ہر اگلا دن پچھلے دن کے مقابلہ میں اضافہ شدہ دن ہوتا ہے۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۲

ایک جاپانی صحافی نے جاپانی قوم کے بارہ میں کہا کہ جاپانی قوم کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ جاپان کا ایک ایک فرد انتہائی محب وطن ہوتا ہے۔ اگر قوم کا ایک ڈالر کا نقصان ہو رہا ہو تو ایک جاپانی قوم کو اس نقصان سے بچانے کے لئے اپنا سو ڈالر کا نقصان کروالینے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھے گا۔ (نوائے وقت ۱۲ جولائی ۱۹۹۲)

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہی احساس مومن کے اندر حق اور ناحق کے بارہ میں ہوتا ہے۔ مومن اپنی ذات کو مجروح کر لیتا ہے مگر حق کو مجروح کرنا اس سے گوارا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص سے غلطی ہو جائے مگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے تو گویا اس نے اپنی ذات کو بچانے کے لئے حق کو مجروح کر دیا۔ کسی محبوب شخصیت پر تنقید کی جائے مگر وہ اس طرح کی تنقید کو برداشت نہ کرے تو گویا اس نے حق کا مجروح ہونا گوارا کیا۔ مگر اس نے اپنی پسندیدہ شخصیت کا مجروح ہونا گوارا نہیں کیا۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۲

افغانستان میں ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت ختم ہوئی اور افغانی مجاہدین کی حکومت قائم ہوئی تو ساری دنیا کے مسلم پریس نے اس کو افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے ہم معنی قرار دیا۔ لاہور کے روزنامہ وفاق (۱۲ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ، ۱۶ مئی ۱۹۹۲) کے صفحہ اول کی جلی سرخی یہ تھی: افغانستان میں نظام اسلام عملی طور پر نافذ کر دیا گیا۔

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ (۲۴ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ، ۲۵ جون ۱۹۹۲) میں دکتور عبداللہ بن عمر النصیف، امین عام، رابطۃ العالم الاسلامی کا ایک بیان چھپا ہے۔ اس میں افغانستان

میں نظام شیوعی کے سقوط اور افغانی مجاہدین کی حکومت کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ دنیا آج زمین کے اوپر ایک جدید اسلامی ریاست کے قیام کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اس خصوصی بیان کا عنوان ہے: العالم يشهد اليوم قيام دولة اسلامية حديثة على الارض.

میرے نزدیک یہ سراسر خوش فہمی ہے۔ افغانستان میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ایک روس نواز حکومت کا خاتمہ ہے نہ کہ اسلامی حکومت کا قیام۔ حکومت اسلامی کا قیام ایک علیحدہ امر ہے۔ حکومت اسلامی صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ اس کے حق میں ضروری اسباب پیدا کئے گئے ہوں۔ مگر یہ ضروری حالات نہ افغانستان میں پیدا کئے گئے نہ پاکستان میں نہ مصر میں نہ الجیریا میں اور نہ کسی اور ملک میں۔ اسلامی نعرہ تو ضرور ہر جگہ سنائی دیتا ہے مگر اسلامی حالات کے لئے سنجیدہ کوشش کہیں بھی نہیں کی گئی۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۲

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲ محرم ۱۴۱۳ھ، یکم جولائی ۱۹۹۲ء) میں سنغال کے وزیر الاعلام والاتصالات مختار کیبی کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس انٹرویو کو اس کے نمائندہ خالد سعید باحکم نے مدینہ میں ریکارڈ کیا۔ اس کا عنوان ہے: الصحوة الاسلامية هي مستقبلنا.

ایک سوال کے جواب میں موصوف نے کہا کہ صحوہ اسلامیہ ملت اسلامی کا مستقبل ہے۔ آج یہ صحوہ پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ (الصحوة الاسلامية هي مستقبل الامة الاسلامية، وان هذه الصحوة تعم العالم كله۔)

صحوہ اسلامیہ سے مراد خاص طور پر موجودہ مسلم نوجوانوں کی وہ سرگرمیاں جو آجکل تقریباً ہر اس ملک میں نظر آتی ہیں جہاں مسلمان آباد ہیں۔

یہ مسلم نوجوان زیادہ تر اس احساس کے تحت اٹھے ہیں کہ دوسری قوموں نے یا ان کے آلۂ کار کے طور پر خود اپنی قوم کے کچھ لوگوں نے ان کی عظمت اور ان کے مقام کو ان سے چھین رکھا ہے۔ یہ عظمت و مقام اُن کو دوبارہ اِن غاصبین سے واپس لینا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر یہ مسلم نوجوان ساری دنیا میں مفروضہ دشمنان اسلام سے مسلح یا غیر مسلح لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کو ایک تشدد پسندیا

جنگجو مذہب سمجھا جانے لگا۔ اسلام سراسر رحمت کا دین ہے۔ مگر موجودہ قسم کی صحوہ نے اسلام کو عداوت کا مذہب بنا دیا ہے۔ اس قسم کی صحوۃ اسلام کے مستقبل کی تعمیر میں رکاوٹ ہے نہ کہ اس میں مددگار اور معاون۔

۲۲ جولائی ۱۹۹۲

قرآن کی ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دئے اور انھوں نے رسول کو نکالنے کی جسارت کی اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ میں پہل کی (الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدؤكم اول مرة) التوبہ ۱۳

اس آیت کے بارہ میں میں نے تمام تفسیریں پڑھیں۔ برسوں تک غور کیا۔ آخر میں جو سمجھ میں آیا اس کو یہاں لکھتا ہوں۔ اگرچہ حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔

اس آیت میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اس طرح کی چیزوں کے ذکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان کو ترتیب دیا جائے۔ یہاں تاریخی ترتیب کو چھوڑ کر تینوں باتوں کو موضوع کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ نکثوا ایمانهم میں معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کا ذکر ہے جو ۸ھ میں پیش آیا۔ هموا باخراج الرسول میں جبری طور پر ترک وطن کا ذکر ہے جو ہجرت کے پہلے سال واقع ہوا۔ وهم بدؤكم اول مرة سے غزوۂ بدر اولیٰ مراد ہے جو ۲ھ میں پیش آیا۔

۲۳ جولائی ۱۹۹۲

جامعہ ہمدرد (نئی دہلی) کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا ہے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۲ کو ان کے یہاں ایک ٹاک (talk) ہے۔ اس کا موضوع ہے ——— قرآنی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق:

Rights of minorities in a Quranic state.

اس موضوع پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس طرح کے معاملات میں شریعت کا

کوئی حتمی قانون نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق حالات پر ہے۔ اسلامی شریعت میں ایک مستقل قانونی اصول وہ ہے جس کو عُرف کہا جاتا ہے۔ عُرف کا تعلق صرف شخصی امور سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق وسیع تر قومی اور بین اقوامی امور سے بھی ہے۔

اس قسم کے معاملات میں رہنما اصول یہ ہے کہ دفعات شریعت کے بجائے مقاصد شریعت کو دیکھا جائے۔ جس طرح اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح غیر مسلم ریاست میں مسلم اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اس طرح یہ مسئلہ دو طرفہ ہے۔ ایسی حالت میں احسن طریقہ یہ ہے کہ اقلیتوں کے معاملہ میں دونوں جگہ انٹرنیشنل عرف پر عمل کیا جائے۔

عرف custom کا تعلق ان امور سے ہے جن کا تعلق ایک سے زیادہ اشخاص سے ہو۔ اجتماعی معاملات میں عرف چوں کہ عمومی طور پر چیز ہوتی ہے، اس لئے معاملہ کا ہر فریق اس کو بآسانی مان لیتا ہے۔ مثلاً جزیہ موجودہ زمانہ میں ایک غیر معروف قاعدہ ہے۔ اور ٹیکس معروف قاعدہ۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں کسی اسلامی حکومت میں غیر مسلم اقلیت پر ٹیکس عائد کیا جائے گا نہ کہ جزیہ۔

۲۴ جولائی ۱۹۹۲

قرآن میں اہل شرک سے قتال کرنے کا حکم ہے۔ (التوبہ ۵) اور اہل کتاب کے بارہ میں حکم ہے کہ ان کو صاغر بنا کر ان سے جزیہ وصول کرو۔ (التوبہ ۲۹) جمہور اہل علم نے پہلے حکم کو دور رسالت کے مشرکین عرب کے لئے خاص کیا ہے۔ مگر جزیہ کے حکم کو عام قرار دیا ہے اور نہ صرف اہل کتاب بلکہ دوسری قوموں تک اس کو وسیع کیا ہے۔

میرے خیال سے اس تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جزیہ کے حکم کا تعلق بھی اصلاً عرب کے اہل کتاب سے تھا جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دعوت پہنچی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے کہ پیغمبر براہ راست مخاطبین اگر آخر وقت تک انکار کریں تو وہ عذاب کے مستحق قرار پا جاتے ہیں۔ چنانچہ اہل شرک پر یہ عذاب صحابہ کی تلواروں کے ذریعہ آیا۔ (التوبہ ۱۴) اس وقت کے اہل کتاب کے لئے قتال کے بجائے جزیہ کا حکم دیا گیا۔ جزیہ کا بطور سزا ہونا اس سے ثابت ہے کہ آیت میں حکم جزیہ کے بعد یہ لفظ ہے کہ وھم صاغرون (التوبہ ۲۹)

۲۵ جولائی ۱۹۹۲

جناب محمد حسین کھتری سے ملاقات ہوئی۔ وہ بیسمنٹ میں کیمکل استرکاری chemical grouting کا کام کرتے ہیں۔ وہ بمبئی میں پیری روڈ پر رہتے ہیں۔ وہاں قریب میں کوئی مسجد نہ تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے طے کیا کہ یہاں ایک نئی مسجد بنائیں۔ قریب میں ایک پارسی اپنا مکان بیچ رہا تھا۔ اس سے یہ بات ہوئی۔ وہ ۶۰ لاکھ روپیہ میں سودا کرنے پر راضی ہوا۔

اب محمد حسین کھتری اور ان کے ساتھی چندہ کے لئے نکلے۔ دوڑ دھوپ کے بعد ۱۸ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ اس کے بعد ایک شخص ان کو یوسف پٹیل کے پاس لے گیا۔ وہ پہلے اسمگلر تھے، اب بلڈنگ کنسٹرکشن کا کام کرتے ہیں۔ یوسف پٹیل نے پورے ۶۰ لاکھ روپے اپنے پاس سے دے دئے۔ اور کہا کہ آپ زمین خرید لیں اور جو رقم آپ نے جمع کی ہے اس کو مسجد کی تعمیر میں لگائیں۔

یوسف پٹیل جیسے مسلمان ہندستان میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ہندستان کے مسلمان اگر چاہیں تو وہ ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ پیسہ والے مسلمان صرف مسجد اور مدرسہ جیسے روایتی کاموں میں پیسہ دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص دعوتی منصوبہ میں مالی تعاون کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۲

اسلامی فقہ کا ایک کلیہ ہے کہ چیزوں میں اصل ان کا مباح ہونا ہے (الاصل فی الاشیاء الاباحۃ)۔ اس سے اسلامی شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت کا مقصد انسان کو قوانین میں جکڑنا نہیں ہے بلکہ کچھ بنیادی حقوق مقرر کرکے بقیہ امور میں اس کو آزادی دے دینا ہے۔ قوانین کی کثرت قوانین سے انحراف کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ یہ انحراف یا تو سرکشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا منافقت کی صورت میں۔ اس لئے اسلام نے قوانین کی قلت کا اصول اختیار کیا ہے جو بہر حال اول الذکر کے مقابلہ میں اہون ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۲

قاہرہ کے ایک عرب نوجوان اعلیٰ حسنی احمد ملاقات کے لئے آئے۔ وہ اخوانی مزاج کے تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ الاخوان المسلمون کی یہ غلطی تھی کہ وہ اول روز سے سیاست میں داخل ہو گئے۔ انھیں سب سے پہلے علم اور فکر کے میدان میں کام کرنا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی علیحدگی ممکن نہیں۔ اخوانیوں نے مصر میں تعلیمی ادارے بھی قائم کئے۔ مگر حکمرانوں نے ان تعلیمی اداروں کو چلنے نہیں دیا۔

میں نے کہا کہ آپ یہ سوچئے کہ اسی مصر میں جمال عبد الناصر اور انور سادات سے پہلے بھی تعلیمی ادارے قائم تھے اور حکمرانوں نے کبھی ان پر روک نہیں لگائی۔ حالانکہ آپ حضرات کے بیان کے مطابق وہ حکمراں بھی غیر اسلامی حکمراں تھے۔ نیز خود جمال عبد الناصر اور انور سادات کے زمانہ میں دوسرے علما اسی مصر میں تعلیمی ادارے چلاتے رہے اور حکومت نے ان کے ادارے بند نہیں کئے۔

میں نے کہا کہ تعرف الاشیاء باضدادہا کے مطابق اس فرق پر غور کیجئے تو اصل بات سمجھ میں آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ اخوانی اپنے نظریہ کے مطابق اول دن سے حکمرانوں کے حریف بن گئے۔ اپنے تعلیمی اداروں کو بھی انھوں نے اپنی مخالفانہ سیاست کا مرکز بنا دیا۔ اس بنا پر حکمراں بھی ان کے مخالف بن گئے۔ اگر اخوانی مخالفانہ سیاست سے بے تعلق خالص تعلیم اور فکری تربیت کے لئے ادارے چلاتے تو کبھی حکومت ان سے تعرض نہ کرتی۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۲

عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں ابوموسیٰ اشعری نے انھیں لکھا کہ آپ جو خطوط بھیجتے ہیں ان پر تاریخ نہیں ہوتی۔ اس لئے دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں صحابہ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔

اس زمانہ میں عرب میں قمری مہینوں کا رواج تھا۔ مگر ان کے یہاں عیسوی سن کی طرح کوئی مقرر سن نہ تھا۔ اس لئے طے ہوا کہ کسی واقعہ سے سن کا تعین کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ مولد النبی سے سن کا آغاز کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ معراج النبی سے سن شمار کیا جائے۔ وغیرہ۔

حضرت عمر نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے، ہجرت سے اسلامی سن کا آغاز فرمایا۔

اس واقعہ سے اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام ایسا مزاج بناتا ہے جس میں شخصیت (personality) کے بجائے واقعہ event کو اہمیت حاصل ہو۔ جس میں اصل اہمیت حقائق کو دی جائے نہ کہ کسی اور چیز کو۔

۲۹ جولائی ۱۹۹۲

مسٹر ستیہ پال ایڈوکیٹ (دہلی) نے بتایا کہ پچھلے سال سڑک کے حادثہ میں ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد ان کا آپریشن ہوا۔ آپریشن تھیٹر سے جب دوبارہ وہ اپنے روم میں آئے اور انھیں ہوش آیا تو فوراً انھوں نے نرس سے کہا کہ میرا آپریشن نہیں ہوا۔ آپریشن کب ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کا آپریشن ہو چکا۔ آپ ۲۶ گھنٹہ بے ہوشی کی حالت میں رہے۔

اس طرح کا واقعہ اسپتالوں میں ہر روز ہوتا ہے۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۲

مانو پریوار (آصف علی روڈ) کی میٹنگ میں شریک ہوا۔ وہاں مسٹر ستیہ پال ایڈوکیٹ نے خاموشی silence پر ایک تقریر کی۔ مجھ سے بھی اظہار خیال کے لئے کہا گیا۔ میں نے کہا کہ خاموشی کا ایک پہلو خالص فلسفیانہ ہے۔ مگر فلسفیانہ پہلو سے قطع نظر میں اس کے عملی پہلو سے متعلق چند بات عرض کروں گا۔

میں نے کہا کہ خاموشی بظاہر ایک سادہ سی چیز ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خاموش رہنا انتہائی مشکل کام ہے۔ صرف تین قسم کے لوگ خاموش رہ سکتے ہیں (۱) ایک وہ شخص جس کا علم بہت بڑھ جائے۔ علم کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ جب علم بڑھتا ہے تو وہ صرف آدمی کے احساس بے علمی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح بے علمی کا احساس آدمی کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے (۲) دوسرا وہ شخص جو دوسرے انسانوں کا بہت زیادہ خیرخواہ ہو۔ (۳) تیسرا سب سے بڑا سبب خوف خدا ہے۔ خوف خدا دراصل اللہ تعالیٰ کی موجودگی کے یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جس آدمی کو فی الواقع یہ احساس ہو جائے کہ اس کے پاس ہی رب العالمین موجود ہے اور اس کو دیکھ رہا ہے۔ ایسے آدمی کی زبان بند ہو جائے گی،

اس کے الفاظ گم ہو جائیں گے۔ اس کا بولنے کا جوش سرد پڑ جائے گا۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۲

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بناء وبال علی صاحبہ الا ما لا الا ما لا (ہر عمارت اپنے مالک کے لئے وبال ہے، سوا اس کے جو ضروری ہو، سوا اس کے جو ضروری ہو) مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۳۲

اسلام میں ایک عمارت مطلوب ہے اور ایک عمارت غیر مطلوب۔ مگر مطلوب عمارت اور غیر مطلوب عمارت میں جو فرق ہے وہ چھوٹی عمارت اور بڑی عمارت، یا کچی عمارت اور پکی عمارت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ بلکہ ضروری عمارت اور غیر ضروری عمارت کے اعتبار سے ہے۔ اس دنیا میں ہر وہ چیز جائز ہے جو ضروری ہو۔ اور ہر وہ چیز وبال ہے جو ضروری نہ ہو، اور صرف اسٹیٹس کی خاطر اس کو حاصل کیا جائے۔

یکم اگست ۱۹۹۲

پچھلے دو دن میں دو عرب عالموں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب ریاض کے جامعۃ الامام میں استاد ہیں۔ اور دوسرے صاحب جامعہ ام القریٰ میں۔ دونوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا۔

میں نے کہا کہ زیادہ قابل لحاظ بات موجودہ زبوں حالی نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے کثیر تعداد میں افراد اور جماعتوں نے کوششیں کیں۔ مگر یہ تمام کوششیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ گویا کہ اصل مسئلہ فقدانِ عمل کا نہیں ہے بلکہ فقدانِ نتیجۂ عمل کا ہے۔

۲ اگست ۱۹۹۲

ایک صاحب سے جبر وقدر کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ قرآن میں ایک طرف شدت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ خدا قادر مطلق ہے۔ اسی کو ہر قسم کا کلی اختیار حاصل ہے۔ دوسری طرف اسی قرآن میں انسان کو اس کے عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اب اگر خدا قادر مطلق ہے تو انسان سے اس کے عمل کا حساب کیوں۔ اور اگر انسان اپنے عمل کے لئے مسئول ہے تو خدا کی قدرت

کاملہ کہاں باقی رہی۔

میں نے کہا کہ ایک ہے امر واقعہ، اور دوسری چیز ہے عملی صورت حال۔ امر واقعہ تو یہی ہے کہ یہاں سارا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وقتی صورت حال یہ ہے کہ محدود مدت کے لئے انسان کو ذاتی اختیار بھی دے دیا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ الہیاتی مسئلہ اور تخلیقی منصوبہ کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو یہ سوال بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ بہ اعتبار حقیقت یہ صحیح ہے کہ خدا قادر مطلق ہے مگر خود خدا ہی نے اپنے تخلیقی منصوبہ کے تحت انسان کو آزادی دے دی ہے۔ یہ آزادی محدود مدت کے لئے برائے امتحان ہے۔ مزید یہ کہ اس وقتی مدت کے دوران بھی خدا نے اپنی قدرت کاملہ کو معطل نہیں کیا ہے وہ اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لئے تاریخ میں مداخلت بھی کرتا رہتا ہے۔ مثلاً جبر کا نظام خدا کے تخلیقی منصوبہ کی نفی ہے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں اس نے رومی اور ساسانی ایمپائر کو توڑ دیا۔ اسی طرح بیسویں صدی کے آخر میں سوویت ایمپائر کو توڑ دیا گیا۔ جبر وقدر کی بحث جو صدہا سال سے جاری ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ باحثین نے امر واقعہ اور صورت واقعہ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

۳ اگست ۱۹۹۲

اجتماعی معاملات میں کوئی رویہ اختیار کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے خالص اصولی بنیاد پر کوئی رویہ اختیار کرنا۔ دوسرا ہے عوامی رجحان کو دیکھ کر اس کی رعایت سے کوئی رویہ اختیار کرنا۔ اس دوسرے رویہ کو آجکل پاپولسٹ اپروچ populist approach کہا جاتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے جو تحریکیں اٹھائیں وہ زیادہ تر پاپولسٹ اپروچ کا نتیجہ تھیں۔ بظاہر کوئی بھی تحریک خالص اصولی بنیادوں پر اٹھائی جانے والی تحریک نظر نہیں آتی۔

۴ اگست ۱۹۹۲

آجکل میں روزانہ چار اخبار پڑھتا ہوں۔ ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، پایونیر، قومی آواز۔ ٹائمس آف انڈیا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز اپنے ایڈیٹوریل کے اوپر

ایک قول نقل کرتا ہے۔ آج کے اخبار میں جوناتھن سولیفٹ (Jonathan Swift) کا یہ قول تھا کہ ہمارے یہاں ایسے مذاہب بہت ہیں جو نفرت کرنا سکھاتے ہیں۔ مگر ایسے مذہب زیادہ نہیں جو ہم کو آپس میں محبت کرنے والا بنائیں:

We have just enough religion to make us hate, but not enough to make us love one another.

اس مقولہ میں اہل مذہب کی بات کو مذہب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ مختلف مذاہب میں اس اعتبار سے تو ضرور فرق ہے کہ کسی میں تحریف ہوئی ہے اور کسی میں تحریف نہیں ہوئی۔ مگر یہ تحریف زیادہ تر مخصوص اعتقادی امور میں ہوئی ہے۔ جہاں تک انسانی محبت کا تعلق ہے، وہ ہر مذہب میں آج بھی موجود ہے۔ کوئی بھی مذہب، خواہ وہ محرف ہو یا غیر محرف، نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر مذہب کا نام لینے والے اپنی پستی کی بنا پر ایسے افعال کرتے ہیں جو لوگوں کے درمیان نفرت کا باعث بن جائیں۔ یہ لوگ چوں کہ اپنا عمل مذہب کے نام پر کرتے ہیں اس لئے ان کی وجہ سے خود مذہب بدنام ہو رہا ہے۔

۵ اگست ۱۹۹۲

مولانا عبداللہ طارق صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عرب علماء اکثر کہتے ہیں کہ الاسلام دین و دولۃ۔ یہ جملہ بالکل غلط ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ نے یا کسی صحابی نے ایسا نہیں کہا۔ وہ ما انا علیہ و اصحابی کے خلاف ہے۔

دین اور حکومت میں عطف و معطوف کا رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل اور شاخ کا رشتہ ہے۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ محبت نام ہے قلبی تعلق اور چائے پلانے کا، تو یہ جملہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ اس میں قلبی تعلق اور چائے پلانے کو یکساں طور پر عطف اور معطوف کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ حالانکہ محبت میں قلبی تعلق اصل ہے، اور چائے پلانا اس اصل کی محض ایک جزئی شاخ۔

اسی طرح اسلام میں دین اصل ہے۔ اور حکومت محض اس کا ایک جزء ہے۔ جس طرح اس کے اور بہت سے اجزاء ہیں۔ درخت کی اصل اس کا بیج ہوتا ہے اور تنہ اور ڈالی اور پتی اور پھول اور پھل، سب اس کے اضافی اجزاء ہیں۔ اسی طرح اسلام میں دین کی حیثیت بیج کی

ہے اور حکومت سمیت دوسری تمام چیزیں اس کے اضافی اجزاء۔

۶ اگست ۱۹۹۲

عرصہ سے میرا ذوق یہ کہتا تھا کہ "اسلامی مرکز" بنا کر کام کرنا درست ہے۔ مگر اسلامی جماعت" بنا کر کام کرنا درست نہیں۔ آج اچانک ذہن میں یہ بات آئی جنت میں اسلامی مرکز ہوگا، مگر وہاں اسلامی جماعت نہیں ہوگی۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اسلامی مرکز کا لفظ مرکز عمل کو بتاتا ہے، اور اسلامی جماعت کا لفظ گروہ بندی کو۔ میرا ذوق شاید اسی لئے اول الذکر کو پسند کر رہا تھا اور ثانی الذکر کو ناپسند۔

۷ اگست ۱۹۹۲

ڈاکٹر جان (Dr. Vallampurl John) مدراس کے ایک عیسائی ہیں۔ وہ اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلام سے متعلق ان کے کچھ سوالات تھے۔ ان سوالات کی وضاحت کے لئے وہ میرے پاس آئے۔

ان کا ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں حج کو بہت بڑی عبادت بتایا گیا ہے۔ مگر حج میں تو اپنے ملک سے سفر کر کے عرب جانا ہوتا ہے۔ اس لئے حج کی عبادت وہی شخص کر سکتا ہے جو پیسہ والا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام صرف امیروں کے لئے ہے۔

میں نے کہا کہ اگر حج کے زمانہ میں مکہ جائیں تو آپ اچنبھے کے ساتھ دیکھیں گے کہ وہاں زیادہ تر حاجی وہ ہیں جو غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق پیسہ سے نہیں ہے بلکہ ارادہ (will power) سے ہے۔ اگر ارادہ کی طاقت موجود ہو تو آدمی جو چاہتا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح بہر حال کر ڈالتا ہے۔ اس کا مشاہدہ آپ خود اپنے تجربہ میں روزانہ کر سکتے ہیں۔

۸ اگست ۱۹۹۲

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ جہاد بالسیف منسوخ ہو گیا۔ میں نے جواب دیا کہ میں ایسا نہیں کہتا اور نہ مجھے ایسا کہنے کا کوئی حق ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں جس سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں جہاد بالسیف غیر ضروری ہو گیا ہے، کیونکہ زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی روک ٹوک کے بغیر خدا کے دین کی تبلیغ

واشاعت کی جاسکے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ فقہائے اسلام متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ قتال حسن لذاتہٖ نہیں ہے وہ حسن لغیرہ ہے۔ اور جب قتال حسن لغیرہ ہے تو وہ مطلق طور پر ہر حال میں کیسے مطلوب ہو سکتا ہے۔

۹ اگست ۱۹۹۲

کچھ لوگوں کے کہنے پر آج میں نے ہندستانی ٹی وی پر کوئٹ انڈیا کی ڈاکومنٹری دیکھی۔ اس میں ہندستان کی جنگ آزادی کو تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ مگر اس میں اول سے آخر تک سب کے سب ہندو اشخاص کے نام تھے۔ جدوجہد آزادی کے تمام کارنامے ہندوؤں کے حوالے سے دکھائے جارہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جدوجہد آزادی کے زمانہ میں اس ملک میں نہ تو مسلمانوں کا کوئی وجود تھا اور نہ انھوں نے اس میں کوئی قابل ذکر حصہ ادا کیا۔ حالانکہ مسلمان اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے کہ سرفروشی اور قیادت کے تمام کارنامے مسلم شخصیتوں ہی نے انجام دئے۔

عام مسلمان اس واقعہ کو ہندو تعصب کے خانہ میں ڈال کر احتجاج کرے گا۔ مگر میں نے سوچا کہ یہ حبط اعمال کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے "جہاد آزادی" کے سلسلہ میں مسلمانوں کے تمام اعمال کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا، گویا کہ یہ سرے سے مطلوب ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ ٹی وی کو دیکھ کر اگر مسلمان احتجاج بلند کریں تو یہ غفلت پر سرکشی کا اضافہ ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ دل سے اقرار کریں کہ کرنے کا اصل کام دعوت تھا۔ ہم نے بالکل غلط طور پر اپنی طاقتوں کو نام نہاد سیاسی آزادی کی راہ میں ضائع کیا۔

۱۰ اگست ۱۹۹۲

۹ اگست ۱۹۴۲ کو مہاتما گاندھی نے کوئٹ انڈیا کی کال دی تھی۔ چنانچہ کل ۹ اگست کو ہندستانی سیاستدانوں اور لیڈروں کی طرف سے دھوم کے ساتھ کوئٹ انڈیا کی تقریبات منائی گئیں۔ اسی طرح ۱۵ اگست وغیرہ کو بھی ہر سال دھوم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس پر ہندستان ٹائمس (۱۰ اگست) کے ایڈیٹر مسٹر اپیج کے دوا نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے:

انھوں نے لکھا ہے کہ پچاس سالہ آزادی کے باوجود ہم ملک میں کسی بھی قسم کی کوئی ترقی نہ لاسکے۔ البتہ ماضی کے دنوں کی یاد مناکر فرضی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں، تاریخ ان لوگوں کی پناہ گاہ ہے جو خود کچھ زیادہ نہ کرسکے ہوں جس کی وہ تقریب منائیں:

History is often the refuge of those who have not done much themselves to celebrate.

عین یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہے۔ ان کے خواص ماضی کے کارناموں پر کتابیں لکھ رہے ہیں اور ان کے عوام ماضی کے کارناموں کی تقریب منارہے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں نے اپنے "شاندار ماضی" کو اپنے لئے ایک ذہنی پناہ گاہ بنالیا ہے جس میں چھپ کر وہ اپنے بربادحال کو بھلاسکیں۔

۱۱ اگست ۱۹۹۲

وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہاراؤ کا پیغام ملا تھا کہ بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ پر وہ مجھ سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ آج صبح ساڑھے نو بجے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد سے کئی مسئلے وابستہ ہوگئے ہیں۔ اس لئے اس کے حل کا وہی درست طریقہ ہوسکتا ہے جس میں ہر پہلو کی رعایت شامل ہو۔ یہ طریقہ حکم کا اصول ہے۔ یعنی مورخین کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ اس کے متعلق دونوں فریق پیشگی طور پر راضی ہوجائیں کہ اس کا جو بھی فیصلہ ہوگا اس کو وہ مزید بحث کے بغیر مان لیں گے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک میرا اندازہ ہے، مسلمان اس قسم کے بورڈ کے فیصلہ کو ماننے پر راضی ہوجائیں گے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ اس بات کی باضابطہ ضمانت ہو کہ اس طرح کسی اور مسجد کا چیپٹر نہیں کھولا جائے گا۔ بس اسی پر فل اسٹاپ ہوجائے گا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ اس کی ضمانت تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ نے یہ قانون بنادیا ہے کہ ۱۹۴۷ میں جو عبادت خانہ جس حالت میں رہا ہو بس اسی حالت میں اس کو باقی رکھا جائے، اس میں کسی کو کسی نوعیت کی تبدیلی کا اختیار نہ ہو۔

۱۲ اگست ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اجتہاد کا مزاج کھو دیا ہے۔ وہ صرف تقلید کے اوپر قائم ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان عام طور پر تنقید کو برداشت نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ تنقید اور اختلاف رائے سے ذہنی ترقی ہوتی ہے۔ اور جہاں تنقید اور اختلاف کا ماحول ختم ہو جائے وہاں صرف ذہنی جمود باقی رہ جائے گا اور آج مسلمان پوری طرح ذہنی جمود کا شکار ہو چکے ہیں۔

۱۳ اگست ۱۹۹۲

تازہ الرسالہ کے صفحہ اول کا مضمون ہے: صحیح رخ سے دیکھنے والے کو دنیا امیدوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے، اور غلط رخ سے دیکھنے والے کو ناامیدیوں سے۔

شفیع الدین صاحب نے ٹیلیفون پر کہا کہ یہ باتیں آپ اپنے ذہن سے کہتے ہیں یا قرآن سے۔ میں نے کہا کہ یہ عین قرآنی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذکورہ جملہ کسی قرآنی آیت کا ترجمہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باعتبار مفہوم وہ قرآن سے ماخوذ ہے۔ اور یہ کہ قرآن کے مطابق مایوسی کفر ہے (یوسف ۸۷) پھر جب مایوسی کفر ہے تو اس کے بعد امید کے سوا اور کیا چیز باقی رہتی ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (۱۴ اگست ۱۹۹۲) میں مشہور ہندو دانشور گری لال جین کا مضمون اجودھیا اشو پر چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ چار اسباب ایسے ہیں جنھوں نے ہندستانی مسلمانوں (ان کے لفظوں میں انڈین اسلام) کی حیثیت کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ انڈین اسلام کو ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ میں ایک اور اساسی تبدیلی کو برداشت کرنا پڑا جب کہ مسلمانوں کی بہادرانہ عظمت کے افسانہ کو میدان جنگ میں دفن کر دیا گیا:

> Indian Islam underwent another radical change in 1965 and 1971 when the myth of superior Muslim valour was laid to rest on the battlefield. (p. 8)

اسلام کی شاندار تاریخ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔

ان کے اسلاف کی بہادری کی غیر معمولی کہانیاں ان کو یہ فائدہ دے رہی تھیں کہ ماضی کے مسلمانوں کی وجہ سے لوگ حال کے مسلمانوں سے بھی خائف تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اپنے ناپختہ اقدامات کے ذریعہ ظاہر کیا کہ وہ اسلاف کی ان خصوصیات سے خالی ہیں۔ اس طرح ان کے اقدامات ان کے لئے الٹا نتیجہ برآمد کرنے والے ثابت ہوئے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۲

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (دہلی) میں ہر سال ۱۵ اگست کو اجتماع ہوتا ہے۔ آج بھی وہاں ایک اجتماع تھا۔ ان کی دعوت پر میں نے اس میں شرکت کی۔ یہاں سب کے سب آر ایس ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لوگ تھے۔ لال کرشن آڈوانی، جارج فرنانڈیز اور ڈاکٹر مہیش چوپڑا کی تقریریں ہوئیں۔

لال کرشن آڈوانی نے واضح طور پر اعتراف کیا ہندوؤں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی موجودہ مقبولیت مثبت وجوہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ منفی وجوہ کی بنا پر ہے۔ یعنی ہندوازم سے لگاؤ کی بنا پر ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ اینٹی ہندو تحریکوں کے رد عمل میں ایسا ہوا ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۹۲

ندوہ کے کچھ اساتذہ سے بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایمان ویقین کا لفظ استعمال کیا۔ میں نے کہا کہ میں ایمان کی تشریح کے لئے یقین کے لفظ کو ناقص سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ ایمان کی اصل اکتشاف ہے اور اکتشاف کا تصور یقین میں براہ راست طور پر نہیں آتا۔ اس لئے ایمان کی تشریح کے لئے صحیح لفظ معرفت ہے۔ اور یہی لفظ قرآن وحدیث میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً المائدہ ۸۳، اور مسلم کی وہ روایت جس میں من قال لا الٰہ إلّا اللّٰہ کے بجائے من عرف ان لا الٰہ الّا اللّٰہ کا لفظ آیا ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۹۲

آج میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) کے ایک سمینار میں شریک ہوا۔ اس میں زیادہ تر تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ اندازہ ہے کہ ہندوؤں کے درمیان اتنے زیادہ اختلافات ہیں کہ مسلمان اگر کچھ نہ کریں، صرف خاموش ہو جائیں، تب بھی اس ملک سے ہندو مسلم مسئلہ ختم ہو جائے۔

۱۸ اگست ۱۹۹۲

پاکستان کے فارن سکریٹری مسٹر شہریار خاں کی قیادت میں پاکستان کا ایک سرکاری وفد نئی دہلی آیا ہے تاکہ کشمیر کے مسئلہ پر بات کرے۔ وفد نے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کا ایک خط وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ کو دیا۔ اس میں پاکستانی وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ہندستان اور پاکستان کو شملہ معاہدہ کی روشنی میں کشمیر کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ اسی بات کو آج کے اخبارات نے اپنی سرخی بنایا ہے۔ پانیر (۱۸ اگست) کی سرخی یہ ہے:

Sharif for dialogue on Kashmir under Shimla Agreement

نواز شریف اسلامی جمہوری اتحاد کے لیڈر ہیں اور دو سال پہلے الکشن میں اس کی کامیابی کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم بنے ہیں۔ اس الکشن میں اسلامی جمہوری اتحاد کا نعرہ تھا: لینا ہے اب کشمیر، ٹوٹے شملہ کی زنجیر۔ مگر اب امریکہ نے یہ کہہ دیا کہ کشمیر کے معاملہ میں اقوام متحدہ کی تجویزیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ اب دونوں ملکوں کو شملہ معاہدہ کے تحت اس مسئلہ کو حل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد پاکستان کی زبان بدل گئی۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے یہی بات پہلے کہی ہوتی تو وہ اصول کی بات ہوتی۔ مگر اب وہ مصلحت کی بات ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۹۲

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو ایک اردو اخبار کے اڈیٹر ہیں، ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندو مسلم فساد کا سب سے بڑا سبب اردو اور ہندی کے اخبارات ہیں۔ ہندستان کے بڑے بڑے انگریزی اخبارات عام طور پر واقعات کی آبجکٹو رپورٹنگ کرتے ہیں لیکن انگریزی اخبارات کو پڑھنے والے تو بہت کم ہیں۔ زیادہ تر ایسا ہے کہ مسلمان اردو اخبار پڑھتے ہیں اور ہندو ہندی اخبار۔ اور اردو ہندی دونوں اخبارات کی رپورٹنگ ناقص ہوتی ہے۔

اردو اخبار یہ کرتے ہیں کہ فرقہ وارانہ مسائل میں ہندو زیادتی کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کرتے ہیں۔ اور مسلمان کی زیادتی کو حذف کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہندی اخبارات مسلمانوں کی زیادتی کو خوب بڑھا کر لکھتے ہیں اور ہندو زیادتی کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہی فرقوں میں غیر متوازن فکر بنتا ہے جو بار بار باہمی جھگڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

مذکورہ مسلمان اڈیٹر نے کہا کہ آپ انگریزی اخبار سے مرعوب ہیں۔ آپ فلاں تاریخ کا ٹائمس آف انڈیا دیکھئے۔ اس میں فلاں فساد کی بابت لکھا ہے کہ ایک فرقہ کا ایک آدمی مارا گیا۔ حالانکہ اس میں چار مسلمان شہید ہوئے تھے۔

میں نے کہا کہ میں نے انگریزی اخباروں کی رپورٹنگ کو نسبتاً آبجکٹو کہا ہے نہ کہ پرفکٹ رپورٹنگ۔ آپ استثنا کو عموم کے برابر قرار دے رہے ہیں۔ انگریزی اخباروں میں اس قسم کی بات کبھی کبھی استثنائی طور پر ہوتی ہے، جبکہ اردو اور ہندی اخباروں میں یہی عمومی طور پر ہوتا ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۲

۱۵ اگست ۱۹۹۲ کو وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی تقریر لاکھوں لوگوں نے لال قلعہ کے میدان میں یا ٹی وی اور ریڈیو پر سنی۔ مجھے اس تقریر میں ان کی یہ بات بہت پسند آئی کہ "ہمارے باہمی نزاعات نے ملک کی ترقی کو روک رکھا ہے۔ اس لئے ہمیں ان نزاعات کے سلسلہ میں تین سال کے لئے مورے ٹوریم (moratorium) کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے"۔

آج ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی تو وہ نرسمہا راؤ کی مذکورہ تقریر کی مذمت کرنے لگے انھوں نے کہا کہ نرسمہا راؤ اپنے کو سیکولر بتاتے ہیں حالاں کہ ان میں اور فرقہ پرست ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں۔ اب دیکھئے کہ نرسمہا راؤ نے اپنی پندرہ اگست کی تقریر میں قومی اقتصادیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "سوریہ مہاراج بھی ہمارے اوپر مہربان ہیں۔ ہم اس سے بڑے پیمانہ پر سولر انرجی حاصل کر سکتے ہیں"۔

ہر بات کے کچھ روشن پہلو ہوتے ہیں اور کچھ تاریک پہلو۔ عقل مند وہ ہے جو روشن پہلو کو لے اور تاریک پہلو کو نظر انداز کر دے۔ مگر مسلمانوں کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ ہمیشہ تاریک پہلو کو لیتے ہیں اور روشن پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں، موجودہ مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۹۲

ایک ہفتہ پہلے اترپردیش کے ایک مسلم نوجوان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا

کہ اب مسلمان تنگ آمد بجنگ آمد پر اتر آیا ہے۔ اب مسلمان اسلحہ بنا رہے ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ ہندوؤں کو ایسا سبق سکھائیں کہ وہ پھر ان کے خلاف ہمت نہ کر سکیں۔ میں نے ان کے جوش کو دیکھ کر ان سے کوئی بحث نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

مسلمانوں کی اس نادانی کا نتیجہ بہت جلد سامنے آگیا۔ قومی آواز (۲۰ اگست ۱۹۹۲) میں رامپور کے بارہ میں یہ خبر چھپی ہے کہ ۱۹ اگست کو وہاں کی پولیس نے چھاپہ مار کر ناجائز اسلحہ کی تین فیکٹریاں برآمد کیں۔ کپتان پولیس رجنی کانت مشرا نے قومی آواز کے نمائندہ کو بتایا کہ رام پور میں پچھلے دو ماہ کے دوران چودہ ناجائز اسلحہ کی فیکٹریاں پکڑی گئی ہیں۔ اور ان سے بہت بڑی تعداد میں ناجائز اسلحہ برآمد کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں جو لوگ گرفتار کئے گئے ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ملزم فرید نے پوچھ گچھ کے بعد اقبال کیا کہ گزشتہ دنوں وہ ۸۰۰ ریوالور کلکتہ، آسنسول، سیوان، چھپرہ وغیرہ میں فروخت کر کے لوٹا ہے۔ ان سے پوچھ گچھ کے دوران اور بھی کئی انکشافات کئے۔ اس خبر کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کی ہر تدبیر مسئلہ کو صرف بڑھائے گی، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم کرنے والی نہیں۔

۲۲ اگست ۱۹۹۲

علماء اور فقہاء کا اجماع ہے کہ قائم شدہ مسلم حکمراں کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔ موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ اپنے سیاسی اقدامات کے جواز کے لئے کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں اجماع کا دعویٰ غلط ہے۔ اس کا ایک ثبوت، ان کے نزدیک، امام ابوحنیفہ کا واقعہ ہے۔ زید بن علی نے ۱۲۲ھ میں اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج کیا۔ انھوں نے عراق کے اموی حاکم یوسف بن عمر ثقفی کے خلاف جنگ کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر امام ابوحنیفہ نے زید بن علی کی مالی مدد کی تھی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے خلاف زید بن علی کے خروج میں امام ابوحنیفہ نے خود ان کی مالی مدد کی۔ (تفہیم القرآن ۵/۸۰) مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن علی بن حسین نے جب ہشام بن عبد الملک کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو امام ابوحنیفہ نے دس ہزار درہم ان کی خدمت میں بھیجے اور حاضری سے معذرت

کی (الفیصل اگست ۱۹۹۲، صفحہ ۳)

مگر صرف مالی مدد کو اس معاملہ میں دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ حضرت حسین نے جب یزید کے خلاف خروج کیا تو فرزدق نے واضح طور پر اس کی مخالفت کی۔ (البدایۃ والنہایۃ ۸/۱۶۶) مگر اسی کے ساتھ فرزدق نے حضرت حسین کی مدد کے لئے چار سو دینار روانہ کئے۔ (جلا العیون ۲۴)

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا مالی تعاون ہمیشہ انسانی بنیاد (humanitarian ground) پر ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع نظریاتی اتفاق کی بنیاد پر۔

۲۳ اگست ۱۹۹۲

مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۸۵۶) ایک اچھے عالم تھے۔ تاہم ان کی نعتوں کی وجہ سے انھیں بہت شہرت ملی۔ ان کا ایک نعتیہ شعر ہے:

سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبی   سب سے بالا و والا ہمارا نبی

دیوبندی مکتب فکر کے لوگ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے خلاف ہیں۔ تاہم یہ شعر موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلمانوں کے ذہن کی نمائندگی کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کا ہر مسلمان اپنے پیغمبر کے بارہ میں کسی نہ کسی طرح اسی قسم کے الفاظ بول رہا ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، اسلام میں اصل کسوٹی ما انا علیہ واصحابی ہے۔ یعنی رسول اور اصحاب رسول نے جو طریقہ اختیار کیا ہو بس وہی اسلامی طریقہ ہے۔ اس کے سوا جو ہے وہ سب کا سب قابل رد ہے۔ سیرت اور حدیث کی کتابوں سے ثابت ہے کہ رسول یا اصحاب رسول نے کبھی مذکورہ بالا شعر جیسی زبان استعمال نہیں کی۔ اس لئے اس قسم کا اندازہ یقینی طور پر بدعت ہے خواہ اس کو نظم میں استعمال کیا جائے یا نثر میں۔

۲۴ اگست ۱۹۹۲

پرانا مقولہ ہے کہ الوقتُ سیفٌ یعنی وقت ایک تلوار ہے۔ یہ مقولہ وقت کی اہمیت کو بتاتا ہے۔ وقت آدمی کے حال اور مستقبل کے لئے قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا صحیح استعمال آدمی کو زندگی دیتا ہے۔ اور وقت کا غلط استعمال آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے۔

۲۵ اگست ۱۹۹۲

کشمیر کے کچھ لوگ ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ کشمیر میں پچھلے تین سال سے جو مسلح تحریک چلا رہے ہیں، اس کا کوئی بھی مفید نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تخریبی تحریک کے نتیجہ میں دو میں سے ایک بربادی کشمیر کا مقدر بن چکی ہے۔ کشمیر اگر آزاد نہ ہو تو اس کو انڈیا کے ہاتھوں برباد ہونا ہے۔ اور اگر وہ بالفرض آزادی حاصل کر لے تو اس کے بعد اس کو خود آپس کی لڑائی برباد کر دے گی، جیسا کہ اس وقت افغانستان میں ہو رہا ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۹۲

ماضی بہت جلد لوگوں کے لئے ان کے قومی فخر کا جزء بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کا بے لاگ جائزہ عام طور پر لوگوں کو پسند نہیں آتا۔ مگر ماضی کے بے لاگ جائزہ کی بے حد اہمیت ہے۔ کیوں کہ وہ حال میں دوبارہ اس قسم کی غلطی سے بچاتا ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ وہ لوگ جو تاریخ کو نظر انداز کریں وہ تاریخ کو دہرانے کی غلطی کریں گے:

Those who ignore history are condemned to repeat it.

۲۷ اگست ۱۹۹۲

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ پچھلے آٹھ سال سے اپنے بچوں کے ساتھ انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دونوں ملکوں کو دیکھا ہے۔ ہندستان اور انگلینڈ میں آپ نے کیا خاص فرق پایا۔ انھوں نے کہا کہ انگلینڈ میں زندگی کافی پر سکون ہے، جب کہ ہندستان میں سکون کی زندگی ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ نے دونوں ملکوں کے درمیان جو تقسیم کی، اس میں ہندستان لازماً برا دکھائی دیتا ہے اور انگلینڈ لازماً اچھا نظر آتا ہے۔ لیکن اگر آپ ایک اور اعتبار سے تقسیم کریں تو معلوم ہوگا کہ انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندستان لازماً اچھا ہے۔ وہ تقسیم یہ کہ ہندستان میں چیلنج ہے، جب کہ انگلینڈ میں چیلنج نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ عام آدمی یہ سمجھے گا کہ چیلنج کی زندگی مصیبت ہے اور بے چیلنج زندگی ایک

راحت۔ مگر یہ سوچ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ بے چیلنج حالت میں انسان کے فطری امکانات سوئے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ جب کہ چیلنج والے حالات میں انسان کے فطری امکانات جاگ اٹھتے ہیں۔ اس طرح چیلنج کی صورتحال آدمی کی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۲۸ اگست ۱۹۹۲

پاکستان کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اقبال اور جناح کا دوقومی نظریہ ہی صحیح نظریہ تھا۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ "واقعات" کہہ رہے ہیں وہ حقیقۃً آپ کے لیڈروں کی تقسیم یا دوقومی نظریہ کا "ردعمل" ہے۔ اگر تقسیم کی تحریک یا دوقومی تحریک نہ چلائی جاتی تو وہ واقعات بھی پیش نہ آتے جن کا حوالہ آپ دے رہے ہیں۔

پھر میں نے ان کو لاہور کے اخبار "نوائے وقت" (۲۸ جولائی ۱۹۹۲) کا صفحہ ۱۱ دکھایا۔ اس میں ایک مضمون بھارت کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان ہے: ہمارا دشمن کیا کر رہا ہے۔ اور ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ پاکستان کے اخبار میں مستقل طور پر اس قسم کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ یہ دوقومی نظریہ کا نتیجہ ہے۔ دوقومی نظریہ کا ایک عظیم نقصان یہ ہے کہ وہ پیشگی طور پر کسی گروہ کو "دشمن" سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ پیشگی مفروضہ کے طور پر کسی کو دوست یا دشمن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۹ اگست ۱۹۹۲

پاکستانی اخبارات میں ایسے مضامین چھپتے رہتے ہیں جن میں فرقہ واریت کو برا کہا جاتا ہے۔ مثلاً نوائے وقت یکم اگست ۱۹۹۲ میں ایک مضمون کا عنوان ہے کہ: فرقہ وارانہ کشیدگی، زہر قاتل۔ اخبار وفاق (۳۰ اگست ۱۹۹۲) میں بتایا گیا ہے کہ وزیر اعظم نواز شریف نے اعلان کیا ہے کہ فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور عنقریب اس مقصد کے لئے قومی اسمبلی میں بل پیش کر دیا جائے گا۔ صفحہ ۳

پاکستان کی تحریک تفریق کے نظریہ پر اٹھائی گئی۔ اس تحریک نے پچاس سال تک مسلمانوں کے اندر تفریق کے احساسات کو جگایا۔ مذکورہ صورت حال اسی کا نتیجہ ہے۔ جو چیز پہلے ہندو مسلم تفریق کی صورت میں تھی، اس نے مسلم مسلم تفریق کی صورت اختیار کر لی۔

۳۰ اگست ۱۹۹۲

ایک صاحب کو میں نے اسلامی مرکز کے دفتر میں ناظم کے طور پر رکھا۔ ان کو ہر طرح کی عزت اور آسودگی دی۔ مگر دو سال بعد وہ ایک بہت بڑا دھوکا دے کر یہاں سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر پریشان رہنے لگے۔ ایک عرصہ کے بعد ان کے ایک دوست انھیں لیکر آئے اور کہا کہ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کو دوبارہ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک معافی کا تعلق ہے تو ان کی غلطی سے پہلے ہی میں ان کو معاف کر چکا ہوں۔ کیوں کہ اللہ سے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ آخرت میں کسی کے خلاف میرا کوئی مقدمہ نہیں۔ اور جہاں تک دوبارہ کام دینے کا تعلق ہے تو مذکورہ واقعہ کے بعد اب میں دوبارہ ان کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

۳۱ اگست ۱۹۹۲

خلیفہ ثانی عمر فاروق ؓ کے زمانہ تک غلامی کا رواج ختم نہ ہو سکا تھا۔ تاہم انھوں نے اہل عرب کی حد تک اس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ اول کے زمانہ میں مرتدین سے جنگ ہوئی۔ اس سلسلہ میں مرتد قبائل کے کچھ لوگ لونڈی غلام بنائے گئے جو سب کے سب عرب تھے۔ حضرت عمر نے ان سب کو آزاد کر دیا کہ کوئی شخص کسی عربی کو غلام نہ بنائے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ حکم نقل کیا گیا ہے کہ کسی عربی کو غلام نہیں بنایا جا سکتا (لا یُسْتَرَقُّ عَرَبِیٌّ)

امام احمد بن حنبل نے اس کو نسلی امتیاز کے ہم معنی قرار دیا اور اس سے سخت اختلاف کیا۔ ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ میں عمر کی اس رائے کو قبول نہیں کرتا کہ اہل عرب غلام نہیں ہو سکتے۔ (لا اذھب الی قول عمر لیس علی عربی ملک)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور اول میں تنقید اور اظہار رائے کی کتنی زیادہ آزادی تھی۔

یکم ستمبر ۱۹۹۲

سنت کی تین قسمیں ہیں: قول، فعل اور تقریر۔ علماء اصول کا کہنا ہے کہ فعل رسول سے اس فعل کا صرف مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً حدیث

میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو کھایا اور اس کو پسند کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کدو کھانا مسلمانوں پر واجب یا فرض ہے۔ اس فعل سے صرف کدو کھانے کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔

امام الشاطبی (م ۷۹۰ ھ) نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل صرف اجازت کی دلیل ہے۔ جب تک کہ کوئی قول یا قرینۂ حال یا کوئی اور چیز اس کے خلاف پر دلالت نہ کرے۔ یعنی جب تک اس کے خلاف قول یا قرینہ کی کوئی دلیل نہ پائی جائے (فالفعل منہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دلیل علی مطلق الاذن فیہ مالم یدل دلیل علی غیرہ من قول اوقرینۃ حال او غیرھما) الموافقات فی اصول الاحکام، للشاطبی، الجزالرابع، صفحہ ۳۲)

اس اصول کا انطباق ہر معاملہ میں ہوگا۔ مثلاً اگر روایت سے معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکومت قائم کی تو صرف اس فعل سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ حکومت قائم کرنا مسلمانوں پر فرض ہے، جب تک اس مفہوم کی حدیث موجود نہ ہو کہ "اے مسلمانو تم لوگ حکومت قائم کرو"۔

۲ ستمبر ۱۹۹۲

نوائے وقت (۲۰ اگست ۱۹۹۲) میں ڈاکٹر اے آر خالد کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے "عہد حاضر میں نظام خلافت" اس مضمون کا ایک حصہ یہ ہے: "قائداعظم اور علامہ اقبال سیاست میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ۱۹۲۷ کی تجاویز دہلی کی قائداعظم حمایت کرتے ہیں، علامہ اقبال مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے حق سے دستبردار نہ ہوں۔ ۱۹۲۸ میں سائمن کمیشن کی قائداعظم مخالفت کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اقبال سر شفیع کے ہمراہ اس سے تعاون کرتے ہیں۔ نہرو رپورٹ کو قائداعظم چند ترمیمات کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہیں اور اقبال اسے یکسر مسترد کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ مگر دو مخالف زاویہ ہائے نظر رکھنے کے باوجود کسی نے بھی ایک دوسرے کی پگڑی نہیں اچھالی۔ اور پھر ۱۹۳۶ کے آخری ایام آتے ہیں۔ غلام دستگیر رشید "آثار اقبال" میں لکھتے ہیں کہ اقبال نے ایک محفل میں کہا کہ مسٹر جناح کو خدا نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج ہندستان کے کسی

مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے۔ اقبال نے انگریزی میں جواب دیا:

He is incorruptible and unpurchasable

یہ اختلاف کے باوجود اعتراف کی ایک مثال ہے۔

۳ ستمبر ۱۹۹۲

ڈاکٹر جاوید اقبال (فرزند علامہ اقبال) کا ایک انٹرویو نوائے وقت (۲۸ اگست ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک ہے اسلام کے بارہ میں روایتی اپروچ (conventional approach to Islam) اور دوسرا ہے اسلام کے بارہ میں جدید اپروچ (Modernist approach to Islam) روایتی اپروچ کا مطلب ہے قدیم کو ویسا کا ویسا ہی لینا ہے۔ اور جدید اپروچ سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو حالات کے مطابق ڈھال کر اسے اختیار کرنا۔

مگر یہ طرز فکر صحیح نہیں۔ اصل مسئلہ اسلام کو جدید حالات کے مطابق ڈھالنے کا نہیں ہے بلکہ اسلام کو جدید حالات کے مطابق نئی تعبیر (reinterpretation) دینے کا ہے۔ یہ انطباق کا مسئلہ ہے نہ کہ تبدیلی کا مسئلہ۔

۴ ستمبر ۱۹۹۲

قرآن میں ہے بنی آدم کو ہم نے اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی (بنی اسرائیل، ۷۰) اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے بہت لمبی بحثیں کی ہیں۔ خاص اختلاف اس پر ہے کہ کیا انسان کو ملائکہ پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مسلک پیش کئے گئے ہیں۔ (دیکھو کشاف، ابن کثیر، روح المعانی، وغیرہ)

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کے سلسلہ میں اصل قابل توجہ چیز لقائے واقعہ ہے نہ کہ خود واقعہ۔ ہماری توجہ کا رخ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ انسان کس کس مخلوق سے افضل ہے اور کیا وہ ملائکہ سے بھی افضل ہے۔ اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کو بطور انعام دیکھا جائے اور اس پر گہرے شکر کا response دیا جائے۔

۵ ستمبر ۱۹۹۲

فارسی شاعر نے یہ شعر کہا کہ بادشاہ اگر دن کے بارہ میں کہے کہ یہ رات ہے تو دوسروں کو کہنا چاہئے کہ بادشاہ نے صحیح کہا۔ دیکھو یہ چاند، تارے نکلے ہوئے ہیں:

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پرویں

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم کو اس طرح کی تعلیم دی جائے وہ غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو جائے گی۔ وہ آزادی کے بارہ میں سوچ نہیں سکتی۔

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ اس قسم کے اشعار کے باوجود ایران میں شاہ کے خلاف جذبات پیدا ہوئے۔ یہ شاہ مخالف تحریک اتنی بڑھی کہ خود بادشاہی نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

۶ ستمبر ۱۹۹۲

ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص سے نیشنل انٹگریشن کے مسئلہ پر بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے آپ لوگوں کے مقصد سے اتفاق ہے مگر آپ کے طریق کار سے اختلاف ہے۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہندستان میں قومی ایکتا املگیمیشن (amalgamation) کے ذریعہ آسکتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ قومی ایکتا کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ ٹالرنس (tolerance) ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا طریقہ بہت بڑے پیمانہ پر آزمانے کے بعد ناکام ہو چکا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے طاقت کے زور سے اس کو نافذ کرنا چاہا۔ مہاتما گاندھی نے ماس موومنٹ کے ذریعہ اس کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ۴۰ سال کی محنت سے اپنی مشہور کتاب (The Essential unity of all World Religions) لکھی اور اس طرح علم کے زور پر اس کو لانا چاہا، مگر ہر ایک اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

۷ ستمبر ۱۹۹۲

ایک حدیث میں ہے کہ اپنے مال کو اپنی جان سے کم مرتبہ دو اور اپنی جان کو اپنے دین سے کم مرتبہ دو (اجعل مالك دون نفسك ونفسك دون دينك)

سند کے اعتبار سے یہ حدیث زیادہ قوی نہیں۔ تاہم معنی کے اعتبار سے وہ درست ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہی کیفیت پائی جانی چاہئے۔

۸ ستمبر ۱۹۹۲

فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ حکمراں کے اقدامات کو مصلحت عامہ کے تابع ہونا چاہئے۔ ابن نجیم نے لکھا ہے: تصرف الامام منوط بالمصلحۃ (رعیت کے اوپر حاکم کا حکم اور تصرف مصلحت کے ساتھ بندھا ہوا ہے) الاشباہ لابن نجیم ۱/ ۱۵۷)

یہ اصول نہایت درست ہے۔ مگر کوئی اصول یا قانون خواہ کتنا ہی درست ہو اس کے صحیح نفاذ کے لئے صحیح حاکم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر حاکم صحیح نہ ہو تو وہ اس اصول کے حوالے سے ایسے اقدامات کرے گا جس کا اس اصول سے حقیقۃً کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۹ ستمبر ۱۹۹۲

فیملی پلاننگ کا نعرہ ہندستان میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی۔ ہندستان میں اس کے لئے "ہم دو ہمارے دو" کے الفاظ بولے جاتے ہیں، اور پاکستان میں اس کے لئے یہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں: بچے دو ہی اچھے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جن لوگوں نے "پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ" بتایا تھا۔ ان کو اس کے لئے شاندار الفاظ مل گئے تھے۔ اب جو لوگ پاکستان کو اس کے برعکس بنیاد پر چلانا چاہتے ہیں ان کو بھی دوبارہ شاندار الفاظ مل رہے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، اور کیسے عجیب ہیں اس دنیا کے معاملات۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۲

انسان کو خدا نے عقل دی تھی تاکہ وہ ظاہری چیزوں پر غور کرکے باطنی چیزوں کو دریافت کرے۔ انسان نے اپنی عقل کو کامیاب طور پر استعمال کیا۔ اسی استعمال کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو سائنس اور ٹیکنیکل ترقی کہا جاتا ہے۔ فطرت کے مظاہر پر غور کرکے فطرت کی طاقتوں کو دریافت کرنا اسی کا نام سائنس ہے۔ اور یہ کام انسان نے بہت بڑے پیمانہ پر کیا ہے۔

مگر عقل کا اس سے زیادہ بڑا اور اصلی استعمال یہ تھا کہ وہ مخلوقات میں غور کرکے ان کے خالق کو دریافت کرلیتا، وہ آیات کائنات کے ذریعہ حقیقت کائنات کو پالیتا، مگر یہاں انسان اپنی عقل کے استعمال میں ناکام رہا۔

۱۱ستمبر ۱۹۹۲

خلیجی عرب کے چھ وزرائے خارجہ کا دوروزہ اجتماع جدہ میں ہوا۔ اس میں ایک متفقہ رزولیوشن کے ذریعہ جزیرہ ابوموسیٰ پر قبضہ کے خلاف ایران کو سخت انتباہ دیا گیا۔ ابوموسیٰ ۹۰ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ جزیرہ شارجہ کی ملکیت سمجھا جاتا ہے جو ۱۹۷۱ میں متحدہ عرب امارات میں ضم ہو گیا تھا۔ چھ خلیجی ملکوں میں کویت بھی شامل ہے۔ ۱۹۷۱ کے عبوری سمجھوتہ کے تحت جزیرہ ابوموسیٰ عرب امارات کی ملکیت ہے۔

اس قسم کے جھگڑے اکثر ملکوں میں ہیں۔ اگر وہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ہوں تو وہ فوراً جہاد بن جاتا ہے۔ (مثلاً کشمیر، اراکان، اریٹریا وغیرہ) مگر اس قسم کے شدید تر نزاعات خود مسلم ملکوں کے درمیان ہیں۔ مثلاً جزیرہ ابوموسیٰ کے لئے عرب امارات اور ایران کا جھگڑا، کویت کے لئے عراق اور الصباح حکمرانوں کا جھگڑا، وغیرہ۔

۱۲ستمبر ۱۹۹۲

گنیش دتہ گادرے (۷۲ سال) تقریباً دس سال تک مہاتما گاندھی کے ساتھ رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی اپنے آپ کو غریب ہندستان کا نمائندہ کہتے تھے۔ مگر ان کی غریبی کی تصویر کو باقی رکھنے کے لئے کانگرس کو روزانہ دو ہزار روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ (یہ ۶۰ سال پہلے کی بات ہے جب کہ دو ہزار آج کے ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھا) مسٹر گادرے نے بتایا کہ گاندھی جی کی اس غریبی پر امیرانہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مسٹر گادرے کے بیان کے مطابق، سروجنی نائیڈو مذاق کے طور پر کہا کرتی تھیں:

It takes Birla two thousand rupees per day to keep Gandhi poor.

۱۳ستمبر ۱۹۹۲

جواہر لال نہرو سوشلسٹ تھے۔ مہاتما گاندھی بھی سوشلسٹ تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی کہا کرتے تھے کہ میں سوشلسٹوں سے بڑھ کر سوشلسٹ اور کمیونسٹوں سے بڑھ کر کمیونسٹ ہوں۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کے لئے (persuasion) میں یقین کرتے تھے۔ اور نہرو جبر (compulsion) میں۔

مسٹر گا درے نے بتایا کہ مہاتما گاندھی کیونسٹوں کے بارہ میں خوش فہم تھے۔ ایک بار بمبئی میں کیونسٹ نوجوانوں کا کیمپ لگا۔ گاندھی جی نے راج گوپال اچاری کو بھیجا کہ جاکر دیکھیں کہ وہ لوگ کیسے ہیں۔ گاندھی جی ان کو گڈ بوائے (good boy) سمجھتے تھے۔ راجہ جی انھیں دیکھ کر آئے تو انھوں نے ایک جملہ میں ان کے بارہ میں یہ رپورٹ دی:

They are good, but they are boys.

۱۴ ستمبر ۱۹۹۲

جے ایم رابرٹس (J. M. roberts) کی ساڑھے دس سو صفحہ کی کتاب ہے جس کا نام ہے عالم کی تاریخ:

The Pelican History of the world

مصنف نے اس کتاب میں اعتراف کیا ہے کہ اسلام سب سے زیادہ بڑھتا ہوا مذہب (fastest-growing faith) ہے۔ اس کی وجہ اس کے اس الفاظ میں ملتی ہے کہ اسلام معجزات کا مذہب نہیں، بلکہ عمل کا اور عقلی عقیدہ کا مذہب ہے:

Islam is not a religion of miracles, but of practice and intellectual belief. (p. 335)

دوسرے مذاہب (مثلاً مسیحیت) میں معجزات کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ مگر اسلام میں اس قسم کے معجزات نہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوسرے مذاہب دور قدیم کے لئے تھے جب کہ اسلام قیامت تک کے لئے ہے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۲

گنیش دتہ گادرے (۷۲ سال) مہاتما گاندھی سے بہت قریب رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے آخری مرحلہ میں نہرو اور پٹیل کے درمیان اس معاملہ پر سخت اختلاف تھا کہ آزاد ہندستان کا وزیر اعظم کون بنے۔ دونوں یکساں طور پر عہدہ کے مدعی تھے۔

سردار پٹیل کے اندر تنظیم کی صلاحیت تھی۔ جواہر لال نہرو کے اندر خطابت کی۔ ایک بار مہاتما گاندھی کی موجودگی میں سردار پٹیل نے اپنا استحقاق ثابت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے کانگرس کو منظم

کیا ہے۔ میں نے اس کے ایک ایک پرزہ کو جوڑا ہے۔ اس لئے میں وزیر اعظم بننے کا زیادہ حقدار ہوں۔ تم تو صرف جلسوں میں بھاشن دینا جانتے ہو۔ جواہر لال نہرو نے جواب دیا کہ اگر میں اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکر مار دوں تو تمہارے تمام پرزے ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔

دونوں کے درمیان اتنے سخت اختلافات تھے۔ گاندھی نے کہا کہ تم دونوں مل کر کام کرو۔ کیوں کہ تم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہو۔ انھوں نے پٹیل کی مثال باڈی سے دی۔ اور نہرو کو سول بنایا۔ اس کے بعد سارے اختلافات کے باوجود دونوں مل کر آخر وقت تک کام کرتے رہے۔ اگرچہ وزیر اعظم کا عہدہ نہرو کو مل گیا۔ مگر پٹیل نے پھر کبھی اس کی کوشش نہ کی کہ وہ نہرو کو ہٹا کر خود وزیر اعظم کی گدی پر بیٹھ جائیں۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۲

بھائی عارف صاحب نے بتایا کہ مولانا عمر پالن پوری نے ایک بار تقریر میں کہا کہ میں اپنے پاؤں میں کچھ تکلیف کی وجہ سے پہلے یہ کرتا تھا کہ فرض نماز کھڑے ہو کر پڑھتا تھا اور نفل نماز بیٹھ کر ادا کرتا تھا۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ مجھ کو آزمانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ایک دو بار کھڑے ہو کر نوافل ادا کئے تو کسی خاص مشکل کے بغیر کھڑے ہو کر میں نے نوافل پڑھ لیں۔ پھر میں مستقل طور پر کھڑے ہو کر نفل نماز میں پڑھنے لگا۔ یہ قصہ بتانے کے بعد انھوں نے کہا کہ "حالات کے اعتبار سے میں نے اپنے کو معذور سمجھ لیا تھا مگر حقیقت کے اعتبار سے میں معذور نہ تھا"۔

ایسا ہی اکثر انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ حالات سے سطحی تاثر کے تحت اپنے آپ کو معذور سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت واقعہ کی نسبت سے وہ معذور نہیں ہوتے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۲

تبلیغ کے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک بار مولانا الیاس صاحب کی تحریک کے بارہ میں کہا کہ "الیاس نے یاس کو آس میں بدل دیا"۔ مولانا تھانوی نے یہ جملہ کس مفہوم میں کہا تھا، اس کے بارہ میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم میرا اپنا خیال ہے کہ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مولانا الیاس صاحب نے کم سے کم ممکن (minimum possible) سے آغاز کیا۔ اس لئے ان کو عمل کے مواقع مل گئے۔ ہندستان کے

دوسرے علما کا حال یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممکن (maximum possible) سے اپنے عمل کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے بے شمار قربانیوں کے باوجود وہ کچھ حاصل نہ کرسکے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۹۲

موجودہ مسائل ملت پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن میں ہے کہ فلا تخشوھم و اخشونی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جو دور آرہا ہے اس کے بعد تمہارے لئے خشیت کا مسئلہ پیدا ہو تو وہ اللہ کی طرف سے ہوگا نہ کہ انسانوں کی طرف سے۔ اس کی بنیاد پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام مسائل و مشاکل اگرچہ بظاہر انسانوں کی طرف سے ہیں مگر حقیقۃً وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ یہ بأس خداوندی کا ظہور ہے جس پر مسلمانوں کے اندر تضرع پیدا ہونا چاہئے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس کو مخالفین کا ظلم بتایا۔ اس بنا پر ان کے اندر تضرع کے بجائے احتجاج کا مزاج پیدا ہوگیا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۲

مولانا انیس لقمان ندوی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلم مصنفین میں میرے سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف ابن جوزی ہیں۔ ذاتی طور پر میں ان کو ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ وغیرہ سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۲

ایک صاحب نے کہا کہ ابن تیمیہ نے سیبویہ کی ستر غلطیاں نکالی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ نہیں کہئے کہ ابن تیمیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سیبویہ کے یہاں ستر غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ اگر سیبویہ کو جواب دینے کا موقع ملے تو وہ کہے گا کہ ابن تیمیہ نے جن چیزوں کو غلطی کہا ہے وہ سرے سے غلطی ہی نہیں۔

۲۱ ستمبر ۱۹۹۲

مولانا انیس لقمان ندوی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر ایسا ہو کہ حق کی ایک دعوت اٹھے اور اہل باطل اس کو مٹانے کے درپے ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعوت باطل پرستوں کے لئے خطرہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ کوئی دعوت جب اس نوبت کو پہنچ جائے تو

وہ جس طرح پرستاران باطل کے لئے تشویش کا باعث ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح وہ خود خدا کی بھی خصوصی عنایت کا مستحق بن جاتی ہے۔ چنانچہ اہل باطل جتنی طاقت کے ساتھ اس دعوت کو مٹانا چاہتے ہیں اس سے زیادہ طاقت کے ساتھ خدا اس دعوت کی مدد پر آجاتا ہے۔ گویا کہ اب معاملہ انسان اور انسان کے درمیان نہیں رہتا بلکہ وہ انسان اور خدا کے درمیان کا سلسلہ بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی باطل گروہ حق کی دعوت کو مٹانے میں کامیاب ہو جائے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۹۲

مسٹر سراج پراچہ جامع مسجد دہلی کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۰ سال پہلے یہ حال تھا کہ امام بخاری مسلمانوں کے " امام " بنے ہوئے تھے۔ ان کی پرجوش تقریر نے مسلمانوں کے اندر ان کو بہت بڑا مقام دے دیا تھا۔ مگر اب مسلمانوں کے درمیان وہ سخت غیر مقبول ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جامع مسجد کے پاس کچھ لوگوں سے امام صاحب کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے کہا کہ آپ ان کو امام کیوں کہتے ہیں۔ ان کو آپ پیش امام کہئے۔

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ ہندستان میں جذباتی قیادت کا دور تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اب مستقبل قریب میں ان شاء اللہ حقیقت پسندی اور تعمیری مزاج کا دور دورہ ہوگا۔ اس دن کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۲

علم النفس کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسان کا دماغ لامحدود صلاحیتوں کا خزانہ ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں یہ دماغ استعمال ہوئے بغیر ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی ایک لذیذ چیز سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جسمانی طاقت جواب دے چکی ہے۔ وہ بے حساب علم حاصل کرنا چاہتا ہے مگر اس کی طاقت اس میں مانع بن جاتی ہے کہ وہ زیادہ مطالعہ کر سکے۔ وہ کامل آزادی چاہتا ہے مگر دنیا میں دوسرے لوگوں کا وجود اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صرف محدود طور پر استعمال کرے۔ وغیرہ۔

انسان کی لامحدود ذہنی صلاحیت اور اس کی محدود جسمانی قوت میں مطابقت نہیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ایک اور دنیا بننے والی ہے جس میں آدمی کی لامحدود ذہنی صلاحیت اپنا استعمال پاسکے۔ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے پاس انسان کی اس دماغی صلاحیت کی کوئی توجیہہ نہیں۔ جبکہ آخرت کے نظریہ میں اس کی مکمل توجیہہ حاصل ہو رہی ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۲

مولانا عبد اللہ طارق سے میں نے کہا کہ یہودیوں پر ان کی پڑوسی قوموں نے جو یلغار کیا، اس کو قرآن میں تنبیہہ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔ مگر خود یہودی لٹریچر میں اس کو اسرائیل کے دشمنوں کا ظلم بتایا جاتا ہے۔ یہودی اگر ان واقعات کو تنبیہہ خداوندی سمجھتے تو ان کے اندر تضرع اور انابت پیدا ہوتی۔ مگر جب انھوں نے ان واقعات کو دشمنان اسرائیل کا ظالمانہ عمل سمجھا تو ان کے اندر صرف تمرد اور سرکشی پیدا ہوئی۔

یہی معاملہ اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس وقت دوسری قوموں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے حق میں بأس اللہ کا ظہور ہے جو اس لئے ہے کہ ان کے اندر تضرع کی کیفیت پیدا ہو۔ مگر ہمارے تمام رہنما ان واقعات کو بأس الانسان قرار دے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں صرف نفرت اور عناد کا جذبہ ابھر رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں بھی غیر مسلموں کی طرف سے ظلم ہوا تو کیا ان واقعات کو بھی بأس اللہ کا ظہور کہا جائے گا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں جو کچھ ہوا وہ دعوت حق کے ردعمل میں ہوا۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری قومی کارروائیوں کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۹۲

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۸ ستمبر ۱۹۹۲) کے صفحہ اول کی پہلی خبر کی سرخی ہے —
"پاکستان نے ٹینک شکن میزائل تیار کر لئے، اندھیرے میں بھی ہدف کو نشانہ بنا سکے گا"
اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ آج کی دنیا میں کروڑوں انسان دن کی روشنی میں

ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہم گمراہ ہیں، ہم کو اپنے دعوتی عمل کا نشانہ بناؤ۔ مگر مسلمانوں کو فرصت نہیں کہ وہ ان اہداف نہار کو اپنا نشانہ بنائیں۔ وہ اس پر فخر کر رہے ہیں کہ انھوں نے اہداف لیل کو نشانہ بنانے کا راز دریافت کر لیا ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۲

لاہور کے اخبار وفاق (۱۳ اپریل ۱۹۹۲) کے صفحۂ اول کی سب سے نمایاں سرخی یہ ہے: "مسلمانوں پر مصائب کی وجہ قرآن وسنت سے منھ موڑنا ہے"۔ یہ پاکستان کے صدر غلام اسحاق خاں کا جملہ ہے جو انھوں نے اسلام آباد کی قومی سیرت کانفرنس میں کہا۔ یہ بات صدر پاکستان سے لے کر ایک عام مسلمانوں تک ہر آدمی کہہ رہا ہے۔ مگر اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات لوگ صرف کہنے کے لئے کہتے ہیں نہ کہ کرنے کے لئے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۹۲

مسٹر کمال (علیگ) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے اپنی نوٹ بک دی کہ اس پر کوئی نصیحت لکھ دیجئے۔ وہ آجکل مخصوص حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں نے ان کے حالات کی نسبت سے لکھ دیا: پیچھے دیکھنے والا آدمی پیچھے رہ جاتا ہے اور آگے دیکھنے والا آدمی آگے بڑھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفت گو ہو رہی تھی۔ انھوں نے سیکولرزم کا مطلب لادینیت بتایا۔ میں نے کہا کہ یہ درست نہیں۔ سیکولرزم اصلاً صرف اس کا نام ہے کہ اہل مذہب اور اہل حکومت اس بات پر راضی ہو جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ بنیادی طور پر سیکولرزم ایک عملی تدبیر ہے نہ کہ کوئی مکمل نظریہ۔

تاہم جو لوگ مذہب میں یقین نہیں رکھتے وہ بطور خود اس کی تشریح کر کے اس کو ایک مکمل آئیڈیالوجی کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ کچھ افراد کی اپنی تعبیر ہے۔ اس قسم کی خود ساختہ تعبیر کے امکانات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً اسلام کو اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مختلف لوگ اس کی طرح طرح کی تعبیریں کرتے ہیں۔

مگر ان مختلف اور متضاد تعبیرات کے باوجود جب یہ کہنا ہو کہ اسلام کیا ہے تو یہی کہا جائے گا کہ اسلام وہ ہے جو قرآن وسنت میں موجود ہے اور جس پر صحابہ کرام نے عمل کیا۔

۲۹ ستمبر ۱۹۹۲

ایک اصلاحی عالم سے مولانا حمید الدین فراہی کے تفسیری مقام کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ان کی نامکمل تفسیر کو نظام القرآن کہا جاتا ہے۔ مگر میں اس کو نکات القرآن کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ کیوں کہ ان کی تفسیر میں زیادہ تر نکات پر مشتمل ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں تفسیر نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ کچھ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو وہ عہد حاضر کی تفسیر قرآن ہوتی۔ میں نے کہا کہ مولانا حمید الدین فراہی عہد حاضر کی تفسیر قرآن لکھنے کے لئے competant نہ تھے۔ کیوں کہ جدیدیات کا ان کا کوئی مطالعہ نہ تھا۔ اور جدید علوم کے گہرے مطالعہ کے بغیر کوئی شخص عہد حاضر کی نسبت سے قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو تقریباً ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اب تم لوگ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرو۔ یعنی سابق سمت کے مقابلہ میں برعکس سمت۔

مدینہ کے یہود نے اس واقعہ کو آپ کے خلاف پروپگنڈا کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح محمدؐ اپنی تردید آپ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا پچھلا قبلہ درست تھا تو موجودہ قبلہ درست نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ان کا موجودہ قبلہ درست ہے تو ان کی پچھلی عبادتیں بے کار گئیں۔ یہود کی یہ بات محض شوشہ تھی، وہ کوئی حقیقی اعتراض نہیں تھا۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۲

ایشیا، یورپ اور افریقہ کا سفر کر کے آج میں دہلی پہنچا۔ تین براعظم کے اس سفر میں تین ہفتے لگے۔ قدیم زمانہ میں اس قسم کا سفر کرنے کے لئے پوری عمر درکار تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ سفر صرف تین ہفتہ میں طے ہو گیا۔ کتنا فرق ہے ماضی اور حال میں۔ مگر پورے سفر کے دوران میرا یہ احساس رہا کہ لوگ نئے مواقع کو استعمال کرنے میں تو مشغول ہیں، مگر نئے مواقع پر

خالق کا شکر کرنے والا حقیقی معنوں میں کوئی نہیں۔

۲ اکتوبر ۱۹۹۲

آج صبح کو فجر کی نماز کے بعد رہائش گاہ (سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ) کے دروازہ کی گھنٹی بجی۔ میں نے بارجہ سے دیکھا تو تقریباً ۲۵ سال کا ایک نوجوان لوہے کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہا کہ "آپ سے ضروری بات کرنا ہے"۔ میں نے گھر کے خادم (محفوظ) سے کہا کہ ان کو نیچے ملاقات کے کمرہ میں بیٹھا دو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس نے انھیں نیچے کے کمرہ میں بٹھا دیا۔

اس وقت میں اوپر کی پہلی منزل پر تھا۔ چند منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ آدمی سیڑھی پر چڑھ کر اوپر گیلری میں بڑھ کر اس کے سامنے آیا اور کہا کہ آپ کو نیچے کے کمرہ میں بٹھایا گیا تھا، پھر آپ اوپر کیسے آگئے۔ اس نے کچھ جواب دئے بغیر میرے اوپر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں نے تیزی سے اس کو پکڑ کر فرش پر گرا دیا۔ اور اس کی گردن دبا کر اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ ثانی اثنین اس وقت دوسری منزل پر تھے۔ ان کو آواز دے کر بلایا۔ اس وقت سامنے کی سڑک پر کالونی کے کئی چوکیدار جمع تھے۔ شور وغل سن کر وہ لوگ بھی لاٹھیاں لئے ہوئے اندر آگئے۔ اس کے بعد یہ لوگ اس آدمی کو پکڑ کر قریب کے پولیس اسٹیشن لے گئے اور اس کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

اس موقع پر میں نے جو کچھ کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے لئے دوسرا انتخاب باقی نہ تھا، اگر آدمی کے لئے جنگ اور غیر جنگ میں انتخاب کی آزادی ہو تو اس کو غیر جنگ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ مگر جب حالات ایسے ہوں کہ آدمی اپنا دفاع کرے یا حملہ آور کے حملہ کا شکار بنے تو ایسے موقع پر اس کو دفاع کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۲

تین ہفتہ کے وقفہ کے بعد آج دوبارہ ہندستانی اخبارات دیکھے۔ آج کے ہر اخبار میں ایک تصویر نظر آئی۔ ایک آدمی زمین پر سر رکھ کر سجدہ جیسی حالت میں پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ موجودہ ہندستانی پریسیڈنٹ ڈاکٹر شنکر دیال شرما ہیں۔ وہ ۲ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی ۱۲۳ ویں یوم پیدائش کے موقع پر نئی دہلی کی گاندھی سمادھی گئے۔ وہاں پہنچ کر وہ گاندھی جی کی عقیدت سے اتنا

بے قابو ہوئے کہ ان کے سامنے سجدہ میں گر پڑے۔

آج ہندستان میں ایسے کروڑوں لوگ ہیں جو مہاتما گاندھی سے غیر معمولی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر شاید پورے ملک میں کوئی بھی نہیں جو حقیقی معنوں میں مہاتما گاندھی کا پیرو ہو۔ یہی صورتحال مسلمانوں کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ اسلامی شخصیتوں سے اظہار عقیدت میں ہر آدمی آگے ہے، مگر اسلامی شخصیتوں کی عملی تقلید میں ہر آدمی پیچھے۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۲

آج ٹی وی پر بابری مسجد - رام جنم بھومی کا ایک فیچر تھا۔ ٹی وی کی ایک ٹیم نے اجودھیا اور دوسرے مقامات کا سفر کرکے مختلف حلقوں کے عوام کا تاثر لیا۔ اور اس کو تصویر اور آواز کی صورت میں ٹی وی پر دکھایا۔

جن لوگوں کو ٹی وی پر دکھایا گیا ان میں بظاہر دو آدمی کے سوا سب کے سب ہندو تھے۔ ہر ایک نے بالاتفاق اپنے لفظوں میں یہ بات کہی کہ ہم کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ مسجد بنتی ہے یا مندر۔ ہمارا تو مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا روزگار چلے۔ دو وقت کی روٹی ہمارے بچوں کو ملتی رہے۔ یہ لیڈروں کے جھگڑے ہیں۔ یہ ہمارے جھگڑے نہیں۔

یہ بات مختلف صورتوں میں سامنے آچکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نا اہل مسلم لیڈروں نے اگر اس مسئلہ پر شور وغل نہ کیا ہوتا تو یہ مسئلہ ہرگز مسئلہ نہ بنتا۔ نا اہل مسلم لیڈروں کی چیخ پکار نے ہندو فرقہ پرستوں کو موقع دیا۔ اور انھوں نے "ہندو دھرم خطرہ میں" کا نعرہ لگا کر اس کو اسپلائٹ کرنے کی کوشش کی۔

۵ اکتوبر ۱۹۹۲

ڈریک ہمفری (Derek Humphry) کی ۱۸۰ صفحہ کی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس میں تکلیف میں مبتلا آدمی کے لئے خودکشی کو جائز ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ——— آخری خروج (Final Exit) میں نے اس کو پڑھا تو میں نے کہا کہ اس کے بجائے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس کا نام آخری داخلہ (Final Entry) رکھا جائے۔

مصنف کے نزدیک موت آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ اس لئے انھوں نے تجویز کیا ہے

کہ جو آدمی تکلیف دہ قسم کے مرض الموت میں مبتلا ہو۔ اس کو لمبے عرصہ تک مصیبت اٹھا کر مرنے کے بجائے دوا کے استعمال سے آسانی سے موت کا انتخاب کرنا چاہئے۔ یہ کتنی بڑی بے خبری ہے۔ انسان کو معلوم نہیں کہ موت سخت تر مرحلۂ حیات میں داخلہ کا دن ہے، نہ کہ مصائب حیات سے چھٹکارا پانے کا دن۔

٦ اکتوبر ١٩٩٢

عباس محمود العقاد (١٩٦٤ - ١٨٨٩) مصر کے مشہور ادیب ہیں۔ ان کی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ مگر ذاتی محنت سے انھوں نے قابل قدر علمی صلاحیت پیدا کی۔ اور انگریزی اور اسپینی اور اطالوی زبان بھی سیکھی۔ ان کی تقریباً ایک سو کتابیں عربی زبان میں ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار ان کی کاپی شیخ محمد عبدہ کے سامنے آئی۔ اس کو دیکھ کر شیخ نے انھیں بلایا اور ان سے بات کی اور کہا: ما اجدر ہذا ان یکون کاتبا بعد (یہ آئندہ انشاپرداز ہونے کے بہت لائق ہے۔)

قاہرہ کے دیوان المعارف میں ایک روز ان کی ملاقات سعد زغلول (١٩٢٨ - ١٨٥٧) سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران عقاد نے شیخ محمد عبدہ کا مذکورہ تاثر بیان کیا۔ سعد زغلول نے اس کو سن کر کہا: اریٰ ان نبوۃ الامام تتحقق (میرا خیال ہے کہ امام عبدہ کی پیشین گوئی پوری ہوگی)

ابتدائی عمر میں اس قسم کی حوصلہ افزائی اکثر بہت مفید ہوتی ہے۔

٧ اکتوبر ١٩٩٢

دربھنگہ کے دو صاحبان آئے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے نقطۂ نظر میں اور دوسرے مسلم لیڈروں کے نقطۂ نظر میں یہ فرق ہے کہ وہ لوگ کتے کا کاٹنا اور کتے کا بھونکنا دونوں کو یکساں طور پر مسئلہ سمجھتے ہیں مگر میں دونوں میں فرق کرتا ہوں۔ میرے نزدیک کتا کاٹے تو مسئلہ ہے، اور اگر کتا بھونکے تو میرے نزدیک وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کتا اگر کاٹنے کے لئے آجائے تو ضرور اس سے لڑئیے لیکن اگر کتا دور سڑک پر بھونک رہا ہو تو اس کو نظر انداز کیجئے۔ ایسی حالت میں آپ قدیم مثل پر عمل کیجئے کہ: کتے

بھونکتے رہتے ہیں، ہاتھی چلتا رہتا ہے

۸ اکتوبر ۱۹۹۲

ہندستان کے ہندو مسلم فسادات پر اظہار رائے کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا: دفاع کے لئے لڑنا جائز مقصد کے لئے لڑنا ہے، اور وقار کے لئے لڑنا جاہلیت کے لئے لڑنا۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۲

بہار کے ایک مسلم نوجوان تعلیم کے لئے دہلی آئے ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ میں بی ایس سی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ ان سے گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ آپ اگر اپنے بارہ میں یہ سمجھ لیں کہ آپ دور پروفیسری میں ہیں اور جامعہ میں جاکر پروفیسر کی کرسی پر بیٹھنا چاہیں تو آپ کو جامعہ والے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ مگر جب اپنے کو دور طالب علمی میں سمجھ رہے ہیں تو جامعہ آپ کو ہر طرح کی سہولت دینے کے لئے تیار ہے تاکہ آپ اپنے کورس کو مکمل کر سکیں۔

میں نے کہا کہ اس مثال سے آپ موجودہ مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دور اعداد میں تھے۔ مگر ان کے رہنماؤں نے ان کو بتایا کہ وہ دور جہاد میں ہیں۔ اس غلط رہنمائی کی وجہ سے وہ ہر جگہ لڑنے بھڑنے میں مصروف ہیں اور یکطرفہ طور پر صرف برباد ہو رہے ہیں۔ مسلمان اگر اپنے کو دور اعداد میں سمجھیں تو ان کے اندر صبر اور محنت کا مزاج پیدا ہوگا۔ مگر جب انھوں نے اپنے آپ کو دور جہاد میں سمجھ لیا تو وہ بس دوسرے سے ٹکراؤ کو کام سمجھنے لگے۔ حالاں کہ موجودہ حالات میں ٹکراؤ کی پالیسی کا کوئی فائدہ ان کے حصہ میں آنے والا نہیں۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۲

قرآن میں ہے کہ اللہ بڑا بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے۔ تم رحمان کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر

بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی (الملک ۱-۴)

قرآن کی ان آیتوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ زمین و آسمان خدا کی یونیورسل پلاننگ ہیں۔ انسان ایک چھوٹا سا پلان بناتا ہے مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نقائص موجود تھے۔ مگر خدا نے کائناتی سطح پر ایک منصوبہ بنایا اور ارب ہا ارب سال گزرنے کے باوجود آج تک اس منصوبہ میں کوئی نقص ظاہر نہ ہوسکا۔ آدمی جب اس حیرت انگیز واقعہ پر غور کرتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے نکل جاتا ہے: فتبارك الله احسن الخالقين۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۲

تبلیغی جماعت کے ایک صاحب نے شکایت کے انداز میں کہا کہ تبلیغ کی ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس کے ساتھ نہیں جڑا۔ میں نے کہا کہ جو ہو رہا ہے، یہی ہوسکتا ہے۔ آپ نے اپنی پوری جماعت کا ڈھانچہ عوامی نقطۂ نظر سے بنایا ہے۔ ایسی حالت میں عوام ہی اس سے جڑ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہم نے اپنی تحریک کا پورا نقشہ خواص کے اعتبار سے بنایا ہے، اس لئے ہماری تحریک میں زیادہ تر خواص کا طبقہ جڑ رہا ہے۔ ایسی حالت میں نہ آپ کو یہ شکایت ہونی چاہئے کہ اہل علم کا طبقہ آپ کے ساتھ نہیں جڑا۔ اور نہ ہم کو یہ شکایت ہونا چاہئے کہ عوام ہمارے ساتھ نہیں جڑے۔

اگر آپ تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے ڈھانچہ میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اسی طرح ہم اگر عوام کو اپنی تحریک میں جوڑنا چاہیں تو ہم کو اپنی تحریک کا نقشہ بدل دینا پڑے گا۔ اس تبدیلی کے بغیر دونوں طرف ایسا ہونا ممکن نہیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۲

کسی وجہ سے میرے ذہن میں یہ آگیا کہ آج تیرہ تاریخ ہے۔ بعد کو کیلنڈر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آج اکتوبر کی بارہ تاریخ ہے۔ میں نے سوچا کہ کیلنڈر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا مگر انسان ایسی غلطی کر جاتا ہے۔ پھر کیا کیلنڈر انسان کے مقابلہ میں افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کیلنڈر کا رتبہ انسان سے زیادہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلطی کرنا کسی سے کم رتبہ ہونے کی دلیل نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ کیلنڈر اپنے محدود دائرہ میں غلطی نہیں کرتا۔ مگر انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخلیقی فکر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور کروڑوں کیلنڈر مل کر تخلیق کا ادنیٰ عمل انجام دینے پر قادر نہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲

سید نجیب علی صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور نوجوان تھے۔ دونوں نظام آباد (دکن) کے رہنے والے ہیں۔ رخصت کے وقت انھوں نے کہا کہ کوئی نصیحت کی بات لکھ کر دیدیجئے۔ میں نے ان کی نوٹ بک پر یہ جملہ لکھ دیا: کسی کو دھوکا نہ دیجئے۔ دھوکا دینا تو درکنار، دل میں بھی دھوکے کی بات نہ سوچئے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲

آزادی کے بعد انڈیا میں جو دستور بنا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگلے پندرہ سالوں میں ملک کا تمام کام ہندی زبان میں کیا جائے گا۔ اسی طرح پاکستان کے دستور میں یہ شق شامل کی گئی کہ بیس سال کے بعد پورے ملک میں اردو کو نافذ کر دیا جائے گا۔ مگر نہ انڈیا میں ہندی کو اس کا مطلوبہ دستوری مقام ملا اور نہ پاکستان میں اردو کو وہ مقام ملا جو وہاں کے آئین میں مقرر کیا گیا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ملک میں وہ حقیقی حالات موجود نہ تھے جو اس قسم کی ایک دفعہ کو واقعہ بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اور جب ضروری حالات موجود نہ ہوں تو صرف کاغذی الفاظ کسی زبان کو بلند مقام نہیں دے سکتے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۲

تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے بنگال کے ایک مسلم لیڈر کو کسی نے بنگالی کہہ کر خطاب کیا۔ لیڈر صاحب نے کہا: "ہم مسلمان ہے"، ہم کو بنگالی مت پکارو"۔ یہی اس زمانہ میں بنگال کے مسلم لیڈروں کی عام بولی تھی۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب پاکستان بن گیا تو اس کے بعد لوگوں کی بولیاں بدلنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جبکہ مشرقی پاکستان کے مسلمان اپنا تشخص اسلامیت کے بجائے بنگالیت کے ساتھ ظاہر کرنے لگے۔ یہ مزاج بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ۱۹۷۱ میں باقاعدہ

لڑکر پاکستان سے علٰحدگی اختیار کر لی اور موجودہ بنگلہ دیش وجود میں آیا۔

جو 'اسلامیت' سیاسی تحریک کے دوران وجود میں آئے، اس کا انجام ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو بنگلہ دیش کا ہوا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۲

بمبئی کے اخبار انقلاب (۱۹ اپریل ۱۹۹۲) میں محمد اسد صاحب پر ایک مضمون پڑھا۔ ان کا خاندانی نام لیو پولڈ ویز تھا۔ ان کی پیدائش جولائی ۱۹۰۰ کو گلیشیا (Galicia) کے علاقہ میں ہوئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۲ کو اسپین میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۶ میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد ان کا نام محمد اسد رکھا گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۶ میں ان سے میری ملاقات طرابلس میں ہوئی تھی۔

محمد اسد صاحب ایک عرصہ تک موجودہ پاکستان (لاہور) میں رہے ہیں۔ یہاں اقبال سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ اقبال نے ان سے کہا کہ "وہ مستقبل کی اسلامی ریاست کی عقلی توجیہات کی تشہیر میں ان کا ساتھ دیں"۔

میرا احساس ہے کہ اقبال سمیت موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مفکرین کی پہنچ بس تاریخ تک تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں اسلام کا ادراک نہ کر سکے۔ اگر انھیں اسلام کی واقعی معرفت ہوتی تو وہ اسد صاحب کو مشورہ دیتے کہ تم یورپ میں جاکر اسلام کی تبلیغ کرو۔ اور اقوام عرب کو خدا کے دین میں داخل کرنے کی کوشش کرو۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲

عبد المنان صاحب (پیدائش ۱۹۵۹) کا ابتدائی وطن گیا (بہار) ہے۔ ایک عرصہ سے وہ دہلی میں مادی پور میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانی کی عمر میں وہ گیا میں مدرسہ انوار العلوم میں پڑھتے تھے۔ یہ ۱۹۴۸ کا واقعہ ہے۔ وہاں ان کے ایک استاد مولانا منظور احمد صاحب تھے۔ وہ چائے کے عادی تھے۔ مولانا عبد المنان صاحب روزانہ دن کو گیارہ بجے ان کے لئے مدرسہ کے مطبخ سے چائے بنا کر پیش کیا کرتے تھے۔

ایک روز عبد المنان صاحب نے حسب معمول چائے بنائی اور پیالی میں لا کر ان کے

سامنے رکھی۔ مولانا منظور صاحب نے پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبد المنان صاحب سے کہا، جانتے ہو یہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چائے ہے۔ استاد نے کہا کہ نہیں۔ یہ میرا آقا ہے۔ اور میں اس کا غلام ہوں۔ روزانہ مقررہ وقت پر مجھے اس کے سامنے حاضری دینا پڑتا ہے۔

استاد نے صرف اتنی ہی بات کہی۔ مگر عبد المنان صاحب نے اس میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ مجھے زندگی میں کسی چیز کو اس طرح اپنی مجبوری نہیں بنانا ہے کہ وہ میرا آقا ہو اور میں اس کا غلام بن جاؤں۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲

کشمیر کے مولانا محمد سعید مسعودی کو وہاں کے جنگجوؤں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۰ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس وقت وہ سرینگر کے قریب اپنے مکان میں تھے اور ان کی عمر تقریباً ۸۰ سال ہو چکی تھی۔ پروفیسر سوز کشمیری نے بتایا کہ وہ کشمیر کی مسلح تحریک کو اسلامی جہاد نہیں سمجھتے تھے۔ چند جنگجو جو اپنے کو مجاہدین کہتے تھے، گن لے کر مولانا مسعودی کے مکان میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ ہماری تحریک کے بارہ میں کیا کہتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ میں اس کو جہاد نہیں سمجھتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صرف فساد ہے۔ جنگجوؤں نے مطالبہ کیا کہ آپ اعلان کریں کہ یہ جہاد ہے۔ مگر مولانا مسعودی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس کے بعد جنگجوؤں نے گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔

میں نے کہا کہ کشمیر کے معاملہ میں سب سے برا کردار پاکستان کے فوجی صدر جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ اور سب سے اعلیٰ کردار وہ ہے جو مولانا مسعودی نے ادا کیا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲

مسٹر وی پی دت کا مضمون ہندستان ٹائمس (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ڈپلومیٹ کے اندر کیا صفات ہونی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ میرے ایک واقف کار دوست نے کہا کہ واشنگٹن میں مقرر کئے جانے والے ہندستانی سفیر کے اندر جو پہلی خصوصیت ہونی چاہئے وہ یہ کہ وہ انگریزی زبان بھوجپوری لہجہ میں نہ بولتا ہو:

A knowledgeable friend said to me that the first requirement of an Indian envoy. to Washington is that he should not speak English with a Bhojpuri accent!

مذکورہ "واقف کار" کی بات انڈیا جیسے ملک کے لئے صحیح ہے، مگر وہ عمومی طور پر صحیح نہیں۔ جاپان، جرمنی، چین اور روس کے سفیر عام طور پر زیادہ اچھے لہجہ میں انگریزی نہیں بول پاتے۔ اس کے باوجود واشنگٹن میں ان کو زبردست مقام حاصل رہتا ہے۔ اصل یہ ہے طاقت ور ملک کا سفیر، خواہ جیسی بھی زبان بولے، وہ غیر ملک میں اہم سمجھا جائے گا۔ مگر کمزور اور غیر ترقی یافتہ ملک کے سفیر کے پاس اس قسم کا زور نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے پاس اپنے کو قابل لحاظ بنانے کی واحد صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اچھے لہجہ میں انگریزی بولنا جانتا ہو۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۲

اہل مدینہ کے ایک طبقہ نے یزید بن معاویہ کی بیعت کرنے کے بعد بیعت توڑ دی۔ مگر کچھ لوگوں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر پھینکا اور کہا کہ میں نے اس طرح یزید کی بیعت اتار دی جیسے میں نے اپنا یہ عمامہ سر سے اتار دیا۔ کچھ لوگوں نے اپنے پاؤں کا جوتا نکال کر پھینک دیا اور کہا کہ میں نے اس طرح یزید کی بیعت اتار دی جس طرح میں نے اپنا جوتا اتار دیا۔ حتیٰ کہ وہاں بہت سے عمامہ اور جوتے اکٹھا ہو گئے۔ (حتی اجتمع شیئ کثیر من العمائم والنعال هناك) البدایہ والنہایہ ۸/۲۱۸

اس کے بعد یزید نے دس ہزار کی فوج مدینہ بھیجی اور وہ واقعہ پیش آیا جس کو واقعہ حرہ کہا جاتا ہے۔ فوج کے سردار مسلم بن عقبہ کو ہدایات دیتے ہوئے یزید نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی جب تم ان پر غالب آجاؤ تو مدینہ کو تین دن تک مباح رکھو (واذا ظهرت عليهم فأبح المدينة ثلاثا ثم اكفف عن الناس) البدایۃ والنہایۃ ۸/۲۱۹

شیعہ حضرات نے ان الفاظ کو لے کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یزید نے تو مدینہ کی عورتوں کو ان کے لئے مباح کر دیا۔ اور یہ کہ مدینہ کی ایک ہزار عورتیں اس کے بعد حاملہ ہو گئیں۔ حالاں کہ یہ سب لغو ہے۔ اس جملہ میں مباح رکھنے سے مراد قتل کو مباح رکھنا ہے نہ کہ عورتوں سے تعلق کو مباح رکھنا۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۲

عبدالرحمان انتولے صاحب نے ایک واقعہ بتایا جس کو انھوں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ ۱۹۴۵ کے لگ بھگ زمانہ میں ایک مسلمان بچی نے کپڑے پر کڑھائی کے ذریعہ ہونے والے پاکستان کا نقشہ بنایا اور اس کو مسٹر جناح کو ہدیۃً پیش کیا۔ مسٹر جناح نے اس کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد وہ کسی میٹنگ میں تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ جناح صاحب آپ ملک کا بٹوارہ کرا رہے ہیں، اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ آپ ملک کو متحدہ روپ میں آزاد کرائیے متحدہ ہندستان مسلمانوں کے لئے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ جناح صاحب نے اپنی جیب سے مذکورہ رومال نکالا اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے کہا: پاکستان کی تحریک اب چھوٹی بچیوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس نوبت تک پہنچ جانے کے بعد اگر میں پاکستان کی تحریک کو واپس لینے کا اعلان کروں تو قوم خود مجھ کو رد کر دے گی اور دوسرا جو شخص بھی پاکستان کا نعرہ لے کر اٹھے گا اس کے پیچھے دوڑ پڑے گی۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲

ایک مثل اکثر زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں وہ اس طرح ہے کہ پہلی چیز پہلے کی جاتی ہے:

First thing comes first.

کسی بھی عمل کے لئے یہ اصول بے حد اہم ہے، اسی کو تدریج کہا جاتا ہے۔ ترتیب و تدریج کا طریقہ اختیار کئے بغیر اس دنیا میں کوئی کامیابی ممکن نہیں۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۲

مشہور سومناتھ مندر کو محمود غزنوی نے ۲۵-۱۰۲۴ء میں توڑا تھا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ مختلف واقعات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آزادی کے بعد ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند نے اپنے خرچ پر اس کو سابق انداز میں تعمیر کرایا۔ ۱۹۵۱ میں جب حکومت اس مندر کو بنوا رہی تھی تو ایک مسلمان شاعر نے یہ شعر کہا:

پھر بنایا جا رہا ہے سومنات　　اک نیا محمود پھر آنے کو ہے

اس شعر میں جس ذہن کی نمائندگی کی گئی ہے اس کو بہت سے نادان مسلمان حمیت اسلامی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ حمیت جاہلی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۲

ایک مسلمان لیڈر نے تقریر کرتے ہوئے ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کی زبردست مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم ہماری تاریخ کی سب سے زیادہ فاش غلطی تھی:

Partition was the biggest blunder.

مگر انھوں نے تقسیم کی اصل ذمہ داری ہندوؤں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بٹوارہ کی تجویز سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے پیش کی۔ انھوں نے کئی قسطوں میں اپنا ایک آرٹیکل پایونیر میں چھپوایا جس میں کہا گیا تھا کہ بنگال اور پنجاب کی آبادی کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے۔ کیوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ وغیرہ۔

انھوں نے کہا کہ بٹوارہ کے ذمہ دار مسلمان اس وقت نہ ہوتے جب کہ لالہ لاجپت رائے کی تجویز کو رد کر دیتے۔ مگر جب انھوں نے مسٹر جناح کی قیادت میں اس تجویز کو بہت بڑی اکثریت کے ساتھ قبول کر لیا تو اس کے ذمہ دار مسلمان ہوں گے نہ کہ ہندو۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کے اوپر دوسری قوموں کے مظالم کی داستان بیان کرتے ہیں۔ یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ مسلمان اس وقت ہر جگہ دوسروں قوموں کے مظالم کی زد میں ہیں۔ مگر یہ تنبیہہ خداوندی ہے نہ کہ ظلم اغیار۔ مسلمانوں نے ان واقعات کو ظلم اغیار کے خانہ میں ڈال رکھا ہے اس لئے ان کے اندر صرف احتجاج کا ذہن ابھر رہا ہے۔ اگر وہ ان واقعات کو تنبیہہ خداوندی سمجھتے تو ان کے اندر اصلاح خویش کا جذبہ پیدا ہوتا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۲

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۲ کو میں بذریعہ ٹرین بھوپال پہنچا۔ اسٹیشن پر کئی ساتھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ باہر کی طرف روانہ ہوا۔ گیٹ پر پہنچا جہاں ریلوے کا آدمی مسافروں سے ٹکٹ وصول کرنے

کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ ٹکٹ نکال کر ریلوے کے آدمی کو دوں۔ اچانک وہ اپنا دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا: نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ہم کو تو آپ کا صرف آشیرواد چاہئے۔

یہ ٹکٹ کلکٹر ہندو تھا۔ میں نے سوچا کہ جن ہندوؤں کے دل میں ہمارا اتنا زیادہ احترام ہو، ان سے نفرت کرنے کی کیا ضرورت۔ ان سے تو ہم کو محبت کرنا چاہئے۔ اور ان کے حق میں اچھی دعا کرنا چاہئے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۲

بھوپال مدھیہ پردیش کی ریاستی راجدھانی ہے۔ اس وقت مدھیہ پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہے۔ اجتماع کے سلسلہ میں بھوپال گیا ہوا تھا۔ وہاں ہندی روزنامہ افکار (۲۷ اکتوبر ۱۹۹۲) میں صفحہ ۲ پر مدھیہ پردیش ودھان سبھا کے اسپیکر پروفیسر برج موہن مشرا کی تقریر پڑھی۔ اس کا عنوان تھا: لکشمی پوجا تو ہمارے یہاں ہوتی ہے لیکن لکشمی کا نواس تو کہیں اور ہے۔

میں نے کہا کہ لکشمی (دولت) کو "پوجا" کا موضوع بنانا ہی ملک کی موجودہ اقتصادی صورت حال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۲

۲۸ اکتوبر کو مجھے بھوپال سے دہلی واپس آنا تھا۔ ایر پورٹ پر وی آئی پی لاونج میں داخل ہوا تو وہاں دیوار پر عمدہ فریم میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ تاج المساجد کی تصویر تھی۔ لاونج میں ایک تصویر کے سوا کوئی دوسری تصویر موجود نہ تھی۔ اس کے بعد انڈین ایر لائنز کی فلائٹ سے روانہ ہو کر دہلی میں اترا۔ یہاں ایر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تو دوبارہ جو سب سے پہلی تصویر نظر آئی وہ تاج محل کی تصویر تھی۔

میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے اتنے بے بصیرت ہو چکے ہیں کہ اس ملک کے کانٹے تو انھیں دکھائی دیتے ہیں مگر اس ملک کے پھول انھیں نظر نہیں آتے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا ہندستان کی برائیوں کو بتانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر ہندستان کی

خوبیوں کو بتانے والا کوئی بھی نہیں۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۹۲

آج کے ٹائمس آف انڈیا میں ایلا وھیلر ولکاکس (Ella Wheeler Wilcox) کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ کبھی طے نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو صحیح طور پر طے نہ کیا جائے۔

No question is ever settled until it is settled right.

کسی نزاعی مسئلہ کو جب کسی ایسے اصول کی بنیاد پر طے کیا جائے جس اصول کا درست ہونا تمام فریقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو تو ہر ایک مطمئن ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا ضمیر گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ جو کچھ طے کیا گیا ہے، صحیح بنیاد پر طے کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب مسئلہ کو غلط بنیاد پر طے کیا جائے تو لوگوں کا ضمیر اس کے خلاف بغاوت کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طے ہو کر بھی طے شدہ حیثیت اختیار نہیں کرتا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲

آج جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر رفیق زکریا کا لکچر تھا۔ انھوں نے انگریزی میں لکچر دیا۔ اس کا عنوان تھا — آزاد ہندستان میں مسلمانوں کے بارہ میں کچھ خیالات:

Some thoughts on Muslims in free India.

ملاقات ہوئی تو میں نے ڈاکٹر رفیق زکریا سے کہا کہ اس سے پہلے آپ کو پڑھتا رہا ہوں، آج آپ کو سنوں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں برابر آپ سے مستفید ہوتا رہتا ہوں۔ اپنی لمبی تقریر میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ظلم اور تعصب کی داستان بیان کی۔ آخر میں کہا کہ مگر ہم کو اپنے مسائل کے حل کے لئے کنفرنٹیشن سے بچنا چاہئے۔ کنفرنٹیشن کے طریقہ کو میں خودکشی کا طریقہ (suicidal approach) سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ظلم اور شکایت کی داستان بیان کرنے کے بعد لوگوں کو ٹکراؤ سے روکنا ایک بے معنی بات ہے۔ اس طرح کی تقریروں اور تحریروں کے بعد لازماً ٹکراؤ ہی کا ذہن پیدا ہوگا۔ اس کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ظلم اور تعصب کی تفصیل بتانے کے بجائے یہ بتایا

جائے کہ ظلم اور تعصب کے باوجود موجودہ حالات میں ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں میں شکایت غیر کے بجائے عمل خویش کا جذبہ پیدا ہو۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲

جارج سنتانانا (George Santayana) ۱۸۶۳ میں میڈرڈ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۲ میں روم میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ فلسفی کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کا قول ہے کہ شاید انسان کی واحد سچی بڑائی اس کی اس صلاحیت میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمتر سمجھے:

Perhaps the only true dignity of man is his capacity to despise himself.

اسی حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو اوپر اٹھا دیتا ہے (من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ)

یکم نومبر ۱۹۹۲

سوویت یونین میں کمیونسٹ نظام کے خاتمہ کے بعد کمیونزم ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ تاہم چین کے حکمراں کمیونزم کو ایک غیر عملی نظریہ ماننے کے باوجود چین میں اپنی حکومت باقی رکھنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں۔ وہاں ایک نیا نظام لانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کو ایک مغربی مبصر نکولس کرسٹاف نے بجا طور پر سرمایہ دارانہ کلیت پسندی (capitalist totalitarianism) سے تعبیر کیا ہے۔ چین کے ایک تعلیم یافتہ طبقہ میں آجکل ایک لطیفہ (جوک) بہت مقبول ہے——— کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ہم اشتراکیت سے سرمایہ داری کی طرف بڑھ رہے ہیں:

Under the leadership of the communist party, we are advancing from nationalism to capitalism

۲ نومبر ۱۹۹۲

موجودہ زمانہ میں ہر طرف اسلام کے نام پر سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ مگر حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں۔ کسی نے اسلام کو قومی ضمیمہ بنا رکھا ہے۔ کوئی اسلام کو سیاسی ضمیمہ بنائے ہوئے ہے۔ اور کسی کے یہاں وہ مذہبی ضمیمہ بنا ہوا ہے۔

حقیقی اسلام وہ ہے جو نفس انسانی میں انقلاب پیدا کرے۔ جو انسان کی شخصیت کو ایک نئی شخصیت میں تبدیل کر دے۔ مگر موجودہ زمانہ میں میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی اصل شخصیت

تو نہیں بدلتی۔ البتہ ظاہری طور پر اسلام کا لیبل ان کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اسی کو میں ضمیمہ سے تعبیر کر رہا ہوں۔

۳ نومبر ۱۹۹۲

آج ہندستان ٹائمس میں مسٹر ایس نہال سنگھ کا مضمون سنٹرل ایشیا کے بارہ میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے حال میں قزاقستان، تاجکستان، ترکمانستان وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہ قزاقستان کے صدر نور سلطان (Nursultan Nazarbayev) سے بھی ملے۔ اس مضمون کا عنوان ہے —

وسط ایشیا میں مذہب کی واپسی :

Central Asia: Return to religion

مضمون نگار نے بتایا کہ سنٹرل ایشیا میں ہر طرف اسلامک ریوائولزم کے آثار نظر آتے ہیں۔ مثلاً بند مسجدیں کھول دی گئی ہیں اور نئی مسجدیں اور مدرسے بن رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ میں قزاخستان میں ۴۸ مسجدیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب وہاں تقریباً ڈیڑھ سو مسجدیں آباد ہیں۔ ایک مسلمان نے کہا کہ ہم ۷۰ سال سے نظریاتی قید خانہ میں تھے، اب ہم آزاد ہیں :

We were in an ideological prison. We are now free.

۴ نومبر ۱۹۹۲

خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ قتال میں اسراع کو ناپسند کرتے تھے۔ سُلیط بن قیس ایک بہادر شخص تھے۔ ان سے حضرت عمر نے کہا : لولا انك رجل عجِل في الحرب لولّيتك هذا الجيش والحرب لا يصلح لها الا الرجل المكيث (العبقريات الاسلامية ۴۹۴) یعنی تم جنگ میں جلد کود پڑتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تم کو اس لشکر کا سردار بنا دیتا۔ اور جنگ کے لئے تو صرف وہ شخص موزوں ہے جو ٹھہرنے والا ہو، جو جنگ شروع کرنے میں جلدی نہ کرے۔

۵ نومبر ۱۹۹۲

ایک مسلم نوجوان نے اپنی نوٹ بک پر کوئی نصیحت لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے یہ فقرہ لکھ دیا۔ آپ اپنی زندگی کا مشن یہ بنائیے کہ دوسرے لوگ جہاں تک پہنچ چکے ہیں آپ اس سے آگے پہنچیں گے۔ آپ داستان حیات کا اگلا پیراگراف تحریر کریں گے۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بعض الزامات ظاہر کے اعتبار ہی سے غلط ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ آپ باپ کو اس بات کا ملزم ٹھہرائیں گے کہ وہ ایک بیٹے کا زیادہ خیال کرتا ہے اور دوسرے کا کم۔ تو یہ بات اپنے ظاہر کے اعتبار سے ہی بے بنیاد ہوگی۔ کیوں کہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی باپ اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے دو حقیقی بیٹوں میں فرق کرے۔ بہت سے الزامات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر الزام دینے والا غور کرے تو وہ دوسرے کے اوپر وہ الزام عائد نہ کرے۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۲

راے ونڈ (پاکستان) میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہو رہا ہے۔ دو مسلمان دہلی کے باہر سے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ رائے ونڈ کے اجتماع میں جا رہے ہیں۔ مگر سوال وجواب کے دوران کھلا کہ اصل میں وہ تجارتی مقصد سے پاکستان جا رہے ہیں۔ رائے ونڈ کے اجتماع میں شرکت کا بہانہ انھوں نے اس لئے بنایا کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح پاکستان کا سفارت خانہ انھیں آسانی سے ویزا دے دے گا۔

مجھے طبعی طور پر ایسے لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ آدمی کو ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے دل اور اس کی زبان میں فرق نہ ہو۔ وہ جو کچھ کہے وہی کرے، اور وہ وہی کہے جو اسے کرنا ہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۹۲

ایک مسلم نوجوان نے اپنی ڈائری دی اور کہا کہ اس پر نصیحت لکھ دیجئے۔ میں نے یہ جملہ لکھ دیا: زندگی نام ہے ناموافق حالت کو موافق حالت میں تبدیل کرنے کا۔

۹ نومبر ۱۹۹۲

بیرونی دنیا میں ناگپور کا تصور یہ ہے کہ وہ آر ایس ایس کا گڑھ ہے۔ مگر ناگپور کے قیام کے دوران میں نے شہر میں آر ایس ایس کی کوئی چھاپ نہیں دیکھی۔ حتی کہ ناگپور میں گائے کا گوشت کھلے بازار میں بکتا ہے۔ مگر آر ایس ایس والوں نے کبھی اس کے خلاف کوئی بڑا پروٹسٹ نہیں کیا۔

میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کے اکثر فتنے اخبارات پھیلاتے ہیں۔ ہندستان میں بدقسمتی سے صحافت کے نام پر جو چیز آئی وہ زرد صحافت تھی۔ یہی زرد صحافت ہمارے اکثر مسائل کی ذمہ دار ہے۔ انھیں اخباروں کے ذریعہ غلط فہمیاں پھیلتی ہیں اور آخر کار فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۲

۸ نومبر کو میں ناگپور گیا تھا۔ وہاں سے ۱۰ نومبر کو واپس آیا۔ ناگپور مہاراشٹر اسٹیٹ کا ایک شہر ہے۔ مہاراشٹر میں مسلمانوں نے اردو اسکول کثرت سے قائم کئے ہیں۔ یہاں کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان وہ ہیں جنھوں نے ابتداءً اردو اسکول میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کی۔

مہاراشٹر میں اردو اسکولوں کی کثرت بہت اچھی ہے۔ مگر اس کے بعض ناموافق پہلو بھی ہیں۔ مثلاً میں نے ناگپور میں دیکھا کہ یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن پر ادبی اور شعری انداز غالب ہے۔ گفت گو یا تقریر میں وہ کثرت سے اردو اشعار پڑھتے ہیں۔ اردو تعلیم کا یہ نقصان ہوا کہ ان کی فکر سطحی ہو کر رہ گئی۔

میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ رسمی تعلیم وہ عام اسکولوں اور کالجوں میں حاصل کریں اور اردو زبان وہ بچوں کو گھر پر پڑھائیں۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا نے اپنے آج کے شمارہ میں سوامی ویویکانند کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہر چیز سچائی کے لئے قربان کی جاسکتی ہے، مگر سچائی کو کسی بھی چیز کے لئے قربان نہیں کیا جاسکتا:

Everything can be sacrificed for truth, but truth cannot be sacrificed for anything.

یہ بات کہنے میں بہت شاندار ہے مگر کرنے میں وہ انتہائی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی اس قسم کی بات کہتا ہے مگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا۔ مثلاً سوامی ویویکانند نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ ان پر اسلام کی صداقت منکشف ہوئی۔ مگر انھوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ اس میں انھیں اپنے قومی مذہب کو قربان کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جنھوں نے قربانی کی سطح پر اپنے عقیدہ کو ماننے کا ثبوت دیا ہو۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۲

ڈاکٹر عبد الحلیم عویس دہلی آئے اور یہاں چند دن مقیم رہے۔ وہ مصری ہیں اور ریاض کی جامعۃ الامام میں استاذ ہیں۔ ان سے گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ دوسرے علما سے میرا کوئی اعتقادی اختلاف نہیں۔ میرے عقائد عین وہی ہیں جو اہل سنت والجماعت کے عقائد ہیں۔ دوسروں سے میرا اختلاف صرف ایک معاملہ میں ہے۔ اور وہ نزاع کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ دوسروں سے لفظی یا عملی نزاع چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان نزاعات کو میں سراسر باطل سمجھتا ہوں۔

اس وقت ہمارے کرنے کا کام صرف ایک ہے، اور وہ وسیع معنوں میں دعوت ہے۔ دعوت کا کام نزاع کے ماحول میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے موجودہ حالات میں ہر قسم کے نزاع کو میں مطلق طور پر قابل اجتناب سمجھتا ہوں۔

مثلاً الاخوان المسلمون نے مصر میں حکمرانوں سے نزاع کی۔ جماعت اسلامی نے پاکستان میں حکمرانوں سے نزاع کی۔ الجزائر میں وہاں کی اسلامی جماعت نے اپنے حکمرانوں سے نزاع کی۔ ان تمام نزاعات کو میں باطل سمجھتا ہوں۔ ان ملکوں میں دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے کے لئے بے پناہ امکانات موجود تھے۔ مگر وہ سیاسی نزاعات کی وجہ سے برباد ہو گئے۔

اسی طرح فلپائن، اراکان، بوسنیا، کشمیر وغیرہ میں اسلامی جہاد کے نام پر جو نزاع جاری ہے اس کو میں سراسر باطل سمجھتا ہوں۔ ان علاقوں میں غیر سیاسی دائرہ میں کام کرنے کے مواقع مکمل طور پر موجود تھے۔ مگر مسلمان ان مواقع کو استعمال نہ کرکے سیاسی ٹکراؤ میں مشغول ہو گئے۔ میرے نزدیک یہ سب فساد ہے نہ کہ جہاد۔

اسی طرح ہندستان کے مسلمان یہاں کی ہندو اکثریت سے نزاع کی حالت قائم کئے ہوئے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کے لئے لازم تھا کہ وہ نزاع کے مواقع سے یکطرفہ طور پر اعراض کرتے ہوئے غیر نزاعی دائرہ میں دعوت و اصلاح کا کام کریں۔ مگر یہاں کے مسلمان بار بار ہندوؤں سے نزاعی میدان میں الجھتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں یہاں کام کے مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب یہی نزاعی سیاست ہے۔ مسلمان اس وقت صبر (خاموش تیاری) کے دور میں تھے۔ مگر وہ جہاد (اقدامی مقابلہ) کے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ اس قسم کی سیاست کا عقل سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ کجا کہ اسلام کے مطابق قرار دیا جائے۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۲

ہندستان میں کعبہ مغرب کی سمت میں پڑتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے مسلمان مغرب کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندو صبح کے وقت مشرق کی طرف رخ کرکے سورج کی پوجا کرتا ہے۔ اس فرق کو دیکھ کر ایک ہندو نے کہا: مسلمان ڈوبتے سورج کی طرف منھ کرکے عبادت کرتے ہیں۔ اور ہندو نکلتے سورج کی طرف رخ کرکے اپنی پوجا کرتا ہے۔

یہ محدود واقفیت کی بنا پر رائے قائم کرنا ہے۔ کیوں کہ مسلمان کی عبادت کا قبلہ کوئی سمت نہیں ہے بلکہ کعبہ ہے۔ ہندستان میں کعبہ مغرب کی سمت میں ہے اس لئے یہاں مغرب کی سمت میں رخ کرکے نماز ادا کی جاتی ہے۔ مگر دوسرے ملکوں میں کعبہ دوسرے رخ پر پڑتا ہے۔ اس لئے وہاں دوسرے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۲

مولانا انیس لقمان ندوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جس مسئلہ کا حل ممکن ہو اس کو مسئلہ کہنا ہی غلط ہے۔ مثلاً ہندستان میں ہندو جلوس اور نعرہ کا یقینی حل اعراض ہے۔ مسلمان جلوس سے اعراض کرکے اس کو فساد بننے سے روک سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم جلوس کو مسئلہ کیوں شمار کریں۔

۱۵ نومبر ۱۹۹۲

ایک صاحب نے الرسالہ میں ایک تنقید پڑھی۔ یہ تنقید ایک ایسی شخصیت کے بارہ میں تھی جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایسے لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ حالانکہ حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ تنقید کو ذاتی طعن کے معنی میں لیتے ہیں، اس لئے ایسا فرمارہے ہیں۔ الرسالہ میں اس قسم کی تنقید نہ زندہ کے بارہ میں ہوتی ہے اور نہ مردہ کے بارہ میں۔

الرسالہ میں تنقید صرف ان افکار پر ہوتی ہے جو چھپ کر پھیل چکے ہیں اور جو لوگوں کو دین کے بارہ میں غلط رہنمائی دے رہے ہیں۔ ایسی تنقید کا رخ شائع شدہ افکار کی طرف ہوتا ہے نہ کہ کسی کی ذات یا شخصیت کی طرف۔

حدیث میں ہے کہ لا تسبوا الاموات (فتح الباری ۳/۲۵۸) اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ممنوع ہے وہ سب وشتم ہے نہ کہ کسی کے افکار پر تنقید۔ اگر کسی شخص کے افکار زندہ ہوں اور وہ کسی آدمی کو کتاب وسنت کے خلاف معلوم ہوں تو ایسے افکار پر لازماً تنقید کی جائے گی۔ ہر دور کے علماء کا یہی عمل رہا ہے۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۲

کشمیر کے تین صاحبان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام میں قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھو، الغلو فی الدین، باب الخروج علی الحکام۔)

یہ حکم بے حد اہم ہے۔ اس کے بعد پولٹیکل پراسس اور ایجوکیشنل پراسس کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک سیاسی ادارہ کا تعلق ہے وہ تمام تر جمہوری عمل (ڈیموکریٹک پراسس) کے تابع رہے گا۔ مقرر مدت کے بعد الکشن ہوگا اور غیر جانبدارانہ الکشن میں جو لوگ کامیاب ہوں گے وہ حکومت چلائیں گے۔ ہارنے والے لوگ اپنی ہار کو تسلیم کریں گے۔ اور اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک کہ اگلے الکشن کا وقت آجائے۔

تعلیم وتربیت کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے صرف ایک شرط ہوگی۔ یہ کہ وہ دو طرفہ ٹکراؤ سے پرہیز کرتے ہوئے اپنا کام انجام دیں۔ نہ حکومت سے ٹکراؤ اور نہ عام لوگوں سے ٹکراؤ۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۲

آج رات کو ساڑھے دس بجے، جب کہ میں کچھ لکھ پڑھ رہا تھا، ایک بالکل نیا خیال ذہن میں آیا جس کو میں نے نہ کبھی پڑھا تھا اور نہ کبھی سوچا تھا۔ یہ خیال اس حدیث کے متعلق تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی یہ خبر دی ہے کہ پچھلے اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔

ساڑھے دس بجے رات کو اچانک یہ خیال آیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت محمدی دوسری امتوں سے زیادہ گمراہ ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کو ایسے حالات سے سابقہ پیش آئے گا جس میں خیارات (options) کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ اس لئے فرقوں کی تعداد بھی اس میں زیادہ بنے گی۔

میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچانک ایسے خیالات میرے ذہن میں وارد ہوتے ہیں جو بالکل نئے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی ماخذ سابق میں موجود نہیں ہوتا۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۲

۱۷ نومبر کے تحت میں نے جو اندراج کیا ہے اس پر مزید غور کرتے ہوئے میرے ذہن میں آیا کہ میرے ساتھ یہ بے حد عجیب معاملہ ہے کہ میرے دماغ میں اکثر ایسے خیالات آتے ہیں جو انتہائی نئے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن پر بہت سی ایسی چیزیں منکشف ہوئی ہیں جن سے پوری معلوم تاریخ خالی ہے۔ میری معلومات کے مطابق، پوری اسلامی تاریخ میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس پر اتنی زیادہ مقدار میں نئی حقیقتیں منکشف ہوئی ہوں۔ نئے مسائل بتانے والے تو بہت ہیں مگر نئی حقیقتوں کا انکشاف کرنے والا کوئی نہیں۔

ایک طرف یہ انتہائی عجیب معاملہ ہے۔ دوسری طرف میرا احساس عجز اتنا بڑھا ہوا ہے کہ میں اپنے آپ کو فی الواقع تمام انسانوں میں سب سے کمتر سمجھتا ہوں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ اگر آسمان سے آواز آئے کہ تمام پیدا ہونے والے انسان بخش دئے گئے تب بھی میرا اندیشہ ختم نہیں ہوگا۔ تب بھی میں شاید سوچوں گا کہ ہر عموم میں استثناء ہوتا ہے۔ کیا معلوم اس عموم میں ایک انسان کا استثناء ہو، اور وہ استثناء میرا ہی ہو۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۲

ضیاء الرحمان نیر دہلوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک اصلاحی تحریک، دوسرے انقلابی تحریک۔ اصلاحی تحریک کا نشانہ فرد ہے، اور انقلابی تحریک کا نشانہ سسٹم۔ اصلاحی تحریک فرد کی سوچ کو بدلنے پر اپنی ساری طاقت خرچ کرتی ہے، اور انقلابی تحریک کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مروجہ سسٹم کو توڑے، تاکہ اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کیا جاسکے۔

انقلابی تحریک کا معاملہ انتہائی خطرناک (risky) ہوتا ہے۔ سسٹم کو توڑنے میں تخریبی عمل کرنا ہوتا ہے۔ یہ تخریبی عمل ساری روایتوں کو توڑ کر کرنا پڑتا ہے۔ اس میں مروجہ ڈھانچہ کا ٹوٹنا یقینی ہوتا ہے، مگر نئے بہتر ڈھانچہ کا بننا یقینی نہیں ہوتا۔ بلکہ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ انقلابی تحریکوں نے مروجہ ڈھانچہ کو تو بار بار توڑا۔ مگر نئے بہتر ڈھانچہ کو بنانے میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس معاملہ میں اسلام کا طریقہ بنیادی اور اصولی طور پر اصلاح کا طریقہ ہے۔ اسلامی تحریک اپنی طاقت فرد کے اندر ذہنی انقلاب لانے پر صرف کرتی ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتی ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں ڈھانچہ کو توڑنے پر اپنی طاقت خرچ کرنے لگے۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۲

آج ٹائمس آف انڈیا نے جرمن مفکر گوئٹے (Goethe) کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ ـــــ بے فائدہ زندگی پیشگی موت ہے:

A useless life is an early death.

یہ بات فرد کے لئے بھی درست ہے اور قوم کے لئے بھی۔ دس آدمیوں کے خاندان میں ایک آدمی اگر ایسا ہو جائے کہ اس کے خاندان کو کوئی فائدہ نہ مل رہا ہو تو وہ خاندان کا ایک مردہ فرد بن کر رہ جائے گا۔ اس کو خاندان کے زندہ فرد کی حیثیت حاصل نہ رہے گی۔ اسی طرح کوئی انسانی گروپ اگر ماحول کے اندر اپنی نفع بخشی کھو دے تو اس کے بعد وہ ماحول کی نظر میں زندہ گروپ کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۲

ایک صاحب نے الرسالہ کی تنقیدوں پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ میں کبھی کسی کے ایمان و اخلاص کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ اس میں ہمیشہ فکری منہج یا عملی تدبیر پر نقد کیا جاتا ہے اور یہ کسی بھی درجہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ یہ ایک معروف اور مسلّم حقیقت ہے کہ ایمان و اخلاص کو زیر بحث لائے بغیر جب صرف فکری نہج اور عملی تدبیر پر نقد کیا جائے تو اس کا مطلب صرف زیر تنقید شخص کی اجتہادی خطا کی نشاندہی ہوتا ہے۔ اور اجتہادی خطا ہر شخص سے ہو سکتی ہے، حتی کہ رسول اور اصحاب رسول سے بھی۔ پھر ایسی تنقید پر برہم ہونے کی کیا

ضرورت۔

اصل یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے مفروضہ اکابر کو صرف مومن و مخلص ماننے پر قانع نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ لوگ ان کو معصوم عن الخطا بھی ماننا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ الرسالہ کی تنقیدوں پر غصہ ہوتے ہیں۔ آپ کی اسی نفسیاتی کمزوری نے مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ الرسالہ کی تنقیدوں نے۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۲

مجمع الفقہ الاسلامی: ریاض کے تعاون سے ابن تیمیہ پر ایک عربی کتاب تیار کی گئی ہے دہلی کے ایک ادارہ مجمع البحوث العلمیہ الاسلامیہ نے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ ۴۹۰ صفحات پر چھاپ کر شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا نام اس کے موضوع کے مطابق یہ ہے:

دعوة شيخ الاسلام ابن تيمية و اثرها في الحركات الاسلامية المعاصرة (۱۹۹۲)

مصنف (صلاح الدین مقبول احمد) نے اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ موجودہ زمانہ کی تمام اسلامی تحریکیں ابن تیمیہ کے افکار سے متاثر تھیں۔ مثلاً محمد بن عبد الوہاب کی تحریک، سلفی تحریک، جماعت اسلامی کی تحریک، اخوان المسلمون کی تحریک، وغیرہ۔

اس کتاب کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ ہو کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں ابن تیمیہ کے افکار سے متاثر ہو کر اٹھیں تو یہ کوئی مستحسن بات نہیں۔ کیونکہ ابن تیمیہ کا زمانہ سات سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ دور جدید سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ آج کی کسی اسلامی تحریک میں قرآن و سنت سے واقفیت کے بعد، جو مزید صلاحیت مطلوب ہے وہ معرفت کا زمانہ ہے نہ کہ معرفت ابن تیمیہ کا۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۲

علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کی ایک عربی کتاب ۱۹۸۹ میں چھپی ہے۔ وہ ساڑھے تین سو صفحہ پر مشتمل ہے اور اس کا نام المرتضیٰ ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۸ ـ ۲۱۷ پر حضرت علی کے کچھ اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک قول ہے: الصبر شجاعة (صبر بہادری ہے)

میرا خیال ہے کہ موجودہ کے زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ جس حقیقت سے بے خبر ہیں وہ یہی عظیم حقیقت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف ٹکراؤ کو بہادری سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ سب سے بڑی بہادری صبر ہے۔ حتی کہ خود مصنف کتاب کا بھی اس میں استثنا نہیں۔ چنانچہ "المرتضیٰ" کے ٹائٹل پیج پر جو چیز سب سے زیادہ نمایاں کی گئی ہے وہ ایک تلوار کی تصویر ہے۔

۲۴ نومبر ۱۹۹۲

دکتور عبد الحلیم عویس، ریاض کی جامعۃ الامام میں استاد ہیں۔ وہ دہلی آئے اور ایک ہفتہ قیام کرکے آج واپس گئے۔ وہ مسلسل مجھ پر یہ زور دیتے رہے کہ میں تنقیدی انداز چھوڑ دوں اور صرف مثبت طور پر اپنی دعوت پیش کروں۔ وہ اپنی گفتگوؤں میں ایک طرف دعوت کی اہمیت بتاتے رہے اور اسی کے ساتھ کشمیر سے لے کر بوسنیا تک اعداء اسلام کے مظالم کا ذکر بھی کرتے رہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ تضاد میں جی سکتے ہیں اس لئے تنقید آپ لوگوں کی ضرورت نہیں۔ میں تضاد میں نہیں جی سکتا، اس لئے تنقید میری ضرورت ہے۔ آپ جن لوگوں کو دشمن قوم کہتے ہیں وہ سب میرے نزدیک مدعو قوم ہیں۔ داعی کی حیثیت سے ہمارے لئے جائز ہی نہیں کہ ہم ان کے خلاف سیاسی اور قومی جنگ چھیڑیں۔ کیوں کہ اس قسم کی جنگ سرے سے دعوت کا ماحول ہی ختم کر دیتی ہے۔ وہ کشمیر اور بوسنیا میں مسلمانوں پر مظالم کی داستان بتانے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ غیر عادلانہ کلام ہے۔ کیوں کہ کشمیر اور بوسنیا جیسے ملکوں میں "ظلم" اس وقت شروع ہوا جب کہ وہاں کے مسلمانوں نے بغاوت کی۔ اور باغیوں کے خلاف ہمیشہ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ آپ ایک طرف دعوت کا نام لیں اور اسی کے ساتھ کشمیر اور بوسنیا کے مسلمانوں کے اقدام کی تائید کریں۔ مگر میں ان مسلمانوں پر تنقید کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ میں ان کے اس اقدام کو دعوت کے خلاف سمجھتا ہوں۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۲

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ کے دینی اداروں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے ان اداروں کے کام کو غیر معیاری اور مایوس کن بتایا۔ میں نے کہا کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دینی

اداروں کے لئے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ نہیں ملتے۔ جو افراد کار آمد ہیں وہ قابل حصول نہیں، اور جو قابل حصول ہیں وہ کار آمد نہیں۔

قدیم زمانہ میں دینی اداروں کو بھی اعلیٰ صلاحیت کے افراد مل جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں کام کی صورتیں بہت محدود تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں کام کی بے شمار نئی نئی اعلیٰ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ باصلاحیت افراد کو یہ صورتیں مادی اعتبار سے پرکشش معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دینی اداروں کے لئے وہی افراد رہ جاتے ہیں جو صلاحیت کے اعتبار سے زیادہ بلند نہیں۔ اس دنیا میں کوئی اعلیٰ کام اعلیٰ صلاحیت کے لوگ ہی کر سکتے ہیں، کم تر صلاحیت کے لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۲

مسلم مصنفین عام طور پر شخصی ریمارک اور علمی تنقید میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اسلامی لٹریچر کی تاریخ میں شاید ہی کوئی شخص ملے جو خالص علمی تنقید کا ذوق رکھتا ہو۔ یہ روایت ہمارے یہاں غالباً محدثین کے اثر سے آئی ہے۔ محدثین نے راویوں کی جانچ میں زیادہ تر ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے اعتبار سے کلام کیا ہے۔ محدثین کو اپنے مقصد کے لئے یہی کرنا تھا۔ یہ ان کی ایک ضرورت تھی۔ مگر بدقسمتی سے یہی انداز بعد کو بھی اسلامی تاریخ میں جاری ہو گیا۔ چنانچہ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی مصنف ایسا نہیں ملتا جس نے شخصی ریمارک کے طریقہ کو چھوڑ کر خالص علمی تجزیہ کے انداز میں تنقید کو اختیار کیا ہو۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی لٹریچر کی تاریخ میں الرسالہ نے پہلی بار علمی تنقید کا آغاز کیا ہے۔ کچھ لوگ الرسالہ کی تنقیدوں پر غصہ ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ کھلے ذہن کے تحت سوچیں تو وہ الرسالہ کی تنقیدوں کو اپنے لئے ایک نعمت سمجھیں گے۔ کیوں کہ الرسالہ کے ذریعہ پہلی بار انھیں یہ جاننے کا موقع مل رہا ہے کہ علمی تنقید یا منطقی تجزیہ کس چیز کا نام ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ اسلام کی علمی تاریخ میں ایک غلط روایت کی تصحیح ہے۔

۲۷ نومبر ۱۹۹۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں آپ نے ایک

تقریر کی۔ اس پہلی تقریر میں آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، آگ سے بچو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرۃ)

اس قول رسول میں شق تمرۃ کا لفظ علامتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز جو تمہارے پاس ہو، اس کے ذریعہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔ مومن وہ ہے جو موت اور قیامت اور حساب کو سوچ کر تڑپ اٹھے۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کو وہ اللہ کے خرچ کر کے کہے کہ خدایا، میرے پاس بس یہی شق تمرۃ ہے۔ میں اس کو تیری راہ میں دیتا ہوں۔ تو مجھے بخش دے۔ اللہ تعالیٰ کو اصل میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ احساس ہے نہ کہ شق تمرۃ یا خزانۂ شاہی۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۲

ایک ہزار سال سے علماء اسلام کے درمیان یہ بحث ہے جو اب تک ختم نہیں ہوئی کہ ایمان قول کا نام ہے یا قول اور عمل دونوں کا۔ کسی نے تطبیق دیتے ہوئے کہا کہ ایمان نام ہے زبان سے کہنے کا، دل سے تصدیق کرنے کا اور اعضاء وجوارح سے عمل کرنے کا۔

مگر میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ایمان نام ہے معرفت کا۔ کوئی چیز جب معرفت کے درجہ میں حاصل ہو جائے تو وہ کسی حد پر نہیں ٹھہرتی۔ وہ لازمی طور پر پوری شخصیت میں شامل ہو جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کے ہر جزء سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ معرفت زبان سے قول بن کر نکلتی ہے۔ قلب کے احساسات بے تابانہ طور پر اس کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔ پورا جسم مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس کی تعمیل میں سرگرم ہو جائے۔

۲۹ نومبر ۱۹۹۲

ڈاکٹر مہیش شرما کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ آج وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک آرٹیکل میں لکھا کہ ہندوؤں کو اپنی سوچ بدلنا چاہئے۔ مثلاً چینی اگر کوئی غلطی کرے تو اس کو ہم ہندو کی غلطی سمجھتے ہیں اور اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان غلطی کرے تو اس کو غیر کی غلطی سمجھ لیتے ہیں اور اس کو سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ یہ فرق صحیح نہیں۔

اسی طرح انھوں نے آر ایس ایس کی میٹنگ میں کہا کہ آپ لوگ اکھنڈ بھارت بنانا چاہتے ہیں۔

اگر بالفرض اکھنڈ بھارت بن جائے تو اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر اقلیت میں ہوں تو سیکولرزم کی بات کرتے ہیں اور اگر وہ اکثریت میں ہوں تو اسلامی حکومت کی بات کرتے ہیں۔ پھر اکھنڈ بھارت بننے کے بعد مسلم اکثریت کے علاقے اگر اسلامی حکومت کی مانگ کرنے لگیں، جیسا کہ کشمیر میں ہو رہا ہے تو آپ کیسے نمٹیں گے، جب کہ یہ طے ہے کہ سارے عرب دیش اور سنٹرل ایشیا کے آزاد شدہ ممالک اس مانگ کا ساتھ دیں گے۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۲

ایک آدمی بادشاہ کے محل میں داخل ہو تو قدم قدم پر وہ اس احساس کے ساتھ چلے گا کہ وہ حکمرانِ وقت کے محل میں ہے اور اس کو محل کی پوری رعایت کرتے ہوئے اس کے اندر چلنا چاہئے۔ موجودہ دنیا بھی گویا خدا کا ایک "محل" ہے۔ اور یہاں رہتے یا چلتے ہوئے آدمی کے اندر مزید اضافہ کے ساتھ وہ احساس پیدا ہونا چاہئے جو مذکورہ آدمی کے اندر شاہی محل میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

مگر جب میں شہر کی سڑک پر لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کسی بھی شخص کے چہرہ پر اس قسم کا احساس جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ لوگوں کے چہروں پر احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال میں تواضع کے بجائے سرکشی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بےحسی کا غلبہ ہوتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا بھی سنجیدہ نہیں جتنا کوئی شخص کسی ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۹۲

۱۹۸۶ کے بعد جب بھارتیہ جنتا پارٹی سیاست کے میدان میں سرگرم ہوئی تو بہت سے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی اس کی حمایت کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کانگرس کے مقابلہ میں ایک صحت مند بدل (healthy alternative) ثابت ہوگی۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ چنانچہ اب ہندوؤں کا پڑھا لکھا طبقہ عام طور پر بھارتیہ جنتا پارٹی سے بددل ہو گیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم دسمبر ۱۹۹۲) میں مسٹر ہرش کھرے نے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے درست طور پر لکھا ہے کہ اب ہندو یہ سمجھ رہے ہیں کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی سرگرمیاں دراصل

سیاسی مقاصد کے لئے وحشیانہ کوششیں تھیں :

vulgar quest for political gains.

ٹھیک یہی معاملہ مسلم ملکوں میں پیش آیا ہے۔ پاکستان کی جماعت اسلامی، مصر کی الاخوان المسلمون اور الجزائر کی سالویشن پارٹی کو ابتداءً پڑھے لکھے مسلمانوں کی حمایت ملی۔ مگر تجربہ کے بعد یہ لوگ ان جماعتوں سے بددل ہو گئے۔ کیوں کہ ان سے مسلم ملکوں کو تخریب کاری کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

۲ دسمبر ۱۹۹۲

حدیث میں ہے کہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ ابتلا نبیوں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں مجھے سب سے زیادہ اذیت دی گئی۔ اگر ظاہر الفاظ کے اعتبار سے اسے دیکھا جائے تو یہ بات واقعہ کے خلاف دکھائی دے گی کیوں کہ ایسے معلوم اہل ایمان ہیں جن کو بظاہر انبیاء سے زیادہ اذیت دی گئی۔

مثلاً فرعون نے مومنین موسیٰ کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں الٹی طرف سے کٹوایا اور اس کے بعد انھیں سولی پر چڑھا کر سخت تکلیف کے ساتھ ہلاک کیا۔ حدیث کے مطابق، پچھلے زمانہ میں ایسے مومنین گزرے ہیں جن کو اس طرح مارا گیا کہ ان کے جسم کا نچلا حصہ زمین میں گاڑ دیا گیا۔ اور سر پر اس طرح آرا چلایا گیا کہ سر سے کر تک ایک حصہ ایک طرف گر گیا۔ اور دوسرا حصہ دوسری طرف۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ تکلیف حقیقۃً ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ حساس آدمی جس چیز پر بہت زیادہ تکلیف محسوس کرے گا، عین اسی چیز پر بے حس آدمی کو بہت کم تکلیف محسوس ہوگی۔ انبیاء کی زیادہ تکلیف غالباً جسمانی اذیت کے معنی میں نہ تھی، بلکہ ذہنی اذیت (mental torture) کے معنی میں تھی۔ انبیاء بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے وہ ذہنی یا جسمانی اذیتوں کو بھی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

انبیاء کے حساس ہونے کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ نفسیات کی اصلاح میں کمال پسند (perfectionist) ہوتے ہیں۔ کمال پسند آدمی برائی سے مصالحت نہیں کر پاتا۔ کمال پسند

آدمی موجودہ ناقص دنیا کو اپنا مقصود نہیں بنا سکتا۔ کمال پسند آدمی خلاف حق رویہ کو برداشت نہیں کرتا۔ کمال پسند آدمی کسی بھی معاملہ میں معیار سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔

یہی کمال پسندی آدمی کو اعلیٰ درجہ کا داعی بناتی ہے۔ مگر کمال پسندی ہی، بڑھی ہوئی حساسیت کی بنا پر، آدمی کو سب سے زیادہ اذیت میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

۳ دسمبر ۱۹۹۲

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۸ نومبر ۱۹۹۲) میں کشمیر کی جہاد آزادی پر پرجوش مضمون چھپا ہے۔ یہ مسٹر ابو ذر غفاری کے قلم سے ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں نے پوری وادی کو اپنے خون سے سرخ بنا دیا ہے۔ مگر ابھی تک وہ سیاسی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے:

"اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جنوری ۱۹۹۰ سے وادی کشمیر اور جموں کے مسلمان بھارتی سامراج سے آزادی اور حرمت اسلام کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہیں۔ جب کہ آزاد کشمیر کے کشمیری مسلمان کرسی کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اس لئے وقت کا اہم ترین تقاضا یہی ہے کہ آزاد کشمیر کے کشمیری مسلمان کرسی کی جنگ کو ختم کر کے اپنے آپ کو کشمیر کی آزادی کے لئے وقف کر دیں"۔ (صفحہ ۱۱)

کشمیر کی مذکورہ صورتحال کا اصل سبق وہ نہیں ہے جو پاکستانی صحافی نے نکالا ہے۔ اصل سبق یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمان کا مقابلہ جب تک انڈیا سے ہے وہ انڈیا سے لڑیں گے، اور اگر وہ "آزاد کشمیر" بنالیں تو اس کے بعد آپس میں اقتدار کی لڑائی شروع کر دیں گے۔ جزئی آزاد کشمیر کا نمونہ بتاتا ہے کہ اگر پورا کشمیر آزاد ہو جائے تو اس کے بعد وہاں کیا صورتحال پیش آئے گی۔

۴ دسمبر ۱۹۹۲

موٹر کار کے ابتدائی ماڈل کو دیکھئے تو آج کی جرمن یا جاپانی کار کے مقابلہ میں وہ بہت بھدا نظر آئے گا۔ مگر اس ابتدائی کار کی قیمت جدید خوبصورت کاروں سے بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ ابتدائی کار کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس غیر معیاری کار کا بن کر تیار ہونا معیاری کار

کی پیشگی اطلاع تھی۔ وہ خود پرکشش نہ تھی، مگر اس نے وقوع میں آکر یہ ثابت کر دیا کہ پرکشش کار بھی بنائی جا سکتی ہے۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر موجودہ دنیا کا ہے۔ موجودہ دنیا بلا شبہ ایک ناقص دنیا ہے۔ ہر اعتبار سے غیر معیاری ہے۔ مگر یہ دنیا اپنے اندر ایک عظیم قیمت رکھتی ہے۔ یہ ناقص دنیا کامل دنیا کے امکانی وقوع کو بتاتی ہے۔ یہ غیر معیاری دنیا ثابت کر رہی ہے کہ معیاری دنیا بھی ظہور میں آسکتی ہے۔ وہ زمانۂ حال میں اُس نادر واقعہ کے ظہور کی اطلاع ہے جو آئندہ زمانۂ مستقبل میں سامنے آنے والا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۹۲

ایک تبلیغی بزرگ سے مذاہب کے بارہ میں بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اسلام اور دوسرے مذہبوں میں یہ فرق ہے کہ اسلام غیر محرف مذہب ہے اور دوسرے مذہب محرف مذہب۔ اسلام کی اس ترجیحی حیثیت کو خالص تاریخ کی بنیاد پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے میری بات کو کسی قدر اجنبیت کے ساتھ سنا۔ بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بات کے علمی وزن کو سمجھ نہ سکے۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہمارے اکابر اس کی بڑی اچھی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو، بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے والدین اس کے سائز کے مطابق اس کے لئے کپڑا بناتے ہیں۔ پھر بچہ جیسے جیسے بڑھتا ہے اس کے کپڑے کا سائز بدلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پوری عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کے کپڑے کا سائز بدلنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب ایک ہی سائز کا کپڑا اس کی آخری عمر تک کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

تبلیغی جماعت جیسی تحریکوں میں اسی طرح مثالوں سے بات کہی جاتی ہے۔ مگر مثالیں کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے نہایت ناقص ذریعہ ہیں۔ مثلاً مذکورہ مثال سن کر ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ پوری عمر کو پہنچنے کے بعد کپڑے کا سائز ایک ہو جاتا ہے نہ کہ خود کپڑا۔ کپڑا تو پھر بھی بار بار نیا سلایا جاتا ہے۔ اس لئے اب اسلام چودہ سو سال پرانا ہو چکا ہے۔ اب انسان کے لئے نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ جس طرح کپڑا پرانا ہو جانے کے بعد نئے کپڑے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

مثالوں کی بنیاد پر تحریک چلانے کا یہ فائدہ ہے کہ اس میں عوام کی بھیڑ نہایت آسانی کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہے کہ ذہین طبقہ اس سے کٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ ذہین طبقہ کا ذہن علمی اور تجزیاتی ہوتا ہے، وہ اس قسم کی مثالوں سے متاثر نہیں ہوتا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲

آج غالب اکیڈمی کے ایک سمپوزیم میں شرکت کی۔ وہاں کے ایک اسپیکر مسٹر عبداللہ طارق تھے۔ انھوں نے تقریر کے دوران بتایا کہ جب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھتا تھا تو وہاں ایک ہندو طالب علم ہریش سے میری دوستی ہو گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ میں اکثر اس کے گھر جاتا۔ اور وہ بھی اکثر میرے گھر آتا۔

ایک روز ہریش کی دادی نے میرے بارہ میں کہا: طارق تو ایسا ہے کہ ذرا بھی مسلمان نہیں لگتا۔ ٹھیک یہی بات میری نانی نے ہریش کے بارہ میں کہی۔ کئی بار اس کو دیکھنے کے بعد ایک روز انھوں نے کہا: ہریش کو دیکھو وہ ذرا بھی ہندو نہیں لگتا۔

یہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ دو قومی نظریہ اور بٹوارہ کی تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ اب ایک دوسرے کو جاننے کے بارہ میں ذاتی تعلقات اور واقفیت کی بنیاد نہ رہی بلکہ افواہیں اور اخباری خبریں ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ بن گئیں۔ ورنہ اگر باہمی تعلقات باقی رہتے تو مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ ہر ہندو 'ہریش' ہے اور ہندوؤں کو معلوم ہوتا کہ ہر مسلمان 'طارق' ہے۔

۷ دسمبر ۱۹۹۲

دار العلوم دیوبند کے تحت ایک عربی جریدہ نصف شہریہ ۱۶ سال سے نکل رہا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۲ کے صفحہ اول پر ایک مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: اهل الباطل يتحدون واهل الحق يختلفون (اہل باطل متحد ہیں اور اہل حق مختلف ہو رہے ہیں)

دو صفحہ کے اس مضمون میں بڑے جذباتی انداز میں مسلمانان عالم کے موجودہ مسائل، مثلاً فلسطین، افغانستان، برما، سری لنکا، صومالیہ، بوسنیا، ہندستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ہر

جگہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ مسلمانوں کے دشمن متحد ہیں مگر مسلمانوں کے درمیان اتحاد نہیں۔ مثلاً ہندستانی مسلمان بابری مسجد تحریک کے عنوان پر متحد نہ ہو سکے۔ مگر ہندو بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کے سوال پر متحد ہو گئے۔

مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ عجیب مسئلہ ہے کہ باطل والے باطل میں متحد ہو رہے ہیں۔ مگر حق والے حق میں متحد نہیں۔ ایک معمہ ہے جس کو ہم اہل دانش کے اوپر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کا مطالعہ کریں اور اس کا حل معلوم کریں:

انها قضية اتحاد اهل الباطل في باطلهم و اختلاف اهل الحق في حقهم ۔ قضية عجيبة او لغز من الالغاز، نتركه للعقلاء ان يدرسه ويحله ۔

یہ سارا معاملہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ جن مسلمانوں کو اہل حق کہا جا رہا ہے، وہ در اصل اخلاف اہل حق ہیں۔ موجودہ مسلم نسلیں حقیقۃً ایک ایسا گروہ ہیں جو قرآن کے الفاظ میں، قساوت اور موت کے مرحلہ کو پہنچ چکے ہیں (العنکبوت) اور جو گروہ ایسے مرحلہ کو پہنچ جائے اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو آج ہم کو نظر آ رہا ہے۔

زندہ انسان کی صفت برداشت ہے، اور مردہ انسان کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ برداشت کو کھو دیتا ہے۔ اتحاد کی لازمی قیمت برداشت ہی ہے۔ اختلاف کو برداشت کرنے سے اتحاد پیدا ہوتا ہے اور اختلاف کو برداشت نہ کیا جائے تو اسی کا نام اختلاف ہے۔ زندہ انسان چوں کہ برداشت کی صفت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے ان میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور مردہ انسان چوں کہ برداشت سے خالی ہوتے ہیں اس لئے وہ بہت جلد اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۸ دسمبر ۱۹۹۲

اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ وہ رام کی جنم بھومی کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس لئے وہ اس کو توڑ کر وہاں رام مندر بنائیں گے۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر کو انھوں نے بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ ۶ دسمبر سے پہلے ہندوؤں کا نعرہ تھا کہ ——— ' مندر وہیں بنائیں گے اب جبکہ ہندوؤں نے مسجد کو ڈھا دیا ہے تو اب مسلمان یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ ' مسجد وہیں

بنائیں گے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو صرف ردعمل کی سیاست معلوم ہے۔ مثبت سیاست کا راز ابھی تک انھوں نے نہیں سمجھا۔

۹ دسمبر ۱۹۹۲

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو دو لاکھ سے اوپر انتہا پسند ہندو اجودھیا میں گھس گئے اور انھوں نے بابری مسجد کو مکمل طور پر ڈھا دیا۔ یہ مسجد ۴۶۴ سال پہلے بابر کے گورنر میر باقی نے تعمیر کرائی تھی۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے ہنگامہ کے دوران ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئی تھیں۔ مگر ان مسجدوں کے ڈھائے جانے سے مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا تھا، جتنا بابری مسجد کے ڈھائے سے انھیں پہنچا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۸۶ سے لے کر اب تک مسلمانوں نے بابری مسجد کے اشو پر دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور عالمی سطح پر اس کی تشہیر کی۔ مسلمانوں کے ذہن میں بٹھا دیا گیا کہ بابری مسجد مسلمانوں کے ملی وجود کی علامت ہے۔ بابری مسجد کے ساتھ جدید ہندستان میں ان کا وجود و بقا وابستہ ہے۔ حتی کہ مسلمانوں نے اس کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی مسجدوں کے ڈھانے سے انھیں یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس ملک میں ان کا وقار مٹ گیا ہے۔ مگر بابری مسجد کے ڈھانے کے بعد اچانک انھیں احساس ہوا کہ ان کے ملی وقار کی عمارت زمیں بوس ہو گئی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۲

ہجرت کرنے والی چڑیوں (migratory birds) کی کہانی بڑی سبق آموز ہے۔ سائبیریا کے علاقہ سے ۳۰۰ قسم کی چڑیاں ہر سال ہندستان آتی ہیں۔ اسی طرح ہر سال سرد علاقوں کی چڑیاں گرم علاقوں میں جاتی ہیں۔ سائبیریا کے سارس (cranes) پانچ ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے ہجرت پور پہنچتے ہیں۔ آرکٹک ٹرن (Arctic Terns) ہر سال آرکٹک سے انٹارکٹک جاتی ہیں اور پھر اپنے وطن واپس لوٹتی ہیں۔ دونوں طرف کے اس سفر میں وہ ۳۴ ہزار کیلو میٹر سے زیادہ فاصلہ طے کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں تحقیقات سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا علم انھیں پیدائشی طور پر ملتا ہے نہ کہ اپنے ماں باپ سے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۲

اچاریہ منی سوشیل کمار نے آج اپنے آشرم (نئی دہلی) میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک میٹنگ رکھی تھی۔ ۶ دسمبر کو بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے بعد آجکل ملک میں جگہ جگہ تشدد اور فساد ہو رہا ہے۔ میٹنگ کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا۔ میٹنگ میں شاہد صدیقی صاحب نے کہا کہ جن ہندوؤں نے اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھایا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اجودھیا کو ہمیں ہندوؤں کا مکہ بنانا ہے، اس لئے ہم اس کو لوٹ کر رہے ہیں۔ اچاریہ منی سوشیل کمار نے مسکراتے ہوئے کہا: مکہ تو بن جائے گا پر امام کون ہوگا۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوؤں میں اتنے زیادہ فرقے ہیں۔ اور ہر فرقہ اپنا الگ پیشوا مانتا ہے۔ ایسی حالت میں ہندوؤں کے "مکہ" کا ایک امام بنایا جانا ممکن نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو مذہب میں کتنا زیادہ اختلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کا موجودہ اتحاد مسلم دشمنی کے جذبہ پر قائم ہے۔ اگر مسلم دشمنی میدان سے ہٹ جائے تو اس کے بعد یقیناً وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۹۲

۱۱ دسمبر کے تمام اخبارات میں صفحہ اول پر یہ نمایاں خبر تھی کہ حکومت نے پانچ جماعتوں پر پابندی لگا دی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں ـــــ ہندو وشو پریشد، آر ایس ایس، بجرنگ دل، جماعت اسلامی ہند، آئی ایس ایس (اسلامک سیوک سنگھ)

میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کسی جماعت پر بین لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آر ایس ایس پر اس سے پہلے جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۸ میں بین لگایا۔ پھر اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ میں اس پر بین لگائی۔ ان دونوں پابندیوں سے آر ایس ایس کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا۔ پھر تیسری بار کے بین سے کیا نقصان پہنچے گا۔ اسی طرح جماعت اسلامی پر ایمرجنسی کے زمانہ میں ۱۹۷۵ میں بین لگایا گیا تھا۔ مگر جماعت اسلامی کے بڑھنے میں وہ رکاوٹ نہ بن سکا۔ یہی اس دوسرے بین کا حال بھی ہوگا۔ موجودہ زمانے میں کسی تحریک پر بین لگانا ہمیشہ برعکس نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کی ترقی میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (۳ دسمبر ۱۹۹۲) میں مسٹر این آر موہنتی کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سکولرزم کا نظریہ اسلام میں اجنبی ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جس مذہب کو پسند کرے اس کو اختیار کرے۔

یہ معاملہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام اصولی طور پر صرف ایک ہی مذہبی عقیدہ کو درست اور برحق سمجھتا ہے۔ تاہم عملی طور پر ہر ایک کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے۔ نظری سطح پر اسلام توحید صداقت کا قائل ہے۔ مگر عملی اعتبار سے اس نے تعدد کو جائز قرار دیا ہے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۹۲

پیغمبر اسلام کا مشن یہ تھا کہ لوگوں کو شرک کے راستہ سے ہٹا کر توحید کے راستہ پر لے آئیں۔ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے دنیا کے بیشتر حصہ میں یہ کام انجام دے دیا۔ مگر ہندستان ایک استثار کے طور پر باقی رہا۔

امت محمدی ہونے کی حیثیت سے ہندستانی مسلمانوں کی یہ لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ اس ملک کے باشندوں کو توحید کا پیغام دیں۔ مگر ہزار برس کی مدت میں بھی یہ کام انجام نہ پا سکا۔ ابتداءً مسلمانوں کو یہ موقع ملا کہ وہ حاکم بن کر اس ملک میں یہ کام کریں۔ مگر انھوں نے یہ کام انجام نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ میں حکومت ان سے چھین لی گئی۔

اس کے بعد انگریزی اقتدار کے تحت وہ یہاں برابر کی ایک قوم بن گئے۔ اب ان کے لئے موقع تھا کہ برابر کی حیثیت میں رہتے ہوئے توحید کے داعی بنیں۔ مگر اس دوسرے موقع کو بھی انھوں نے استعمال نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں اس صورت حال کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۴۷ کے بعد منقسم ہندستان میں ہندو کی سیاسی بالاتری قائم ہو گئی۔ تاہم سیکولرزم کے تحت اب بھی یہاں کے مسلمانوں کو دستوری برابری حاصل تھی۔ مگر اب بھی وہ اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے نہیں اٹھے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد جو دور آیا ہے اس میں یہ دستوری توازن

ٹوٹ چکا ہے۔ اب مسلمانوں کو اس ملک میں ہندوؤں کا ماتحت بن کر اپنا دعوتی کام انجام دینا ہوگا۔ اگر مسلمانوں نے اب بھی اپنی ذمہ داری ادا نہ کی تو اس کے بعد کیسا ہوگا، قلم کو اس کے لکھنے کی طاقت نہیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲

مکہ سے ایک عربی اخبار "العالم الاسلامی" شائع ہوتا ہے۔ وہ ہمارے یہاں آتا ہے۔ مگر اکثر تاخیر سے پہنچتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲، صفحہ ۱ پر ایک جذباتی مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: ایہا المسلمون اتحدوا (اے مسلمانو، متحد ہو جاؤ)

اس طرح کے مضامین موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام اخباروں میں برابر چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے ہر اجتماع میں اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ مگر عملی اتحاد ایک فیصد کے بقدر بھی ان کے درمیان قائم نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ اتحاد ہمیشہ کسی مشترک مقصد کے لئے قائم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے سامنے کوئی مشترک مقصد نہیں، اس لئے ان کے درمیان اتحاد بھی نہیں۔

مشترک مقصد وہی چیز بن سکتی ہے جو ممکن بھی ہو۔ کوئی غیر ممکن مقصد کبھی مشترک مقصد کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۲

آر ایس ایس کے ایک لیڈر رڈ اکٹر شرما ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہمارے دیش میں جو ہندو مسلم جھگڑا جاری ہے وہ دیش کی ترقی کے لئے رکاوٹ ہے۔ آخر یہ کیسے ختم ہو۔ اس سلسلہ میں مختلف تجویزیں پیش کرتے ہوئے آخر میں میں نے کہا کہ اگر ایسا ہو کہ ہندستان میں مسلمان اسی طرح بے مسئلہ بن کر رہنے لگیں جس طرح پاکستان میں ہندو بے مسئلہ بن کر رہتے ہیں تو کیا یہاں ہندو مسلم جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ انھوں نے فوراً کہا: ہاں ہندو مسلم جھگڑا تو ختم ہو جائے گا، مگر اس کے بعد اس سے بھی زیادہ بڑا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا، اور وہ ہندو ہندو جھگڑا ہوگا۔

یہ بات ہندوؤں کے اور بھی کئی سمجھ دار لوگ کہہ چکے ہیں۔ مثلاً گرسی لا جپن نے یہی بات انگریزی

ماہنامہ منتقن میں لکھی تھی۔ میں پچھلے ۲۵ سال سے مسلمانوں کو اسی راستہ پر لانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ کہ وہ اس ملک میں بے مسئلہ بن کر رہنے لگیں۔ مگر ابھی تک بہت کم لوگ اس سے متفق ہو سکے تھے۔ مگر ۶ دسمبر کے بعد حالات کا دباؤ اور بھیانک فسادات اب مسلمانوں کو تیزی سے اسی راستہ کی طرف دوڑا رہے ہیں۔

۱۷ دسمبر ۱۹۹۲

پاکستان بننے کے بعد مسٹر محمد علی جناح نہ صرف بانی پاکستان تھے بلکہ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے۔ انھوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: عنقریب یہاں نہ ہندو ہندو رہیں گے اور نہ مسلمان مسلمان۔ مذہب کے اعتبار سے نہیں، اس لئے کہ وہ ہر شخص کا انفرادی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی مفہوم میں، ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے۔

بظاہر میرا خیال ہے کہ مسٹر جناح نے دو قومی نظریہ سیاسی اسٹنٹ یا بارگیننگ کے مقصد سے چلایا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو انھیں احساس ہوا کہ یہ غلطی ہوئی۔ کیونکہ قومیت کا تعلق وطن سے ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کے سب لوگ پاکستانی ہیں۔ اور اسی طرح ہندستان کے سب لوگ ہندو۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۲

لاہور سے ایک ماہنامہ اشراق کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں اس کے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ "پوری انسانیت کے سامنے شہادت علی الناس کا عظیم فریضہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر امت وسطیٰ کی حیثیت میں عائد کیا ہے اس فریضہ کا حق اس وقت تک ادا نہیں کیا جاسکتا جب تک امت مراکش سے انڈونیشیا تک ایک سیاسی اتحاد کی لڑی میں نہ پرو ئی جائے۔" (صفحہ ۳۲-۳۳)

اس نظریہ کے حق میں قرآن کی کوئی دلیل نہیں۔ مزید یہ کہ اس نظریہ کا مطلب دعوت و تبلیغ کے عمل کو ہمیشہ کے لئے معطل کر دینا ہے۔ کیوں کہ زمین پر بسنے والے تمام مسلمان، جن کی تعداد ایک ارب تک پہنچ چکی ہے، وہ کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ شہادت علی الناس اپنی نوعیت کے اعتبار سے فرض علی الکفایہ ہے اور فرض علی الکفایہ کبھی ایسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہو سکتا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۲

الرسالہ ستمبر ۱۹۸۷ میں میں نے لکھا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے جو مسئلہ درپیش ہے، اس کا حل یہ ہے کہ یہاں مسلمان اپنے آپ کو غیر نمایاں (inconspicuous) بنالیں (صفحہ ۵)

یہ مضمون شائع ہوا تو تمام لوگوں نے مجھ کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ یہ مشورہ ان کو اپنے مقام سے فروتر نظر آیا۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد ملک میں جو وحشیانہ فساد ہوئے ہیں، اس کے بعد تمام مسلمان عملاً اسی پوزیشن کو اختیار کر رہے ہیں۔ تمام بے ریش اور باریش رہنما مسلمانوں کو یکطرفہ طور پر صبر و تحمل کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اخبارات میں بیان چھپ رہے ہیں کہ مسلمان ہرگز مشتعل نہ ہوں۔ وہ روزہ رکھیں اور دعا کریں۔

یہ طریقہ بلاشبہ درست ہے۔ مگر اس پر مسلمانوں کو کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔ کیوں کہ کریڈٹ ہمیشہ اصولی موقف پر ملتا ہے نہ کہ مجبورانہ موقف پر۔

۲۰ دسمبر ۱۹۹۲

ایک انتہا پسند ہندو سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ مسلمان ایک جذباتی قوم ہیں۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو مارنا بہت آسان ہے۔ کوئی شوشہ چھوڑ کر انھیں بھڑکا دو اور اس کے بعد انھیں مارنا شروع کر دو۔

مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ری ایکشن اپنی آخری حد پر پہنچ کر ان ایکشن بن جاتا ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کو جس وحشیانہ انداز سے مار رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے اشتعال پر بھی مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔ پھر اس کے بعد آپ کیا کریں گے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۹۲

صحیح بخاری (کتاب الرقاق) میں عمر فاروق ؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: وجدنا خیر عیشنا بالصبر (ہم نے اپنی زندگی کا سب سے بہتر صبر کے ذریعہ پایا) فتح الباری ۱۱/۳۰۹

یہ قول کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ وہ اس دنیا کا ایک عمومی قانون ہے۔ اس دنیا میں مختلف

اسباب سے ناخوشگوار لمحات آتے ہیں۔ یہاں ناموافق تجربات پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے مواقع پر جو لوگ بے صبری کا طریقہ اختیار کریں وہ صرف اپنی مصیبت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسے مواقع پر صبر کا طریقہ اختیار کریں وہ نہ صرف مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کو ترقی کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۲

انگریزی ہفت روزہ ایشیا ویک کے نمائندہ مسٹر روی نے ایک مفصل انٹرویو لیا۔ ان سے میں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ ہمیشہ انگلش جرنلزم کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ہندی جرنلزم میں نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بااثر (influential) لوگوں تک پہنچنے کا ذریعہ آج بھی انگلش ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ ہندتو کی تحریک چلانے والے لیڈر بھی انگریزی اخباروں کا حوالہ دیتے ہیں جو لوگ ہندی زبان کے چمپئن بنے ہوئے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کو انگلش اسکول میں پڑھاتے ہیں۔

ہندستان میں ہر لیڈر ہندی زبان کی بات کرتا ہے۔ مگر پچاس سالہ کوشش کے باوجود ہندی زبان اس ملک میں برتر مقام حاصل نہ کر سکی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے مقام ہمیشہ ذاتی جوہر کی بنیاد پر ملتا ہے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۲

۱۵ دسمبر سے ۲۳ دسمبر تک میں 'شانتی یاترا' میں تھا۔ اس کے تحت مہاراشٹر کے بہت سے ہندوؤں سے ملاقات ہوئی۔ انھیں قریب سے دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا۔ میرا پہلا تأثر یہ تھا کہ جو لوگ ہندوؤں کو اخبار کے ذریعہ جاننا چاہتے ہیں وہ ہندو کے بارہ میں بالکل نہیں جانتے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر ہندوؤں کے حقیقی حالات سے یکسر بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس ملک میں مسلمانوں کو کوئی صحیح راہ عمل نہ دے سکے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۲

مسلمانوں میں کوئی حقیقی اصلاحی کام کرنے کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ان کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ ایک شخصیت اگر مشہور ہو جائے، خواہ وہ غلط بنیاد پر مشہور ہوئی ہو، تو ذہنوں

میں اس کی عظمت قائم ہوجاتی ہے۔ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ جو بات کہے وہ بات اتنی ہی عظیم ہے جتنی عظیم اس کی شخصیت انھیں دکھائی دے رہی ہے۔

کوئی صاحب اس لئے مشہور ہیں کہ وہ پانچ سو سال پہلے پیدا ہوئے۔ کسی کو اس لئے شہرت مل گئی ہے کہ اس نے وقت کے مذاق کے مطابق اسلام کی تشریح پیش کی۔ کوئی اس لئے مشہور ہوگیا کہ اتفاق سے اس کا ٹکراؤ حکمراں سے ہوگیا اور حکمراں نے اس کو سولی پر چڑھا کر اس کو شہید بنادیا۔ کسی کو صرف اس لئے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی کہ وہ ہر حلقہ میں اس کی پسند کی بولی بولتا تھا۔ وغیرہ۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۲

جمعہ کی نماز آج پنڈارہ روڈ کی مسجد میں پڑھی۔ وہاں تبلیغ والوں کی جماعت رکی ہوئی تھی۔ جمعہ سے پہلے انھوں نے تقریر کی۔ انھوں نے صحابہ کے کچھ واقعات بتائے۔ اس کے بعد کہا کہ صحابہ میں یہ ایمان کیسے آیا تھا۔ جواب یہ ہے کہ "محنت" کے ذریعہ آیا تھا۔ تبلیغ میں یہی ایمان کی محنت کرائی جارہی ہے۔

یہی تبلیغی جماعت کا خاص فکر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صحابہ والا ایمان محنت کے ذریعہ آتا ہے۔ محنت سے مراد ان کے نزدیک تبلیغ میں نکلنا ہے۔ میں نے تبلیغی جماعت کے ایک صاحب سے کہا کہ یہ مفروضہ بذات خود غلط ہے کہ "محنت" کے ذریعہ صحابہ والا ایمان پیدا ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ صحابہ والا ایمان معرفت کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ کسی شخص کو جب ایمان بطور معرفت (بالفاظ دیگر بطور ڈسکوری) ملتا ہے تو وہ اس کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ تبلیغی جماعت والی "محنت" سے کسی آدمی میں کچھ ظاہری قسم کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اس قسم کی محنت سے صحابہ والا ایمان پیدا ہونا ممکن نہیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۲

اکابر پرستی کا مذہب سکون پیدا کرتا ہے اور خدا پرستی کا مذہب بے سکونی، یہ بات میں بہت دن سے جانتا تھا۔ مگر اس کا سبب حال میں میری سمجھ میں آیا۔ میں ایک ہندو گرو کے ساتھ سفر میں دس دن رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جہاں جاتے ہیں، ان کے معتقدین ان کو اپنے گھر میں لے

جاتے ہیں۔ گھر کے تمام مرد اور عورتیں اور بچے جمع ہو جاتے ہیں۔ گرو صاحب وہاں سنسکرت میں کچھ دعائیہ کلمات پڑھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ سب کی جے ہو، سب کلیان ہو، سب کشل منگل کے ساتھ رہو۔

میں نے سوچا کہ یہ لوگ جس آدمی کو "خدا" سمجھ رہے ہیں، وہ ان کے سامنے موجود ہے۔ وہ براہ راست ان کو آشیرواد دے رہا ہے۔ گویا جو چیز وہ چاہتے ہیں وہ عملاً انھیں مل رہی ہے۔ یہاں چاہنے اور پانے میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدائے واحد کو خدا بتاتا ہے وہ ایک غیبی ہستی سے اپنی امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ وہ ایسی ہستی سے برکت لینا چاہتا ہے جو اس کے سامنے یہ کہنے کے لئے موجود نہیں کہ میں نے تم کو برکت دے دی۔ خدا پرست اپنے خدا سے مانگتا ہے مگر اس کو یہ شبہہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرے خدا نے مجھ کو دینا منظور کیا یا نہیں کیا۔

گویا انسان کو خدا کا درجہ دینے والے کا معاملہ "نقد" ہوتا ہے اور خدا کو خدا بنانے کا معاملہ "ادھار"۔ اسی فرق کی بنا پر ایک سکون اور آنند میں رہتا ہے، اور دوسرا درد اور بےچینی میں۔ یہ منظر ہندو اور مسلمان دونوں کے اندر دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۲

ایک مسلمان سے ہندستانی سیکولرزم پر بات ہوئی۔ انھوں نے یہاں کے سیکولرزم کو برا کہنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی سیکولرزم بالکل ڈھونگ ہے۔ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی شکایت کا سبب یہ ہے کہ آپ ہندستانی سیکولرزم کو اپنے مفروضہ آئیڈیل سے ناپتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں آئیڈیل کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں آدمی کو آئیڈیل سے کم (Less than ideal) پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ جو لوگ آئیڈیل سے کم پر راضی ہو جائیں وہ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔ اور جو لوگ آئیڈیل سے کم پر راضی نہ ہوں، وہ وہی لوگ ہیں جو شکایتیں کرتے رہتے ہیں اور پھر ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انصاف در اصل عملی انصاف کا نام ہے۔ کیوں کہ تصوراتی انصاف کا حصول ممکن ہی نہیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۹۲

ایک کشمیری نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تعلیم کو چھوڑ کر جنگجو بن گیا تھا۔ مگر اس کے بعد الرسالہ کے کچھ شمارے مجھے پڑھنے کے لئے ملے۔ اس سے مجھے اپنی غلطی سمجھ میں آئی۔ میں نے جنگجوئی چھوڑ دی۔ اب میں دوبارہ داخلہ لے کر میڈیکل تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔

اس طرح کے ہزاروں نوجوان ہیں جن کو اللہ کے فضل سے الرسالہ کے ذریعہ فکری رہنمائی ملی ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے صرف جہاد کی باتیں کرتے رہے۔ کسی نے بھی تعمیر کی بات نہیں کی۔ اس لئے پوری قوم کا مزاج بگڑ گیا۔ اب لوگ صرف لڑنے بھڑنے کو کام سمجھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے سوا بھی کوئی کام ہے جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کر لیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۹۲

ہمارے پڑوس میں ایک مسلمان نے ایک مکان خریدا۔ یہ مکان انھیں ۳۶ لاکھ روپیہ میں ملا۔ مگر اس مکان کے اوپر ایک ہندو کرایہ دار تھا۔ وہ ایک غلط آدمی تھا۔ سابق مالک مکان سے اس کی مقدمہ بازی ہوئی۔ مگر مالک مکان ہار گیا۔ آخر کار اس نے اپنا مکان بیچ دیا۔ یہ سابق مالک مکان ہندو تھا۔ موجودہ مالک مکان ایک مسلمان ہے۔ موجودہ مالک نے کچھ لوگوں سے مشورہ کیا۔ ہر ایک نے یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کرایہ دار کو کچھ رقم دے کر مکان خالی کرا لیں۔ اب اس کے سوا آپ کے لئے اور کوئی صورت نہیں۔ وہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ دینے کے لئے تیار ہوئے۔ مگر کرایہ دار راضی نہیں ہوا۔ اس نے مختلف طریقوں سے پریشان کرنا شروع کیا۔ آخر کار چھ لاکھ روپیہ لے کر اس نے مکان خالی کیا۔

موجودہ مالک مکان سے ملاقات ہوئی تو وہ شکایت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مکان تو بہت مہنگا پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ موجودہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس مکان کی قیمت ۶۰ لاکھ روپیہ ہے۔ آپ کو وہ مکان ۳۶ لاکھ میں اس لئے ملا تھا کہ اس کے اوپر ایک کرایہ دار قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اس طرح مزید چھ لاکھ روپیہ دے کر بھی وہ آپ کو ۴۲ لاکھ روپیہ میں پڑا ہے۔ پھر آپ اس کو مہنگا کس لئے بتاتے ہیں —— اسی کا نام سوچ کی غلطی ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۲

محمد اسلم صاحب (دہلی) نے ایک انگریزی مضمون کا ذکر کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ مغربی تہذیب ہر مذہب کی جدید نسلوں کو ان کے آبائی مذہب سے دور کر رہی ہے۔ ہر سال ۲۵ فیصد نوجوان اپنے باپ دادا کے مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا: نہیں شفق مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے۔

میں نے اس سے اختلاف کیا۔ میں نے کہا کہ مغربی تہذیب ہمارے لئے ایک نعمت تھی۔ غور کیجئے کہ مغربی تہذیب لوگوں کو مذہب سے دور کر کے کیا کر رہی تھی۔ وہ ان کو اس مذہب سے دور کر رہی تھی جو ان کو اپنی قومی روایات کے ذریعہ ملا تھا۔ مگر کوئی بھی تہذیب کسی کو اس کی فطرت سے دور نہیں کر سکتی۔ گویا کہ مغربی تہذیب آدمی کو قومی مذہب کے خول سے نکال کر اس کو اس کی اصل فطرت پر لا رہی تھی۔ اس طرح مغربی تہذیب ہمارے لئے نیا دعوتی امکان کھولنے کے ہم معنی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے جو عمل کیا، وہ نئی صورت میں عین وہی عمل تھا جو قدیم زمانہ میں صحرائے عرب میں کیا گیا تھا جب کہ بنو اسماعیل کو قدیم مشرکانہ تہذیب سے منقطع کر کے انھیں صحرا کے ماحول میں آباد کیا گیا۔ آدمی جب اپنے قومی مذہب سے ہٹتا ہے تو وہ اپنی پیدائشی فطرت پر آجاتا ہے۔ اس طرح وہ اسلام کے قریب پہنچ جاتا ہے، کیوں کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۲

آج اس سال کا آخری دن ہے۔ آج کا صفحہ لکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں خود اپنی زندگی کا آخری صفحہ لکھ رہا ہوں۔ اس دنیا میں آدمی کی زندگی بالکل غیر یقینی ہے۔ کسی بھی لمحہ اس کی موت آسکتی ہے۔ اس لئے ہر دن آدمی کا آخری دن ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کا زندہ شعور رکھتے ہوں۔

پنڈت جواہر لال نہرو (سابق وزیر اعظم ہند) نے اپنی زندگی کے حالات تحریر کیے۔ یہ خود نوشتہ سوانح عمری ۱۹۴۷ سے پہلے شائع ہوئی۔ اس وقت انھوں نے اپنی اس کتاب کو ختم کرتے ہوئے آخر میں یہ الفاظ لکھے تھے: "زندگی کا ایک باب ختم ہوا آئندہ کیا ہوگا کچھ نہیں معلوم۔ کتابِ زندگی کے اگلے صفحات سربمہر ہیں۔"

۱۹۴۷ کے بعد جب جواہر لال نہرو کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا تو ان کی کتاب زندگی کا اگلا باب کھل چکا تھا۔ مگر یہ بھی ان کی کتاب زندگی کا آخری باب نہ تھا ہر آدمی کی زندگی کی کتاب کا آخری باب وہ ہے جو اس کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی کی حقیقی کامیابی یا حقیقی ناکامی کا فیصلہ اس آخری دور حیات میں ہوگا، اس حقیقت کو جاننے کا نام جاننا ہے اور اس کو نہ جاننے کا نام نہ جاننا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)
مطالعہ سیرت
اسباق تاریخ
تعمیر حیات
تعمیر انسانیت
اسلام: ایک تعارف
اللہ اکبر
پیغمبر انقلاب
مذہب اور جدید چیلنج
عظمت قرآن
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
دین کامل الاسلام
ظہور اسلام
اسلامی زندگی
احیاء اسلام
راز حیات
صراط مستقیم
خاتون اسلام
سوشلزم اور اسلام
اسلام اور عصر حاضر
الربانیۃ
کاروان ملت
حقیقت حج
اسلامی تعلیمات
اسلام دور جدید کا خالق
حدیث رسول
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد اوّل
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم
راہ عمل
تعبیر کی غلطی
دین کی سیاسی تعبیر

عظمت مومن
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
تاریخ دعوت حق
مطالعہ سیرت (کتابچہ)
ڈائری (جلد اول)
کتاب زندگی
اقوال حکمت
تعمیر کی طرف
تبلیغی تحریک
تجدید دین
عقلیات اسلام
قرآن کا مطلوب انسان
دین کیا ہے؟
اسلام دین فطرت
تعمیر ملت
تاریخ کا سبق
فسادات کا مسئلہ
انسان اپنے آپ کو پہچان
تعارف اسلام
اسلام پندرہویں صدی میں
راہیں بند نہیں
ایمانی طاقت
اتحاد ملت
سبق آموز واقعات
زلزلہ قیامت
حقیقت کی تلاش
پیغمبر اسلام
آخری سفر
اسلامی دعوت
حل یہاں ہے
امہات المومنین
تصویر ملت

دعوت اسلام
دعوت حق
نشری تقریریں
دین انسانیت
فکر اسلامی
شتم رسول کا مسئلہ
طلاق اسلام میں
مضامین اسلام
حیات طیبہ
باغ جنت
نار جہنم
سچا راستہ
دینی تعلیم
خلیج ڈائری
رہنمائے حیات
تعدد ازواج
ہندستانی مسلمان
روشن مستقبل
صوم رمضان
اسلام کا تعارف
علما اور دور جدید
سفرنامہ اسپین و فلسطین
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
یکساں سول کوڈ
اسلام کیا ہے؟
میوات کا سفر
قیادت نامہ
منزل کی طرف
اسفار ہند
ڈائری ۹۰-۱۹۸۹
قال اللہ قال الرسول

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

ڈائری ذاتی واردات اور مشاہدات کا روزنامچہ ہے۔ وہ انسان کے لمحہ بہ لمحہ ذہنی سفر کا ریکارڈ ہے۔ ڈائری میں آدمی بہت سی وہ باتیں لکھ دیتا ہے جو باقاعدہ تصنیف میں نہیں آتیں۔ اِس اعتبار سے ڈائری کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ مزید یہ کہ ڈائری خود لکھنے والے کی اپنی ذہنی تنظیم ہے۔ وہ منظم زندگی گزارنے کی راہ میں ایک قیمتی معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔

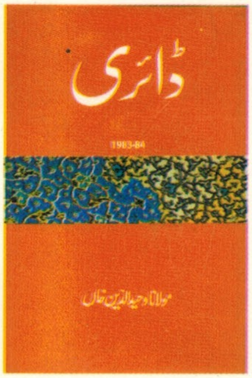

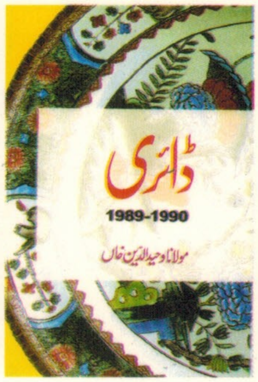

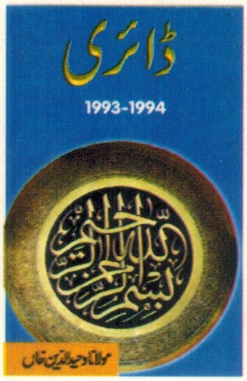

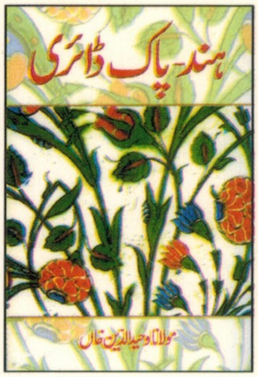

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-881-8
9 788178 98881-8
₹ 100